www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

# سفرِ جاوداں

رفاقت جاوید

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور
فون: 042-37652546 ، 042-37668958
www.alquraish.com E.mail:info@alquraish.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

## انتساب

ابا جی اور امی جی کے نام
جن کی بے پناہ محبت اور حوصلہ افزائی
نے مجھے قوتِ گویائی بخشی۔

خوب سے خوب تر کتابوں کی اشاعت
جدت اور معیار کے ساتھ

با اہتمام..... محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراوّل.................. 2012ء
مطبع.................. نیرّ اسد پریس لاہور
کمپوزنگ.................. کلاسکس گرافکس
قیمت .................. -/200روپے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

# پیش لفظ

آزاد قومیں اپنی آزادی کی قدر کرتی ہیں۔ کیونکہ آزادی جس قیمت پر حاصل کی جاتی ہے، وہ انسانی سکت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن جذبۂ ایثار و صدقِ وفا اور لگن و چاہت سے ہمت و حوصلے کبھی پست نہیں ہوتے۔ اور قومیں ناممکن کو ممکن بنانے میں کامرانی سے ہمکنار ہو جاتی ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ آزادی کے حصول کی تگ و دو میں بیتا ہوا ماضی تاریکیوں میں جا چھپتا ہے اور ایک ایسی نسل جنم لیتی ہے جو آزمائشوں اور کٹھن حالات کا تصور کرنے سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان میں اپنی اساس پر فخر ناپید ہوتا چلا گیا تو بدقسمتی سے یہ نسل اِک کٹی پتنگ کے مانند فضا کی بے حدو بے کراں وسعتوں میں گم ہو کر اپنی شناخت کھو دے گی۔ ذہن مفلوج ہو کر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے کوسوں دُور ہو جائیں گے اور پوری قوم ایک نفسیاتی اُلجھن کے شکنجے میں مقید ہو کر رہ جائے گی۔ اسی وجہ سے وقتاً فوقتاً داستانِ آزادی کا اعادہ کرنا اشد ضروری ہے۔ یہ قوم کے مخلص رہنماؤں اور ہمدرد بزرگوں کا خاصہ ہوتا ہے کہ وہ ہر موڑ پر ان حالات کی یاددہانی کرانے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن خاردار راستوں سے گزر کر قوم اس مقام کو حاصل کر پائی ہے۔ جو قومیں اپنے ماضی میں رونما ہونے والے ظلم وستم کی کہانیوں کو بیان کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہیں، ان کے لئے غلطیوں کا اعتراف کرنا اور کامیابیوں پر سرشار ہونا لازم و ملزوم ہو جاتا ہے۔ اسی نسبت سے محاسبے میں قوم کی بقا پوشیدہ ہے۔

ہماری قوم نے آج کے حالات کے پیشِ نظر بحالتِ مجبوری و بے بسی میں آزادی کے جذبے میں اُبھرنے والی تمام داستانوں کو سرے سے فراموش کر دینے میں عافیت سمجھ کر نئی نسل کو پیغام پہنچانے میں کوتاہی اور بے توجہی برتی ہے، جس کی وجہ سے چار سُو مایوسی اور نااُمیدی کا بحران نظر آتا ہے۔ اسی مقصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میرے ناول کا حرفِ آغاز ہی آزادی ہے۔ 1947ء کی لاکھوں سچی اور روح فرسا کہانیوں میں سے یہ ایک خاندان

کی سچی کہانی ہے جو میں نے اس ہستی کی زبانی سنی، جو بذاتِ خود اس کہانی کا حصہ تھیں۔ برسوں بیت گئے، لیکن آج بھی یہ کہانی میرے ذہن کے گوشوں میں آباد ہے۔ میں یہ کہانی اس اُمید کے ساتھ پیش کر رہی ہوں کہ نئی نسل، ماضی کی طویل، کٹھن اور جان لیوا آزمائشوں سے روشناس ہو کر آزادی کے اس سفرِ جاوداں میں قدم بہ قدم چلنے میں فخر محسوس کرے اور دلوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی اُمنگ کو بیدار کرنے میں سکون و طمانیت سے ہمکنار ہو سکے۔

بیتے ہوئے 65 سالوں میں ہر مشکل موڑ پر اس دھرتی ماں کے جوانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے ہمیں سرخرو کیا۔ ہمارے سروں کو بلند رکھنے میں اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے نبھایا۔ لیکن ان وار ہیروز کی کہانیاں کاروبارِ زندگی اور نفسانفسی کے دھندلکوں اور غبار آلودگی کی نذر ہو کر ذہن سے اُتر چکی ہیں۔ ایسی ہی کہانی شہید فلائٹ لیفٹیننٹ راشد احمد خان سے وابستہ ہے، جو ہماری گود میں کھیلا اور ہمارے ہاتھوں میں جوان ہوا۔ ابھی جوانی کی بھری دوپہر کی شروعات ہی تھی کہ وہ اس آزاد اور مقدس دھرتی پر اپنے حلف کی پاسبانی کرتے ہوئے اپنے جوشیلے خون کے رنگ بکھیرتا ہوا آزادی کے سفر کا حصہ بن کر زندۂ جاوید ہو گیا۔ جس ملک میں اس فائٹر پائلٹ جیسے لاکھوں شہداء اور غازی موجود ہوں، پھر نا اُمیدی اور مایوسی کیوں؟

آئیں، آج ہم غازیوں اور شہداء کے ساتھ مل کر حلفِ وفا کا آغاز کرتے ہیں کہ ہم پاکستان کی بقاء کی خاطر اِک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر زندہ مثال بن جائیں گے اور آزادی کے اس عمل کو ہمیشہ جاری و ساری رکھنے کی کوشش میں اپنے ان رہنماؤں کا ساتھ دیں گے، جنہیں اس دھرتی سے والہانہ لگاؤ ہے۔

اس ناول کے مطالعے کے بعد میرے پیغام کو کس طریقے سے پرکھا جائے گا، آپ کی آرا میرے لئے بیکسن لائٹ کا کام دے گی۔ مجھے اس کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ اور میں محمد علی قریشی صاحب کی تہہِ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے ادب کی دنیا کا در میرے لئے وا کرنے میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ جزاک اللہ۔

آپ سب کی دعاؤں کی طلب گار

رفاقت جاوید



دیوار پر آویزاں فریم میں لکھے ہوئے ان مقدس کلمات کو وہ بڑے انہماک سے پڑھ رہا تھا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ○

''اے جن و انس! تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔''

کمرے کی فضا اور ماحول، نئی نویلی دلہن کے وجود کی مہک سے انوکھی سی طمانیت اور لطافت رچی بسی ہوئی تھی۔

جمال ہم نفس کے شرفِ زیارت کے احساس نے اس کے چہرے کو تابش اور تجلی بنا دیا تھا۔

خوش بخت حجلۂ عروسی میں نیم وا نگاہوں سے اُس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھی۔ اُس کے انگ انگ سے پھوٹتی ہوئی خوشی اُس کے جذبات کی عکاسی کر رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اپنی قسمت پر نازاں، لبوں پر شگفتہ مسکان سجائے، جوگ کے اس افتتاحی مرحلے کو خوش آمدید کہنے کو تیار بیٹھی تھی۔ پہلے دن سے اس رشتے کی بنیاد صداقت، وفا، اعتماد اور بے پناہ چاہ پر رکھی گئی تھی۔ دونوں نے اس تعلق اور ربط میں کسی خدشے یا شک و شبہات کی رتی بھر گنجائش نہ چھوڑی تھی۔ کیونکہ فریفتگی اور پسندیدگی کی لے مدھم پڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی، اگر بروقت اس میں توازن برقرار نہ رکھا جائے۔ جلال خان کی تجربہ کار زندگی کے اصول بہت سادہ اور آسان تھے جنہیں خوش بخت بخوبی جانتی تھی۔

آج دونوں اس نئے سفر پر خود اعتمادی سے گامزن ہوتے ہوئے نشے میں سرشار تھے۔ میز پر چاندی کی طشتری میں گلاب کے پھول، پیتل کے تھال میں مٹھائی اور خاکی

www.iqbalkalmati.blogspot.com



بانس کی ٹوکری میں پھل بے حد قرینے سے سجائے گئے تھے۔ کمرے کی معطر فضا اور مدھم روشنی نے کمرے کے ماحول کو خاصا خوابناک بنا دیا تھا۔ دُلہن کی ناز برداریاں اُٹھانا اور چاؤ چونچلوں سے یہاں تک لانے کا کام جلال خان کے ہم پیالہ وہم نوالہ یاروں کی بیگمات نے وضع داری کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا۔ وہ انہیں قہقہوں اور چھیڑ خانیوں کے بہتے ہوئے آبشاروں کے سپرد کر کے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔

احساسِ خلوت میں اُس نے اپنے ہاتھوں کو گلاب کے مہکتے پھولوں سے بھر لیا اور اُس کو نذرانہ پیش کیا۔ بے حد اپنائیت سے اس کی پاکیزگی کے فسوں اور حُسن و جمال کے سرور میں اُس نے حنا سے نقش و نگار مخروطی اُنگلیوں والے مہکتے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا۔ لبوں پر شیریں کلمات اور ستائش آمیز الفاظ تھے۔ خطابِ سخن کے اس ڈھنگ نے اس کی شخصیت کو مکمل اور بھرپور بنا دیا تھا۔ مدح سرائی کے اس انداز میں خوش بخت جھوم اُٹھی اور تسکین سے اس نے آنکھیں موند لیں۔

جوانِ رعنا ہشاش بشاش چہرے والے صنفِ قوی نے اپنا سر اُس کے گھٹنوں پر رکھ کر شکستگی کا اظہار کیا۔ زرق برق لباس میں ملبوس اور مُشک و عطر میں کھبی ہوئی خوش بخت نے اعتماد اور محبت سے بھرپور مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔ چہرہ رنگِ وفا سے دمک اُٹھا تھا۔ آنکھوں میں مانوسیت کی عبارت قابلِ آفرین تھی۔ اور وہ انجانے اور غیر آشنا سفر میں قدم رکھتے ہوئے خود کو دنیا کی سب سے خوش قسمت ترین لڑکی تصور کرتے ہوئے خوشی اور عالمِ وجد میں مدہوش ہوئے جا رہی تھی۔ عورت کی معصومیت اور ناسمجھی کی تاریخ دہرائی جا رہی تھی۔ جس کا ازل سے ابد تک ایک ہی رنگ ہے، ایک ہی ڈھنگ ہے، ایک ہی طریقہ ہے۔

تھوڑے توقف کے بعد پیار بھری آواز نے کمرے کی فضا کو مزید مسحور کن کر دیا۔

منہ نہ دکھلا دے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ، ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

❖❖○❖❖

عالم خان، سرحد کے ایک گاؤں کا نمبردار تھا۔ اس کا خاندان پرانی روایات اور فرسودہ رسومات کا حامل تھا۔ عالم خان کے دو سپوت رونقِ خاندان اور فخرِ والدین بہار خان اور جلال خان تھے۔ پانچ بیٹیاں آفتِ جان بن کر ان کے سینے پر مونگ دل رہی تھیں۔



حالانکہ شکل و شمائل اور کردار کی پاکیزگی میں بہترین ہونے کے باوجود خاندان کے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ تصور کرنا بڑی عام سی بات تھی۔

بہار خان میٹرک کے بعد اپنے والد کی نمبرداری سنبھالنے پر آمادگی کا اظہار کر چکا تھا۔ اس کے طرز و طریقے اور روشِ زیست پر خاندان قربان ہو ہو جاتا۔ وہ خاندان بھر کی شان اور آن اور مستقبل میں اس کا کرتا دھرتا تھا۔

بہار خان کی شادی، خالہ کی بیٹی سے طے پائی تھی۔ پانچوں بیٹیاں بھائیوں سے بڑی تھیں۔ کم عمری میں ہی اپنے خاندان میں بیاہ کر والدین اپنا فریضہ ادا کر چکے تھے۔ یہ وہ وقت تھا، جب بزرگوں کے فیصلوں پر خاندان کا ہر فرد سرِ تسلیم خم کر لیتا تھا۔ باہر سے کسی کی دخل اندازی کی مجال نہ ہوتی تھی۔ دُلہن اپنے ہی خاندان سے ہونے کی وجہ سے شادی سے پہلے ہی سسرال میں رچی بسی ہوئی تھی۔ جیسے وہ جنم جنم سے ان کا حصہ ہو۔ اگر نوجوان بچوں کے میلان میں بے راہ روی کا ہلکا سا عکس بھی نظر آ جاتا تو تمام حالات کو صیغۂ راز میں رکھتے ہوئے فوراً شادی کر دی جاتی تھی۔ آج کے مسائل اور بہتر سے بہتر پانے کی جستجو کا وہ لوگ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ زندگی آج کی علتوں سے پاک سہل اور سادہ ہوتی تھی، اس لئے کم عمری کی شادی نے ایسے گھرانوں میں اپنی معاشرتی قدروں اور تہذیبی ڈھانچے کو برقرار رکھا ہوا تھا۔

اُن کی اولاد میں جلال خان سب سے چھوٹا تھا۔ پیٹ پونچھن بچہ ہمیشہ سے ہی سب کی آنکھ کا تارا ہوتا ہے۔ جلال خان بھی بے حد لاڈلا اور اپنی ہر بات منوانے والا بچہ تھا۔ دادا اور نانا، جن کے سامنے کوئی آنکھ اُٹھا کر بات نہ کر سکتا تھا، اس نے انہیں بھی آگے لگا رکھا تھا۔ اور خلافِ طبع وہ بھی اس کی کسی ضد اور خواہش کو نہ ٹالتے اور نہ ہی غصہ دکھاتے تھے۔ جلال خان ان کی محبت کی تپش اور حدت کو اچھی طرح بھانپ گیا تھا۔ ہر وقت فائدہ اٹھانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔

جلال خان کو فوجی بننے کا بہت شوق تھا۔ وہ خوابوں، خیالوں میں ہمیشہ وردی زیب تن کئے اپنے ملک کی خدمت میں پیش پیش ہوتا تھا۔ اپنے علاقے اور خاندان کی ترقی اور بہتری کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ اور پھر ایک دن اس نے اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار آغا جی سے کر ڈالا تو وہ غیض و غضب میں تلملا اُٹھے۔ کوئی بھی غیرت مند پٹھان،

www.iqbalkalmati.blogspot.com



انگریزی فوج کا حصہ بننے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اب تک اس قوم کا تجربہ انگریزوں کے ساتھ کافی تلخ رہا تھا۔ پچھلے دس سالوں میں انگریز کی عملی کارکردگی پٹھان قوم کے خلاف تھی۔ اس عرصے میں بے شمار قبیلے ان کے ظلم وستم کا نشانہ بن چکے تھے۔ سینکڑوں گھر مسمار اور درجنوں افراد شہید کر دیئے گئے تھے۔ انگریز کا مقصد ان تمام آزاد قبائل کو اپنے تسلط میں لانا تھا۔ ان کے خاندان کے کئی جوان لڑکوں کو اغوا کر لیا گیا تھا، جس کی وجہ سے ان میں نفرت و حقارت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ جلال خان کی اس انہونی خواہش پر خاندان میں طوفان برپا ہو گیا۔ ہر طرح کے طریقے اور ہتھکنڈے اُس کے خیالات کو بدلنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔ آغا جی کی جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی بھی بے اثر ہو کر رہ گئی تھی۔ آغا جی کے حکم قطعی کے آگے کسی کو انکار کرنے کی اجازت نہ تھی۔ سب اُس کی جرأت اور بے باکی پر خوف سے لرز اُٹھے تھے۔ اُس کی آزاد رو اور باغیانہ سوچ نے سب کو ہراساں و پریشان کر دیا تھا۔ ماں کی منتوں، نصیحتوں اور دھمکیوں نے بھی کوئی کام نہ کیا۔ چار سُو طعنوں کی بھرمار تھی...... یہ بے غیرت، انگریز کی غلامی کرے گا۔ اس کی جھوٹن کھائے گا۔ آغا جی کے بے جا لاڈ و پیار نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ وہ اپنی لیاقت اور قابلیت پر نازاں خاندان کی پُرستائش تعریفوں کی وجہ سے تو تھا۔ آج سب کی مخالفت پر حیرت میں ڈوب گیا۔ ہر طرح کی قیل و قال کے باوجود وہ اپنے ارادوں پر ڈٹا ہوا تھا۔ وہ کئی راتوں سے جاگ رہا تھا۔ اس کی سب کو خبر تھی۔ آغا جی اپنے دلائل میں بے حد راسخ ہونے کے باوجود جلال خان کی محبت میں کمزور پڑتے نظر آنے لگے۔ انہوں نے اسے اکیلے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ جلال خان بچپن سے ہی ان کے مزاج کے مدوجزر سے آشنا تھا۔ اسے اپنی فتح مندی کے آثار کا شبہ ہونے لگا تو وہ اپنی فصاحت وفراست اور دُور اندیشی سے اُنہیں رام کرنے کی آخری کوشش پر زور دینے لگا۔ آج کی گفت و شنید میں ضد اور ہٹ دھرمی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آنکھیں ادب کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ سرِ تسلیم خم تھا۔ زبان میں شہد جیسی شیرینی اور لفظوں میں التجا تھی۔ لہجہ پُرسکون اور صلح جو تھا۔ آغا جی سے مخاطب ہونے اور اپنی بات منوانے کے گُر کو وہ ہرگز بھولا نہیں تھا۔ بڑی لجاجت سے بولا۔

''آغا جی! آپ کا حکم ماننے سے انکار کرنے کی مجھ میں جرأت نہیں۔ صرف ایک



دفعہ میری التجا پر غور فرمائیں۔ آپ بہت دانش مند اور دُور اندیش انسان ہیں۔ میری اس ضد کے پیچھے کیا کارفرما ہے؟ آپ کو سمجھنے میں قطعاً دیر نہیں لگے گی۔''

''تم پھر بے تکے پن پر اُتر آئے ہو۔ ابھی تک ضد تمہارے دماغ پر آسیب کی طرح مسلط ہے۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے۔ میرا فیصلہ درست ہے۔ اچھے برے کی تمیز مجھے ہے، تمہیں نہیں۔ زندگی کے تجربات میں تم بالکل نابلد ہو۔ میری مانوسیت اور محبت نے تمہیں نافرمانی اور حکم عدولی پر اُکسایا ہے۔ میں اس وقت کو کوستا ہوں، جب میں نے تمہاری ہر خواہش کو پورا کیا۔'' انہوں نے حقے کا لمبا کش لیا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا اور دکھی لہجے میں بولے۔

''بدقسمتی سے میرے خاندان میں جانی دشمن نے جنم لیا اور ہم نے انجانے میں اسے جگر کا خون پلا کر پروان چڑھایا اور آج وہ ہمارے مقابلے میں روبرو کھڑا ہو گیا ہے۔ تم ہمیں نرمی کی سزا دینے لگے ہو جلال خان! میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ تم کان کھول کر سن لو۔ اور یہ بات اپنے پلّے باندھ لو۔ بہتری اسی میں ہے۔'' ان کے لہجے سے خفگی نمایاں تھی۔

''آغا جی! اس پیار کی خاطر آخری بار مجھے اجازت دے دیں۔'' وہ بے حد ملائمت اور دھیمے پن سے بولا۔

''مجھے علم ہے کہ تمہیں اپنی ضد منوانے کے بے شمار ڈھنگ آتے ہیں۔ لیکن اب کوئی خوشامد نہیں چلے گی۔ اور اب نہ ہی مجھے تمہاری ناراضگی کی پروا ہو گی۔'' انہوں نے لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''جلال خان! میں نے کیسے سہانے سپنے دیکھے تھے تمہارے مستقبل کے۔ کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں؟''

''میں آپ کے سپنے ہی تو پورے کرنے جا رہا ہوں آغا جی! آپ اجازت دیں تو بیان کروں۔ فوج میں کمشن لے کر بڑا افسر بننے کے خواب میں ایک بہت کارآمد مقصد پنہاں ہے۔ میری عرض سننے کے بعد آپ جو فیصلہ کریں گے، مجھے کسی قسم کا اعتراض یا انکار نہ ہو گا۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ فرمانبرداری تھی۔

''بولو!'' انہوں نے خشم ناک نگاہوں سے اسے گھورا اور پھر حقے کی گڑگڑ میں مصروف ہو گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"شکریہ آغاجی! میں جانتا ہوں کہ ہم انگریز کی ستائی ہوئی قوم ہیں۔ ہمیں اپنے بچاؤ کے لئے حفظِ ماتقدم کے طور پر کچھ تو کرنا چاہیئے۔ میں نے آپ کی مخالفت کے باوجود اپنی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا یک طرفہ فیصلہ کیوں کرلیا ہے۔ اس ضمن میں مجھے اپنی قوم، اپنے علاقے اور اپنے خاندان کے لئے اَن گنت فوائد نظر آ رہے ہیں۔ ہمارے خاندان کا ہر بچہ فوج میں ہونا چاہیئے۔ اگر آج تک ایسا نہیں ہو سکا تو اب ہی ہمیں اپنی سوچ کو بدل لینا چاہیئے۔ میں ان کے پہناوے، ان کی زبان، ان کے قانون اور اصولوں کو اپنا کر ان کے ذہن میں اُٹھنے والی شوریدہ سوچوں اور دل میں پلنے والے بغض و عناد کی تہہ تک پہنچ سکتا ہوں، ان کی قوت اور طاقت کی جڑ تک پہنچ سکتا ہوں۔ آغاجی! میں اس طریقے سے پختون قوم کا مسیحا بن کر اپنی نسل کو تابندگی اور ضوفشانی بخش سکتا ہوں۔ پھر فوج کا جاہ و جلال اور دبدبہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ ہم انہی کا حصہ بن کر خود کو قوی و قادر بنا سکتے ہیں۔ آپ کے انجان بننے، چشم پوشی اور لاپروائی سے ہماری آگے بڑھنے اور استفادہ حاصل کرنے کی ہر کاوش زائل ہو جائے گی۔ ہمارا خاندان زمانے کی اس دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائے گا اور انجام حیف اور پچھتاوے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

میری عقل اور سوچ پچاس سال آگے دیکھ رہی ہے۔ ہم نے اپنے قبیلے کو مضبوط اور انگریز کے قانون کو کھوکھلا کرنا ہے۔ ہم نے ان کی ستم گری اور دھاندلی کو اپنی سرزمین سے اُکھاڑ پھینکنا ہے اور اپنی قوم کو اس سے نجات دلا کر سب کو آزادی کا شیریں ذائقہ چکھانا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے، کتنے ہی قبیلے اپنے مفاد کی خاطر انگریزوں سے جا ملے ہیں۔ میں اسے بے غیرتی کی فہرست میں نہیں لکھوں گا کیونکہ انہوں نے اپنی سلامتی اور بقا کی خاطر نہایت عقلمندانہ اقدام اُٹھانے کی جرأت کی ہے۔ ایسا قدم اُٹھانے میں اگر ہماری ناک چھوٹی ہوتی ہے تو پھر کوئی اور رستہ نکالنا چاہیئے۔ کیوں نہ ہم مستقل مزاجی اور دُور اندیشی سے ان کے تیار کردہ منصوبوں کی تہہ تک پہنچنے کا ہر حربہ استعمال کریں۔ ہماری قوم کٹھن لمحات سے گزر رہی ہے۔ انگریز پر غلبہ پانا اور اپنی قوم کا سر اونچا کرنا ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ آپ میری نیت پر پورا بھروسہ رکھیں، آغاجی!"

جلال خان کے دلائل اتنے مضبوط اور گہرے تھے کہ اپنا اثر چھوڑے بغیر نہ رہ سکے۔

آغاجی حالتِ استغراق میں بیٹھے سوچنے لگے۔ کیونکہ اس کے لہجے کی پائیداری اور



دُور اندیشی نے ان پر غلبہ پا لیا تھا۔ ورنہ آغاجی کی ایسی غیر مترقبہ خواہش پر رضامند ہو جانا معمولی بات نہ تھی۔ عقابی نظر رکھنے والے یہ بزرگ سچ مچ بہت جہاندیدہ نکلے۔ انہوں نے صحیح معنوں میں اپنا پتا مار کر اس کی خواہش اور اپنی قوم کے فوائد کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ کیونکہ اس کی ضد جائز اور گفتگو بہت وزن دار تھی۔

کاتبِ تقدیر نے اس کا ساتھ دیا اور یہ بے شمار دعاؤں کے سائے تلے دیرہ دون اکیڈمی فوجی تربیت کے لئے چلا گیا۔ وہ رات سب کے لئے کس قدر بھاری تھی۔ پٹھان خاندان کا بیٹا ان سے جدا ہو کر انگریز کی قربت اپنانے جا رہا تھا۔ اپنوں اور غیروں کا سامنا کرتے ہوئے انہیں احساسِ ندامت پانی پانی کر رہا تھا۔ سب حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ کاش جلال خان اپنے بڑے بھائی کے نقشِ قدم پر چل کر فخر سے ان کا سر بلند کر دیتا۔ خاندان کی عزت اور غیرت و انا کو مجروح کرنا اس کے لئے کس قدر آسان تھا۔ سب اس کی اس حرکت پر حیرت زدہ تھے۔ اور آغاجی کا ناقابلِ فہم فیصلہ سب کو ہلا دینے کو کافی تھا۔

❖❖○❖❖

دن ہفتوں، مہینوں اور سالوں کی مسافت طے کرتے بیت گئے۔ اور اس کی گریجوایشن کا دن آ پہنچا۔

جلال خان نے اپنے آغاجی اور والد کو اپنی گریجوایشن پر مدعو کر لیا۔ انہوں نے جلال خان کی عزت و منزلت اور نظم و ضبط کو خاص الخاص نظروں سے پرکھا۔ یونیفارم میں وہ کس قدر بارُعب اور مدبر لگ رہا تھا۔ اس نے فخر سے آغاجی کو ہر ایک سے ملوایا اور آغاجی دوسروں کی زبانی اس کی قابلِ آفرین باتیں سن کر دل ہی دل میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اظہار کرنا ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ پھر بھی آج اُن کی فراخ دلی اور فیاضی کا وطیرہ فرق ضرور تھا۔ آج انہیں اپنی دقیانوسی نسل کا نیا اور جدید جلال خان، انگریز کی تہذیب کا نمائندہ لگ رہا تھا۔ پھر بھی ان کی گردن تکبر و غرور سے تنی ہوئی تھی۔ بے شک وہ ایک ذمہ دار اور بااعتماد افسر بن کر مکمل طور پر انگریز کے گروپ میں شامل ہو گیا تھا۔ جس پر آغاجی کو زیاں و ضرر کے بجائے فوائد ہی نظر آ رہے تھے۔ مگر تمام تاثرات اپنے دل کے اندر ہی دبائے ہوئے تھے۔ کیونکہ وہ جلال خان کو کسی صورت کوئی ڈھیل

www.iqbalkalmati.blogspot.com



دینے کے سزاوار نہ تھے۔ وہ اسے اپنی رضامندی کے احسان کے بوجھ تلے دبائے اس کے آئندہ کے تمام فیصلوں کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ اسی میں وہ اپنے خاندان کی بھلائی تصور کرتے تھے۔

وقت کے ساتھ جلال خان کی جدت پسندی زور پکڑ رہی تھی۔ طبعاً وہ آزاد رو تو تھا ہی۔ رہی سہی کسر اکیڈمی کی تربیت نے نکال دی تھی۔ آج کی دنیا، بچپن کے بیتے ہوئے دنوں سے بالکل مختلف تھی۔ اُس کی اُڑان میں فرازی تھی، سوچ میں پستی یا کم ہمتی کا ہلکا سا شائبہ تک نہ تھا۔ اُس کے اس وطیرے کو آغا جی اپنی جہاندیدہ نظروں سے پڑھ رہے تھے۔

اب آغا جی کو اُس کے رشتے کی فکر لاحق ہوگئی۔ اُن کو خدشہ تھا کہ پہلے ہی اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے خاندان کو چھوڑ کر انگریزی ماحول کو اپنا چکا تھا۔ اُس کے طور اطوار، رہن سہن اور اندازِ گفتگو کی تبدیلی پر اُس کے خیالات کی گہری چھاپ نظر آتی تھی، جس سے انہوں نے محسوس کیا کہ کل وہ بیوی بھی اپنی پسند کی لانے پر تُل گیا تو کوئی دھمکی کام نہ آئے گی۔ اُس کی پہلی خودسری کو ابھی تک کوئی بھی فراموش نہ کر سکا تھا۔ دوسری نافرمانی کی گنجائش چھوڑنا اِک نئے طوفان کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ اُن کی جہاندیدہ نظروں نے پوت کے پاؤں پالنے میں ہی پرکھ تو لئے تھے۔ پہلی ضد کے تمام نتائج کے تاریک اور روشن پہلو آہستہ آہستہ ان کے سامنے ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ جس کی وجہ سے آغا جی نے اس کے رشتے کی خواہش کا اظہار دبے لفظوں میں اپنے خاندان میں کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر کسی طرف سے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں مل رہا تھا۔ گاؤں میں یہ گورا سپاہی کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ جو اُن کا پاسبان یا محسن ہونے کے بجائے ان کے دشمنوں کا خیرخواہ اور اُن کا کارندہ تھا۔ اُن کے مستحکم اور پکے خیالات کو بدلنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔

آخر آغا جی نے بے حد سوچ بچار کے بعد اس گمبھیر مسئلے کا حل بیٹوں کے سامنے رکھ دیا کہ بہتر ہے اس کا رشتہ کلثوم سے کر دیا جائے۔ جو اس کے تایا کی بیٹی بھی ہے۔ گو کہ وہ اس سے پانچ سال بڑی ہے تو کیا ہوا؟ خونی رشتوں میں سب کچھ ہی جائز ہے۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے تمام جائیداد کی وارث بھی ہے۔ اپنی دولت اور اپنی عزت کو اپنے



گھر کی زینت بنانے میں کیا مضائقہ ہے؟

کلثوم کا والد، باپ کے سامنے چاہتے ہوئے بھی کوئی اعتراض و انکار نہ کر سکا۔ حفظِ مراتب کا پاس رکھتے ہوئے وہ اس یک طرفہ تجویز پر خاموش ہی رہا۔ جبکہ کلثوم کی ماں نے خاصا اودھم مچایا۔ وہ آہ و فغاں کرتی رہ گئی۔ اُسے اپنی اکلوتی بیٹی کے لئے ایسا داماد ہرگز نہیں چاہئے تھا۔ مگر اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ کامیابی ہمیشہ مرد کے نصیب میں لکھی گئی ہے۔ وہ اسے حقِ عظیم سمجھ کر وصول کر لیتا ہے۔ آغا جی کو پوتے کو چاروں طرف سے پا لینے کی تمنا اور گھر کی دولت گھر میں سما جانے کا نشہ ان کی سوچ و سمجھ کو سلب کر گیا تھا۔ ایک تیر سے دو شکار کی فتح یابی پر وہ بے حد مسرور تھے۔

آغا جی نے اگلے دن جلال خان کو حکم صادر کیا کہ وہ جلد از جلد ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گاؤں پہنچ جائے۔

اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ اُسے خطرے کی گھنٹیاں بجتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ چھٹی حِس پوری طرح بیدار ہو چکی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ انہونی ہونے والی ہے۔ اسی تذبذب کے عالم میں وہ ہفتے کی چھٹی لے کر گاؤں پہنچ گیا۔ اندیشے اور وسوسے صادق نکلے۔ آغا جی کا بلاوا معمولی بات نہ تھی۔ اس کے رشتے کی خبر گاؤں بھر میں آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ اُس پر تو جیسے بجلی ہی گر گئی۔ اُس نے سوتے جاگتے اپنی شادی کے کیا کیا سہانے اور حسین سپنے دیکھے تھے۔ ان کی تعبیر کو قبول کرنے سے وہ قاصر تھا۔ وہ آغا جی کے سامنے پھر سے ہر طرح کے دلائل پر اُتر آیا۔ اُس کی گستاخی اور نافرمانی نے گھر کی فضا کو جہنم بنا دیا۔

آغا جی کے ننگ و ناموس کو بٹہ لگانے والا اور ان کی حرمت و ساکھ میں دھبہ لگانے والا کوئی پیدا نہ ہوا تھا۔ خاندان بھر میں بزرگوں کی تعظیم و تکریم کے قواعد اور عرض و معروض کو ڈھنگ اور اصول سیکھنا ہر ذی روح کا اوّلین فرض سمجھا جاتا تھا۔ مگر یہ بچہ کس قدر عاقبت نااندیش اور عملی طور پر باغی نکلا تھا کہ پے در پے اپنی روایات کی بنیادوں کو کمزور اور کھوکھلا کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ یہ بھی جہاں بین اور زمانہ ساز لوگ تھے۔ انہوں نے اس کے دلائل اور دھواں دھواں ہونے والی بحث کو رد کیا۔ ان کے کہنے کے مطابق یہ ناسمجھ اور کمسن بچہ ہے۔ اسے اپنا گاؤں چھوڑے سالہا سال ہو گئے ہیں۔ اسے اپنے خونی رشتوں کی نہ قدر و قیمت ہے نہ پہچان ہے۔ اپنے خونی بندھن سے چھٹکارا اور بے وفائی کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com



معاف کرنا ریت کے سراسر خلاف تھا۔ یہ نہیں جانتا کہ اس خون میں کتنی مٹھاس اور جذباتی پختگی پنہاں ہوتی ہے۔ ہر مشکل گھڑی میں یہی خونی رشتے سایہ بن کر آسودگی مہیا کرتے ہیں۔ ان رشتوں کو ابدی حیات بخشنا ان کے فرائض کا اہم حصہ تھا۔ اس کے فوج میں جانے کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ گوری چمڑی والی کو پکڑ کر ہماری بہو بنا دے۔ کیسی عجیب بکواس کرتا ہے؟ کہ میرے ساتھ پڑھی لکھی بیوی چل سکتی ہے۔ میں اپنی نئی نسل کو جدید تعلیم اور نئی سوچ دینا چاہتا ہوں۔ واہ بھئی واہ! ہمیں عقل سکھانے چلا ہے۔ کیا نقص اور کمی ہے ہماری تہذیب میں؟ اس لڑکے نے ہمیں کس قدر بے وقوف بنایا ہے۔ اس کی پہلی نافرمانی پر اسے ایسا سبق سکھاتے کہ نسلیں یاد رکھتیں۔ پہلی شکست کا پچھتاوا ذہن پر آسیب کی طرح چھا گیا۔ اس دفعہ اسے سبق سکھانے کی پوری تیاری ہو چکی تھی۔

آغا جی غصے سے گرج اُٹھے اور بیٹے کی جانب مڑ کر بولے۔

"جا کر اپنی نانہجار اولاد کو سمجھا دو کہ اب تمہاری بغاوت اور گستاخی ہم پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ رشتہ طے ہو چکا ہے، مٹھائی بٹ چکی ہے، مبارکبادیں وصول کر لی گئی ہیں۔ یہ کوئی مذاق یا تماشا نہیں۔ شکرانے کے نفل پڑھے کہ اس احمق کی کھپت اپنے گھر میں ہو گئی ہے۔ کسی نے اس کو منہ تک لگانا گوارا نہیں سمجھا۔ خود کو تیس مار خان سمجھتا ہے کیا؟......

پرسوں جمعہ ہے۔ نکاح اور رخصتی کی تیاری شروع کریں۔ اتوار کو دھوم دھام سے ولیمہ ہونا چاہئے۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے، ہم بند باندھ کر بپھرے ہوئے سیلاب سے اپنے خاندان کو بچا لیں، اسی میں ہماری سلامتی ہے۔ جلال خان پر کڑی نگرانی ضروری ہو گئی ہے۔ وہ ہمارا منہ کالا کرنے میں دریغ نہیں کرے گا۔"

بیٹوں نے اثبات میں سر ہلایا اور آغا جی اپنے حقے کے کش لیتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

❖❖○❖❖

جلال خان خاموش، سب کی نصیحتیں سن رہا تھا۔ جو کہ اسے سراسر گھٹیا اور بے تکی لگ رہی تھیں۔ وہ زندگی کا موازنہ اُن کے طریقوں سے کرنے سے قاصر تھا۔ اس نے باہر کی دنیا میں پروان چڑھ کر اپنی زندگی سے انصاف کرنا سیکھا تھا۔ اکیڈمی کے نشیب و فراز میں رہ کر سر اُٹھا کر چلنا سیکھا تھا۔ ہر طرح کے ماحول میں پرورش پانے والے لڑکوں کے



ساتھ رہنا، اُٹھنا بیٹھنا اُس کی تربیت میں شامل تھا۔ افسران کے ساتھ بہترین تعلقات استوار رکھنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بہت سچا، نڈر اور محنتی ہونے کی وجہ سے سب میں مقبول ہونے کے ساتھ اپنی قابلیت اور ذہانت کا لوہا منوا چکا تھا۔ یہ بات قابلِ قبول تھی کہ آغا جی کے لاڈ و پیار نے ہی اس میں خود اعتمادی کُوٹ کُوٹ کر بھر دی تھی۔ یہ دلکش خواب تو پورا ہو گیا تھا۔ مگر دوسرے خواب کی تعبیر بڑی جان لیوا ثابت ہو رہی تھی۔ بزرگوں کی نظر میں یہ سب اس کی بد دماغی اور حرصا حرصی، طفل مزاجی اور فرنگی تربیت کے نتائج تھے۔ جلال خان نے ان کے فیصلے کی پختگی کو جانچ کر فطانت اور دانش مندی سے خاندانی ریت کو برقرار تو رکھ لیا تھا مگر دل میں کچوکے لگ رہے تھے۔

جلال خان، کلثوم کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے یہ بھی بے حد ضدی اور تند مزاج تھی۔ خود پرستی اور تکبر کا جواب نہ تھا۔ والدین کو بھی اس کے لئے کوئی رشتہ پسند نہ آتا تھا۔ آغا جی کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ تمام لڑکیوں میں عمر سے بڑھ گئی تھی۔ لڑکیاں اُس کا مذاق اُڑا کر اُسے نیچا دکھانے کی کوشش میں ہوتیں۔ بڑی بوڑھیاں مارے غم و فکر کے اس کو بات بات پر طعنوں سے نوازتی تھیں۔ یوں اس کی تلخ کلامی اور خفگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جب اس کے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ اُس کے چچا کے بیٹے نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے، وہ اپنی خود داری اور انا کو مجروح ہوتے دیکھ کر سیخ پا ہو گئی۔ اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی۔ مگر مصلحت خاموشی میں ہی تھی۔ کیونکہ اس کے انکار کے باوجود شنوائی ناممکن تھی۔ اُس کے دل و دماغ میں ایک سوال نے گرہ لگا لی تھی کہ اُس نے کس کو کس بات پر ٹھکرایا ہے۔ جبکہ یہ جائیداد کی واحد وارث ہونے کے ساتھ خوش شکل بھی ہے۔ وہ اس سے کافی چھوٹا ہونے اور ایک ہی گھر میں رہنے کی وجہ سے اسے کسی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اس سے شادی کا تصور تو کبھی خواب میں بھی نہ کیا تھا۔ وہ نہ اُسے پسند کرتی تھی، نہ اُسے اہمیت دیتی تھی۔ اور اب خاندان بھر کا ٹھکرایا ہوا یہ گورا سپاہی بحالتِ مجبوری اُس کو اپنی زندگی میں شامل کرنے جا رہا تھا۔ اور تمام زندگی اس پر احسانِ عظیم جتاتا رہے گا۔ کلثوم کی رضامندی بھی مجبوری کا ہی پیش خیمہ تھی۔ اس لئے یہ خبر دونوں کے لئے مژدۂ راحت و مسرت افزا نہ بن سکی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آغا جی جمعہ کی صبح کو چند بزرگوں کی موجودگی میں نکاح کی رسم بے حد سادگی سے ادا کر کے کلثوم کو اپنے گھر لے آئے۔ یہ حقیقت دونوں کے لئے کس قدر بھیانک اور گھناؤنی تھی۔ جس کے نازل ہونے کی انہیں خبر تک نہ ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ کیسے آناً فاناً ہو گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کو روادار نہ تھے۔ آج تک انہوں نے بیسیوں شادیاں والدین کے اشارے پر پایۂ تکمیل تک پہنچتے دیکھی تھیں۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ان کی نکاح کی پد بھی اسی ظالمانہ طریقے سے بٹے گی۔

ولیمے کا پروگرام اتوار کو رکھا گیا تھا۔ جلال خان چارسُو پھیلے ہوئے اندھیرے میں کھو چکا تھا۔ جال کی مضبوط گرفت میں جکڑا ہوا طوعاً کرہاً، آدمیت کا جامہ پہنے آزردگی اور عالمِ قنوط میں وہ کھبتا چلا گیا۔ چہرہ اُس کے قلق اور کوفتِ دل کی داستان پیش کر رہا تھا۔ چہرے پر مایوسی اور ہونٹوں پر آہوں کا بسیرا تھا۔ وہ کسی سے کوئی گلہ شکوہ کیا کرتا؟ جبکہ اس کی زبان کو وہاں سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ سب ہوش وخرد سے بیگانہ اپنی فتح پر نازاں تھے اور وہ کتنا اکیلا تھا۔

ولیمے کی تیاری تیزی سے شروع ہو چکی تھی۔ وسیع وعریض قلعہ نما گھر کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ آتش بازی کا سماں دیکھنے لائق تھا۔ گاؤں بھر میں چراغاں کیا گیا تھا۔ صدقے اور خیراتیں تقسیم کی جا رہی تھیں۔ ڈومنیاں اپنی بے سُری آواز کا جادو جگانے میں کوشاں تھیں۔ ڈھولک کی تھاپ پر لڈیاں ڈالی جا رہی تھیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لیکن دُلہا اور دُلہن کے چہرے خفگی اور مایوسی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ قصور دونوں کا نہیں تھا۔ فیصلہ تو بزرگوں کا تھا۔

❖❖○❖❖

وہ ہفتے کی چھٹی گزار کر واپس چلا گیا۔ وہ ہر وقت کلثوم کے بارے میں سوچتا رہتا۔ وہ بزرگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کی سزا کلثوم کو دینے کے حق میں نہ تھا۔ وہ اُس کی شریکِ حیات تھی۔ وہ اُسے اپنی کامیاب زندگی کے ہر پہلو سے روشناس کرانا چاہتا تھا۔ اُسے تعلیم جیسے مایہ ناز زیور سے آراستہ کر کے جدید ماحول کی شان وشوکت کی باسی بنانا چاہتا تھا۔ وہ اُسے اپنی زندگی سے انصاف کرنے کے گُر سکھانے کے منصوبے بناتا رہتا۔

وہ ہر مہینے گھر کا چکر لگا لیتا تھا۔ کلثوم اُس کی بیوی ضرور تھی لیکن اُس کی دوست اور ہم نوا نہ تھی۔ ظاہر ہے دونوں کی سوچ میں زمین و آسمان کا لامتناہی فاصلہ تھا۔ کلثوم کی سوچ پر اپنی خاندانی تربیت اور پرورش کی مکمل طور پر چھاپ تھی۔ جسے جلال خان اُس کا قصور یا اُس پر الزام عائد کر کے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے دستبردار ہونے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بے گناہ، معصوم اور انجان، دنیا کے گہرے اور شوخ رنگوں کی پہچان ہی نہ کر سکتی تھی۔ وہ جب بھی اسے اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کا اظہار کرتا تو ہر طرف سے مخالفت کے نعرے بلند ہوتے سنائی دیتے۔ کیونکہ آج تک اس خاندان کی عورتوں نے اپنے گاؤں سے باہر قدم تک نہ نکالا تھا۔

کلثوم کو اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہونا چاہئے تھا، جسے جلال خان جیسا کبر و پندار سے پاک، طمانیت اور تسکین سے بھرپور شوہر نصیب ہوا تھا جو اُس کی تمام جاہلانہ حرکات و سکنات پر بے پروائی اور بے نیازی کا اظہار کر کے دھیمے پن سے اس کی عزتِ نفس کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور دل ہی دل میں اپنی پاک دامن اور سادہ لوح بیوی پر ترس اور رحم کی آمیزش بے قرار کر جاتی۔ اس لئے وہ کلثوم کو اپنے اعتماد میں لے کر اس جاہلانہ دنیا سے دُور لے جا کر اپنی ذات اور شخصیت کو منوانے اور سنوارنے کی باتیں کرتا رہتا۔ اُس کی سوچ میں انقلاب لانے کے تمام سبز باغ دکھاتا رہتا۔ اُس کے دبے ہوئے جذبوں اور خواہشوں کو اُبھارنے کے لئے اُس کی ہر بات کو اہمیت دے کر نہایت عقلمندی اور آہستگی سے اُس کے روشن پہلو کی طرف لے آتا تھا، جس میں محبت کی تپش اور حدت کے ساتھ اس کے سیکھنے کے کئی رُخ نمایاں ہوتے تھے۔ جسے وہ بڑی بے نیازی سے رد کر دیتی۔ کیونکہ وہ کسی صورت خود کو کسی سے کمتر نہیں سمجھتی تھی۔ گاؤں میں اس کی حاکمیت ہر ایک پر چلتی تھی۔ اس لئے وہ جلال خان کی کسی بات پر کان نہ دھرتی تھی۔ وہ اسے ہر دفعہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ ہم دونوں کی باہمی رفاقت کے فوائد ہماری اگلی نسل میں نمایاں طور پر نظر آئیں گے۔ میرے اور تمہارے بچے ہمارے خاندان کے لئے مشعلِ راہ کا کام دینے کے قابل بن کر اس گاؤں کی قسمت بدل دیں گے۔ یہاں کی جہالت اور کسمپرسی کو دُور کریں گے۔ یہی ہماری کامیابی ہو گی۔ ہمارے خاندان کی ٹھاٹ اور آن بان کی اس سیڑھی پر پہلے قدم ہمارے اُٹھیں گے۔ اور تمہارے تعاون سے یہ زینہ طے کرنے میں کوئی دُشواری یا پچھتاوا ہمارا سامنا نہیں کرے گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



وہ اُمید و موہوم کی دنیا میں پہنچ جاتا۔ وہ اسے اس ماحول سے نکالنے اور اپنی طرف راغب کرنے کے تمام گُر نہایت عقلمندی سے استعمال کرتا رہتا تھا۔ مگر اُسے ہر دفعہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔

’’مجھے اس دن کا انتظار ہے، جب میری ثومی ہمارے ساتھ رہ کر وہاں کے اصول و طریقے اپناتے ہوئے خود اعتمادی سے اس ماحول کی پروردہ خواتین سے شستہ اُردو میں بات کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ اور اُکتاہٹ محسوس نہیں کرے گی۔

اللہ تعالیٰ نے انہی عورتوں کی طرح تمہارے اندر بھی لاتعداد صلاحیتیں وافر مقدار میں ڈالی ہیں۔ ہم نے ان کو سامنے لا کر اُجاگر کرنا ہے۔ تم اس ماحول میں جو کچھ سیکھ چکی ہو، سر آنکھوں پر۔ میں اپنی تہذیب اور رکھ رکھاؤ کو عزت و منزلت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ میں کسی احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہوں۔ تمہاری اور میری تہذیب میں بے شمار خوبیاں ہیں۔ کوئی تہذیب اونچی یا نیچی، بڑی یا چھوٹی نہیں ہوتی۔ ہم دونوں نے مل کر اپنی تہذیب کی جہالت اور تنگ نظری کو دُور کرنا ہے۔ باقی کوئی برائی نہیں ہم میں اور ہماری تہذیب میں۔ میں نے تمہارے لئے ایک استانی کا انتظام کر لیا ہے۔ تمہاری ذہانت پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ تم بہت جلد بہت کچھ سیکھ جاؤ گی۔‘‘

’’اس کی کیا ضرورت ہے جلال خان؟‘‘ وہ لاپروائی سے بولی۔

’’ضرورت ہماری نئی نسل کو ہوگی۔ تمہیں پڑھنا لکھنا سب سکھاؤں گا۔ ہاں تو گاڑی چلانا بھی سکھاؤں گا۔‘‘ وہ بہت نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

’’ہائے، گاڑی چلانا...... جلال خان! کیسی باتیں کرتے ہو؟ خدا کے لئے یہ مردوں کے کام مجھے نہ سکھاؤ تو بہتر ہے۔ پہلے ہی تمہارے یہ خیالات سب کو پریشان کئے رکھتے ہیں۔ تمہارے اصول اور خود ساختہ قانون کا سایہ ہمیں ذلالت کی دلدل میں پھنسا دے گا۔‘‘ وہ مضطرب ہو کر بولی۔

’’تم اس ماحول میں رہو گی تو تمہیں میری باتوں کی سچائی اور اہمیت پر یقین ہو جائے گا کلثوم! تم میری زندگی کی ساتھی ہو۔ تمہیں میں اپنے دم قدم چلانا چاہتا ہوں۔ اس دنیا سے متعارف کرانا چاہتا ہوں، جہاں عورت اپنے شوہر کے شانہ بشانہ چل کر اپنے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو رہی ہے۔ میں ان عورتوں کو بڑی حسرت اور رشک سے



دیکھتا ہوں، جو اپنے بچوں کو خود سکول چھوڑنے جاتی ہیں۔ خود گاڑی چلا کر اپنے کام کرتی ہیں۔ وہ خاوند کی محتاج نہیں ہیں۔ ان کی اپنی زندگی میں اپنی مرضی کے مطابق دوست احباب ہیں۔ تم ایسی کیوں نہیں ہو سکتی؟ تم میں کس چیز کی کمی ہے؟ جس کی کمی ہے، اُسے ہم دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اوائل میں تمہیں تھوڑی دُشواری پیش آئے گی۔ پھر تم ایسا چلو گی بلکہ دوڑو گی کہ مجھے پیچھے چھوڑ جاؤ گی۔ اب تم نے ایک کام کرنا ہے۔ تم نے میرے والدین کو میرے ساتھ جانے پر رضامند کرنا ہے۔ آغا جی سے میں خود نمٹ لوں گا۔‘‘ وہ بے حد لگاوٹ سے بولا۔

’’جلال خان! اُن کو منانا آسان کام نہیں۔ دوسرا مجھے تمہارے ساتھ ایسے انجان ماحول میں جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا ہے۔ میں یہاں ہی درست ہوں۔ مجھے اب آئندہ ایسی فضول باتیں نہیں کہنی۔ میں تمہارے جانے کے بعد سوچتی رہتی ہوں اور پریشانی میں ہر کام کو اُلٹا کر دیتی ہوں۔ چاچی سے بھی ڈانٹ کھاتی ہوں۔ اور پھر گھنٹوں پچھتاوے کی حالت میں بزرگوں کو کوستی رہتی ہوں، جنہوں نے یہ بے جوڑ رشتہ کر کے ہم دونوں کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔‘‘ وہ روہانسی ہو گئی۔

’’کوئی مشکل نہیں کلثوم!...... بس میرے ساتھ تعاون کر لو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دنیا آگے بڑھ رہی ہے کلثوم! ہمارا خاندان ایک ہی نقطے پر کیوں منجمد ہے؟ نام اور دولت ہی ہر مسئلے کا حل نہیں، اس کے ساتھ تعلیم بے حد ضروری ہے۔ میں اپنے خاندان کے کسی فرد کو کچھ نہیں سمجھا سکتا۔ تم میرا ساتھی ہو۔ تمہیں میری سوچ اور میری زبان کی سمجھ آنی چاہئے۔ کیونکہ تم کند ذہن نہیں ہو۔ بہت گہرائی ہے تمہاری سوچ میں۔ ورنہ تم سے ایسی توقعات کیوں رکھتا؟‘‘ وہ خوشامدی لہجے میں بول رہا تھا۔

’’جلال خان! مجھے تمہاری باتیں اَن ہونی اور بے وزن لگ رہی ہیں۔ ایک عورت کا جو کام ہے، جو فرائض ہیں، میں بہ خوبی جانتی ہوں۔ اللہ نے بچے دیئے تو اُن کو بھی اعلیٰ طریقے سے پروان چڑھاؤں گی۔ مگر یہ نئے سرے سے تختی اور سلیٹ لے کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اب پڑھائی کا کام بچوں کا ہے، میرا نہیں۔‘‘ وہ اٹل لہجے میں بولی۔

’’تمہارے طریقوں اور اصولوں سے پلے ہوئے بچے کیا بنیں گے؟‘‘ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ’’ایسے بچوں سے خاندان بھرا ہوا ہے۔ کلثوم! مجھے اس زمانے کے ساتھ چلنے والی

www.iqbalkalmati.blogspot.com



بیوی اور اولاد چاہئے۔ میری بیوی گاؤں کی عورتوں سے بالکل الگ ہونی چاہئے۔ میرے بچے تعلیمی اور تہذیبی لحاظ سے یہاں سے مختلف ہونے چاہئیں۔ یہ میری خواہش اور حکم ہے۔ غور سے سن لو۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

''تمہیں وہم ہو گیا ہے جلال خان! اپنے دماغ کو ٹھیک کرو۔ کسی اور کے سامنے ایسی باتیں کرو گے تو پاگل کہلاؤ گے۔'' وہ سچ مچ فکر مند ہو گئی۔

''بس یوں ہی سمجھو کہ اس خاندان میں اِک پاگل نے جنم لے لیا ہے، جو تمہارا شوہرِ نامدار ہے۔''

وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اور وہ خوف زدہ ہو کر رونے لگی۔

''رونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کاش! تمہیں یہ علم ہو جائے کہ اس خاندان نے تمہارے ساتھ کہاں کہاں بے انصافی اور زیادتی کی ہے۔ تمہیں انہوں نے زیر رکھ کر تمہاری ذات کی ہتک کی ہے۔ تمہاری پیدائش کو نفرت اور حقارت سے دیکھا گیا ہے۔ تمہیں تعلیم اور زندگی کے تمام حقوق سے ناآشنا رکھ کر تمہاری شادی پر تم سے رضامندی لئے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر دیا۔ تمہیں اعتراض کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور وہ جانوروں کی طرح ایک کھولی سے کھول کر دوسری کھولی پر باندھ کر خوشی منانے لگے۔ کیا تم اپنے مقدر کو اور اپنی بیٹی کے نصیب کو بدلنے کی تگ و دو نہیں کرو گی؟'' وہ بے حد آزردگی سے بول رہا تھا۔

''جلال خان! مجھے تمہاری باتیں سچ مچ بیوقوفانہ لگتی ہیں۔ ان میں پاگل پن کی جھلک نمایاں ہے۔ مجھے پریشان کرنا چھوڑ دو۔ تمہارے آنے کا سن کر مجھے خوشی کے بجائے پریشانی لاحق ہو جاتی ہے۔'' وہ ابھی بھی ٹسوے بہا رہی تھی۔

''کلثوم! کچھ تو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی اور ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام زندگی کی کامیابیوں کا سندیسہ ہے۔ تم اپنی دُور اندیشی اور تحمل سے بہاؤ کا رُخ بدل سکتی ہو، پیچیدہ مسائل کو خوش اسلوبی سے پرکھنا اور پُر اسرار بھیدوں کے حاصل میں اپنی محبتوں اور وفاؤں کی مہکار سے چاشنی بھرنا تمہاری ذات کی پہچان اور شان ہے۔ زندگی کی خاردار راہوں کو نرم و گداز بنانا تمہارا کام ہے۔ تمہیں اپنی طاقت کا اندازہ ہی نہیں۔ یہ تم ہی ہو جو اس خاندان کی قسمت بدل کر سکون، کامرانی اور شادمانی نسل در



نسل چلانے کے لئے کمربستہ ہو سکتی ہو۔ کیونکہ تم شوہر کی نظر میں سمجھ بوجھ رکھنے والی ذات ہو۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ پیار کے ساتھ احترام بھی تھا۔

''جلال خان! مجھے یہ بتاؤ کہ تم میں ایسی کون سی شاخِ زعفران لگی ہے کہ مجھے اتنی حقارت سے دیکھتے ہو؟ گاؤں میں ذرا لوگوں سے پوچھو کہ میری کتنی عزت و قدر ہے اور لڑکیاں میرے مشورے پر چلتی ہیں۔ تم ہو کہ مجھے کس قدر احمق، بے وقوف اور جاہل سمجھتے ہو۔ ہائے، میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ ایک رات سکھ کا سانس نہیں لیا۔ ہر وقت کی چخ چخ اور تکرار سے میں تنگ آ گئی ہوں۔'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ''بس چھوڑ دو میری جان۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔''

''ثومی جان! خفا کیوں ہوتی ہو؟ مجھے غلط مت سمجھو۔ میں تمہاری ہر خوبی کا اقرار کرتا ہوں۔ جان! دیکھو، تمہاری اتنی بھرپور شخصیت میں یہ ہلکا سا داغ کیونکر ہو؟ تمہاری آغوش بچوں کی پہلی درس گاہ ہو گی۔ اور تم اس درس گاہ کی ہیڈ مسٹریس ہو گی۔ اگر تم جہالت، توہمات میں ملوث رہو گی تو بتاؤ تمہاری درس گاہ میں پڑھنے والے بچے بھی وہی سبق سیکھیں گے جو میں اُنہیں نہیں پڑھانا چاہتا۔'' اس کے لہجے میں پیار تھا۔

''کلثوم! تمہیں یاد ہے، میں نے بچپن میں ایک طوطا پالا تھا۔ کئی سالوں بعد مجھے اُس کی قید کا احساس ستانے لگا تو میں نے چپکے سے اس کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ تا کہ یہ بھی باقی طوطوں کے مانند آزاد پنچھی بن کر باقی ماندہ زندگی سے لطف اندوز ہو سکے۔ گھنٹوں دروازہ کھلا رہا، مگر طوطا باہر نہ نکلا۔ میں نے اسے پکڑ کر پنجرے پر بٹھا دیا۔ وہ اُڑنے کے بجائے خوف زدہ ہو کر واپس پنجرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہی حال تمہارا ہے۔ تمہیں قید کی صعوبتیں جھیلنے کی عادت ہو گئی ہے۔ آزادی کا سوچ کر تمہارا دم گھٹتا ہے۔ ہمارے خاندان نے عورت کے ساتھ یہی تو ظلم کیا ہے۔'' اس کا لہجہ ملائمت سے بھرپور تھا۔

''جلال خان! خام خیالی سے نکل آؤ۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''کلثوم! میں تمہاری جگہ ہوتا تو اپنے شوہر کی ان میٹھی اور بامعنی باتوں پر لٹو ہو کر اپنا دل و جان، دین و ایمان، اپنا پیار دُلار، اپنی تمام دولت و نعم، ہوش و حواس کا نذرانہ پیش کر دیتا۔'' وہ اُس کی بات کو ہنسی میں ٹالتے ہوئے بولا۔ ''چلو باہر چلتے ہیں۔ باغ میں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com



بکھین کے نیچے کھٹولا ڈال کر بیٹھتے ہیں اور آزاد اُڑتے ہوئے پرندوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔“

”ہم دونوں باغ میں جائیں گے؟“ وہ حواس باختہ ہوگئی۔ کیونکہ ان کی ریت کے مطابق یہ بات بالکل بے جا اور فضول تھی۔ وہ اُسے کس قدر نا قابلِ فہم لگا تھا۔

”ہاں...... کیا برائی ہے اس میں؟ وہاں گُو بھی بن رہا ہوگا۔ بہت مزا آئے گا۔ تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔“ وہ اُسے تنگ کر رہا تھا۔ اُسے اس گھر کے باوا آدم کے نرالے ہونے پر رتی بھر شک نہ تھا۔ کلثوم نے اتنا رولیا تھا کہ وہ اُسے بہلانے اور ہنسانے کی کوشش کرنے لگا۔

ہر دفعہ کلثوم اُس کی آزادروسوچ پر اُس سے لڑنے جھگڑنے لگتی۔ جو منہ میں آتا، بولتی چلی جاتی۔ اُس کا ہم خیال ہونا تو درکنار، وہ اُسے پاگل پن کے دورے کی بیماری سمجھ کر اپنی پھوٹی ہوئی قسمت پر ماتم کرنے لگتی اور بیزاری سے کروٹ بدل کر سو جاتی۔

جلال خان اُس کی محدود سوچ پر صبر کا پیمانہ پی کر پھر سے نئے منصوبے پر کام کرنے لگتا۔ چھٹیاں اسی عالم میں گزر جاتیں۔ اور وہ مکمل طور پر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر واپس لوٹ جاتا۔

❖❖○❖❖



”جلال خان! خوشی کی خبر چھپائے بیٹھی ہوں۔ سننا پسند کرو گے؟“ ماں نے خوشی اور شرم کے ملے جلے جذبات میں سرگوشی کی۔

جلال خان کے کان کھڑے ہو گئے اور چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

”تم باپ بننے والے ہو۔“ وہ رازداری سے بولی۔ ”یہ خبر مجھ تک ہی ہے۔ ابھی کسی کو نہیں بتائی۔ ورنہ نظر لگ جاتی ہے۔“

وہ ماں کی اس دقیانوسی بات پر ہنس دیا۔ یہ کہتے کہتے رک گیا کہ گاؤں میں بچوں کی بھرمار ہے، کون نظر لگائے گا؟ فوراً خوشی سے بولا۔

”کلثوم نے ذکر نہیں کیا۔ طبیعت کی ناسازی کا بول رہی تھی۔ آہا، اس لئے وہ طبیعت کا بتاتے ہوئے شرما رہی تھی۔“

”ارے تمہیں کھلم کھلا کیا بتاتی؟ بہت بلند بختوں والی بچی ہے۔ تم بہت خوش قسمت ہو جلال خان! اب میری مانو، سرکار کی نوکری چھوڑ کر گھر آ جاؤ۔ دو دو خوشیوں میں گاؤں بھر میں مٹھائی تقسیم کروں گی۔ پیر صاحب کے دربار پر نیاز دینے جاؤں گی۔ چادر کا چڑھاوا بھی چڑھاؤں گی۔ بس تم اب گھر آ کر اپنی ذمہ داریاں اُٹھا لو۔ بچوں پر باپ کا سایہ بہت ضروری ہوتا ہے۔ ہمیشہ بے مہار بچے، خاندان کی بدنامی و رُسوائی کا باعث بنتے ہیں۔ یہاں کس چیز کی کمی ہے۔“ ماں بڑے پیار سے سمجھا رہی تھی۔

”بی بی جان! میں اتنے مہینوں سے یہی سمجھانے کی کوشش میں ہوں کہ کلثوم کو میرے ہمراہ بھیج دیں۔ تاکہ ہم دونوں مل کر اپنے بچوں کی تربیت کر سکیں۔ مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔ جس کا مجھے اندیشہ تھا، وہی ہوا۔ اب کلثوم کے میرے ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا۔ وہ میری ذمہ داری ہے۔ فی الحال اسے فوری طور پر ڈاکٹر کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ضرورت ہے۔ ہر مہینے اس کا معائنہ ہونا ضروری ہو گیا ہے۔ میں رہائش کا انتظام کر کے اگلے ہفتے آ کر لے جاؤں گا۔ آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔ میرے بچے میرے سائے تلے پل کر جوان ہوں گے۔'' وہ باادب لہجے میں بولا۔ ''آپ اس کی تیاری شروع کریں۔''

''وہاں کہاں لے جاؤ گے؟ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد اس حال میں تمہارے ساتھ کیسے جا سکتی ہے؟ اس کا ہماری آنکھوں کے سامنے رہنا ہی مناسب ہے۔ وہاں اس کا خیال کون رکھے گا؟ بے چاری کیسے پیلی پڑ گئی ہے۔ باقی دائی نے معائنہ کر کے ہمیں تسلی دے دی ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ تم بھی مطمئن رہو۔'' ماں نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

''وہاں اس کا خیال رکھنے کے بہترین انتظامات موجود ہیں۔ فوجیوں کا بہت اچھا ہسپتال ہے۔ بڑے قابل ڈاکٹر ہیں۔ اسے ہر طرح کی سہولت اور دیکھ بھال میسر ہو گی۔ بلکہ یہاں رہنے میں خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔'' وہ بہت سنجیدہ تھا۔

''بیٹے! آج تک کسی لڑکی نے اپنے خاوند کی خاطر اپنا گاؤں، اپنا سسرال چھوڑ کر الگ تھلگ گھر بسانے کا کبھی سوچا تک نہیں۔ ایسا کرنے سے رشتوں کی کشش میں خودغرضی خون کی حدت میں ٹھنڈک اور اس کی سرخی میں سفیدی آ جاتی ہے۔ تم یہ کیسی باتیں کرتے ہو؟'' ماں تڑپ کر بولی۔

''بی بی جان! اب زمانہ بدل چکا ہے۔ ہمیں بھی زمانے کی ریت کو اپنانا چاہئے۔ میاں بیوی کا مل کر رہنا اور اپنی زندگی کو اپنی خواہش اور ڈھنگ سے گزارنے میں کوئی عیب تو نہیں۔ اگر آپ کو میری خوشیاں عزیز ہیں تو میرے ارادوں، میری سوچوں اور میرے اعمال کے مقاصد کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ تو ماں ہیں۔ جو دو جہاں کے جنت کے دریچے اولاد کے لئے ہر لحظہ کھولے رکھتی ہے۔ یہ قوت اور تقدس صرف آپ کے نصیب میں لکھا گیا ہے۔'' وہ ماں کے پاؤں دباتے ہوئے بولا۔ ''بی بی! میرے تمام دوستوں کی بیویاں اور بچے ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار ہے۔ میں حسرت سے انہیں دیکھتا ہوں اور تمنا کرتا ہوں کہ میری بیوی اور میرے بچے، میرے رُتبے کی تمام سہولیات کا فائدہ اُٹھا سکیں۔''

''تم دوسروں کی دیکھا دیکھی ویسا بننے کی تمنا مت کرو۔ ہم زمانے کو اپنے مطابق



ڈھالتے آئے ہیں۔ خود کو بدلنا ہماری ہار اور تباہی ہے۔ یہاں ہمارا نام چلتا ہے ہم تم سے اور تمہاری اولاد سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارے خاندان کے نام کو اسی طرح بلند و بالا رکھیں جیسے ہمارے آباء و اجداد نے کیا ہے۔ تم فوج میں بھرتی ہو گئے۔ یہ بتاؤ کہ خاندان کو یا قبیلے اور علاقے کو کیا فیض یابی بخشی ہے تم نے؟ آغا جی اس دن کے انتظار میں ہیں۔ جو تم نے ان سے عہد و پیمان کیے تھے، کب پورے کرو گے؟''

ماں نے بڑی کھری سنا دی تھیں۔ وہ ہکا بکا اُن کا منہ تکنے لگا۔

''تم کلثوم کو تنگ کرنا چھوڑ دو۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ گھر واپس آ جاؤ۔ چھوڑو ان نوکریوں کو۔ اس میں کیا رکھا ہے، سوائے ذلالت کے؟'' وہ سخت بےزاری سے بولی۔

''بی بی جان! میں آپ سے یہ اُمید نہیں رکھتا تھا۔ واحد ماں کا رشتہ پاکیزہ اور بےلوث ہوتا ہے۔'' وہ سمجھداری سے بولا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اس خاندان کے تمام طے شدہ قوانین اور اصولوں کی خلاف ورزی کروں گی؟ نہیں میرے بچے! میں ایسا کرنا تو درکنار، ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ جلال خان! کاش تم بہار خان جیسے ہوتے۔ دیکھو میرے لعل! وہ اپنی زندگی میں کتنا مطمئن اور خوش ہے۔ خاندان کا بچہ بچہ اُس کے مشورے پر چلتا ہے کیونکہ وہ اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل کر اُنہی کے صلاح مشورے کا پابند ہے۔ اُس کی تمام حرکات و سکنات اسی خاندان کے رکھ رکھاؤ کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ بہار خان ہماری اگلی نسل کے لئے وہ روشنی ہے جو تاریکیوں کو نگل لے گی۔ مجھے اُس کی ماں ہونے پر فخر ہے۔ تم بھی ان کے طرز اور طور طریقے اپنا کر اپنی جگہ بنا لو، ورنہ اکیلے رہ جاؤ گے۔ مجھے تمہاری فکر کھائے جا رہی ہے۔ تمہاری یہ باتیں آغا جی کو بہت ناپسند ہیں۔ وہ مجھے ہر وقت طعنوں سے نوازتے رہتے ہیں۔ کلثوم کو ساتھ لے جانے کے بارے میں منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالنا۔ کیونکہ تمہیں ان کا برا بھلا کہنا، کوسنا اور بددعائیں دینا میرے دل کو چھلنی کر دیتا ہے۔ نہ جانے اتنی خودسری اور نافرمانی تم نے کہاں سے لی ہے۔''

وہ رو رہی تھی۔ اور وہ سر پکڑ کر سوچنے لگا کہ ماں کی سوچ ٹھیک ہی تو ہے۔ اس کو باغی تصور کرنا کسی صورت غلط نہ تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ ممتا کے پیار کے تقاضے اور شرائط میں اولاد کے خلاف ایک لفظ بھی سننا بہت جان لیوا ہوتا ہے۔ وہ آئے دن اس کی مخالفت

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کرنے والوں سے جھگڑ پڑتی۔ اُس کا مذاق اُڑانے والوں سے بات کرنا چھوڑ دیتی۔ یہ قلق اُسے ہر وقت آزردہ رکھتا تھا۔ وہ سر جھکائے گھنٹوں سوچتی رہتی کہ اپنے لختِ جگر کی زندگی کو خوشیوں سے ہمکنار کیسے کردے۔

اسی کشمکش میں کئی مہینے بیت گئے۔ آخر جلال خان تہیہ کر کے کلثوم کو لینے پہنچ گیا۔ کیونکہ دُوری اور فاصلے کی وجہ سے گاؤں آنا کافی دُشوار تھا۔ وہ ماں اور بچے کی صحت کے لئے ہر وقت فکر مند رہنے لگا تھا۔ جب ماں نے اُس کے ارادوں کی مضبوطی کو بھانپ لیا تو تڑپ اُٹھی۔

"جلال خان! تمہیں میری باتیں سمجھ کیوں نہیں آتیں؟ ہمارے خاندان کی عورتوں نے سینکڑوں بچے جنے ہیں۔ گھر کی یہ پرانی دائیاں بڑی تجربہ کار ہیں۔ ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ تم ہماری روایات اور رسومات کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔ دراصل تمہارے آغا جی نہ کمزور پڑتے تو سب ٹھیک رہتا۔ اُن کی ناقابل تلافی غلطی نے آئے دن آزمائش میں ڈالا ہوتا ہے۔ تم انگریز کا غلام کیا بنے، ہر حرکت سے انگریزی ہی ٹپک رہی ہے۔ کلثوم ہسپتال میں بچہ پیدا نہیں کرے گی۔ اُسے تنگ کرنا چھوڑ دو۔ خدا کے لئے اُس معصوم پر رحم کرو۔" ماں نے خوب ڈانٹ پلا دی۔

وہ اُن کی ناسمجھی پر تلملا اُٹھا۔

"بی بی جان! معائنہ کرانے میں کوئی ہرج نہیں۔ اگر کوئی مسئلہ نہ ہوا تو آپ کی خواہش کو پورا کیا جائے گا۔ ورنہ ڈاکٹروں کی مدد لینی پڑے گی۔" وہ احترام سے بولا۔

"دنیا جہاں میں اُس کو ننگا اور ذلیل مت کرو۔ وہ ہمارے خاندان کی پہلی عورت نہیں جو حاملہ ہوئی ہے۔ تمہاری بے غیرتی نے مجھے حیران کر دیا ہے۔" ماں خفگی سے بولی۔

وہ چپکے سے اُٹھا اور کلثوم کے پاس چلا گیا۔ وہ بھی نہ جانے پر بضد تھی۔ ہر طرح کے بحث مباحثے کے بعد اُس نے آخری پتا پھینکا۔

"اگر کلثوم کو معائنے کے لئے نہ بھیجا گیا تو اُسے جان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ آخر پہلے کئی دفعہ اَن پڑھ دائیوں کی وجہ سے کتنی عورتیں جان کھو چکی ہیں۔"

کلثوم کے ساتھ ایسا ہونا نئی بات نہ تھی۔ تیر بہدف ایسا تھا کہ کلثوم کو جان کے



لالے پڑ گئے۔ کلثوم کی پریشانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے بڑی دیدی نے سب کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا اور عورتوں کی اِک فوج کے ساتھ کلثوم فوجی ہسپتال پہنچ گئی۔ ہر طرح کا معائنہ ہوا۔ یہ سن کر کہ بچے جڑواں ہیں، سب خوف سے دہل گئے۔ ظاہر ہے ایسی خبر ان کو ہلا دینے کے لئے کافی تھی کہ ڈاکٹروں کی مدد کے بغیر زچہ و بچہ کی جان خطرے میں ہو سکتی ہے۔

جلال خان نے موقع غنیمت جانا اور فوراً چھاؤنی میں اپنے گھر میں کلثوم کو لے گیا۔ گھر چھوٹا تھا۔ عورتوں اور نوکرانیوں کی فوج کے لئے ناکافی ضرور تھا، مگر حالات کے پیشِ نظر سب کو برداشت کرنا پڑا۔ کلثوم پہلے ہی خوف زدہ تھی، اب تو وہ اور بھی پریشان ہو گئی۔ کلثوم کو سب نے ہتھیلی کا چھپھولا بنا لیا۔ جلال خان کے دوستوں کی بیویاں اس کی تیمارداری کو پہنچ جاتیں۔ اس کی پریشانی پر وہ انہیں تسلی و تشفی دیتیں اور پیٹھ پیچھے اس کی جہالت اور ناسمجھی کا مذاق بھی اُڑاتیں۔ کلثوم ان کو خاطر میں ہی نہ لاتی۔ وہ انہیں بہت کمتر اور گھٹیا سمجھ کر اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بہت کچھ کہہ جاتی۔ اپنی منطق سے انہیں رام کرنے کی کوشش کرتی جیسے زندگی کے ہر ورق کا مطالعہ کرنا صرف اسی کو آتا ہے۔ خود پسندی اور خود اعتمادی کا جواب نہ تھا۔ وہ جلال خان کی توجہ اور لگاوٹ پر خوش ہونے کے بجائے طنز کے نشتر چلاتی۔ ماں اور بہن کو بھی وہ بڑا ہی چھچھورا لگا تھا۔ ان کی سوچ میں بیوی کے لئے رقیق القلب ہونا اور اس کی ہر بات پر فریفتہ ہونا مردانگی کے خلاف لگا تھا۔ کیونکہ ان کی سوچ میں رعونیت، تمکنت اور بے توجہی ہی اس کے اونچے اور مقتدر خاندان کی پہچان تھی۔ جس کا اس کی ذات میں دُور دُور تک دخل نہ تھا۔ وہ اپنے اعمال میں ایسا راسخ الاعتقاد تھا کہ ان کی کسی بات کو دل سے نہ لگاتا اور ان کی پروا کئے بغیر اپنی من مانی کرتا۔ بلکہ ان کی تنقید و تمہید پر افتاں و خیزاں ہونے کے بجائے ہر بات کو ہنس کر ٹال دیتا۔ دوستوں میں اس کا گھرانہ موضوعِ گفتگو تھا۔ ان کی جاہلانہ باتیں اور خود پسند حرکتیں محوِ گردش تھیں۔ کیونکہ دوستوں کی بیگمات نے ان خواتین کو پرکھ کر ان کے خاندان کا نقشہ تشکیل دے دیا تھا جو کافی حد تک درست اور مناسب تھا۔

خدا خدا کر کے وہ وقت آ پہنچا جب کلثوم نے جڑواں بچوں کو جنم دے دیا۔ جلال خان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ تشکرانہ نگاہوں سے کلثوم کو دیکھتا۔ تندرست و توانا

www.iqbalkalmati.blogspot.com



خوبصورت بیٹوں کی پیدائش ماں کو کس قدر مسرور کر دیتی ہے۔ کلثوم میں کبر و پندار نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اب تو وہ اپنے شوہر کی نظر میں کمتر نہیں رہی۔ اس کے وجود نے اس کے نام کو جلا بخشی ہے۔ اس کی سوچ اپنی جگہ بڑی وزن دار تھی۔ کیونکہ قدرت کی تخلیق میں اس نے بہت اہم کردار ادا جو کیا تھا۔ جبکہ جلال خان کے خیالات میں کلثوم کے عظیم کردار اور عمل کی شروعات اب ہوئی تھی۔ ماں نے ان بچوں کو علم و ادب کے تمام پہلوؤں سے روشناس کر کے بہترین اور قابلِ فخر انسان بنانا تھا۔ اس میں کلثوم کی ہم آہنگی، اتفاق و اتحاد کے بغیر کامیابی ناممکن تھی۔ کیونکہ پڑھی لکھی ماں ہی اولاد کو عرشِ بریں کے ذائقے اور نشے سے ہمکنار کرتی ہے اور پستیوں اور ناکامیوں کو اس کے مقدر سے نکال کر خوشحالی کے راستے پر گامزن کر سکتی ہے۔

بچوں کی پیدائش کا سن کر گاؤں کا ہر فرد مبارکباد کے لئے کلثوم کے پاس آنا چاہتا تھا۔ گھر چھوٹا ہونے کی وجہ سے کلثوم کی سب کے سامنے بہت سبکی ہوتی۔ اس لئے وہ ہسپتال سے سیدھی گاؤں جانا چاہتی تھی۔ اتنا طویل سفر ماں اور بچوں کے لئے خطرناک ہو سکتا تھا۔ مگر عورتوں کی ضد کے سامنے ہار گیا۔ عورتوں کے جتھے میں آج تک کوئی مرد جیت سکا ہے؟ ناممکن۔

❖❖○❖❖

چار مہینوں بعد جلال خان گاؤں پہنچا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ دونوں خوبصورت اور توانا بچے بے حد کمزور اور بیمار معلوم ہو رہے تھے۔ رات بھر روتے رہتے، دن بھر سوتے۔ کلثوم کے لئے یہ سب بہت نارمل تھا۔ کیونکہ اس نے گاؤں میں بچوں کی پرورش کے یہی طریقے دیکھے تھے کہ دیسی جڑی بوٹیوں سے علاج سے جتنا سا افاقہ ہو جاتا، غنیمت ہوتا تھا۔ بچوں کی کھانے پینے، سونے جاگنے کی روٹین کا تصور بھی نہیں کیا جاتا۔

آپریشن سے بچوں کا اس دنیا میں آنا گاؤں کے لوگوں کے لئے بہت انہونی اور خطرناک بات تھی۔ ماں نے کلثوم کو مرغن کھانوں کے ساتھ اسے چارپائی سے اُٹھنے تک نہ دیا۔ جس کی وجہ سے وہ موٹاپے اور بدنمائی کا بری طرح شکار ہو چکی تھی۔ مارے الکس کے پورا دن سوتی۔ بچے دادی اور نانی کے ہاتھوں میں پل رہے تھے۔ جلال خان اپنے



بچوں کو یوں پلتا دیکھ کر تڑپ اُٹھا۔ اُس نے کلثوم کی نیستی اور بے جانخروں پر آواز اُٹھا دی۔ اور اس کے ساتھ چلنے کا حکم صادر کر دیا۔ سب نے اس کے تیور اور خیالات کو بھانپ لیا تھا۔ صلح کُل میں ہی بہتری سمجھ کر کلثوم کو ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ وہ مجبوری و بے بسی کے عالم میں پُرنم اور شکستہ دل کے ساتھ اپنی قسمت کو کوستی کہ کس مین میخ نکالنے والے شوہر کے ساتھ پالا پڑا ہے۔ سب کو آشفتگی میں چھوڑ کر اُس کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ ماں ساتھ ہی تھی، جو بچوں کو سنبھالنے میں راستے بھر اُس کی مدد کرتی رہی۔

وہ اُنہیں لے کر سیدھا ہسپتال پہنچا۔ ڈاکٹر نے دونوں بچوں کو فوراً داخل کر لیا۔ کلثوم یہ سن کر خوف سے کانپ اُٹھی کہ اس کے بچے اس قدر کمزور اور بیمار ہیں کہ چند دنوں میں وہ اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ سکتے ہیں۔ اب اُس نے دل ہی دل میں جلال خان کے پاس رہنے کا تہیہ کر لیا۔

جلال خان نے تربیت یافتہ دو آیا کا انتظام کر لیا۔ دنوں میں بچے تندرستی کی طرف مائل ہو گئے۔ اب جلال خان کی توجہ کلثوم کی طرف مبذول ہوئی۔ اس نے اس کے کھانے کا چارٹ ڈاکٹر کے مشورے سے بنوا لیا۔ اس پابندی پر وہ بِلک بِلک کر رو دی تھی مگر اعتراض اور انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اسے طوعاً و کرہاً وہی کھانا تھا جس کا حکم بیٹ مین کو دے دیا جاتا تھا۔ اگلا قدم اُس کی ورزش کا تھا۔ جلال خان روزانہ مغرب کے بعد اس کو چہل قدمی کے لئے لے جانے لگا۔ جسم میں درد، ٹانگوں میں تکلیف کا رونا، کمزوری اور نقاہت کا وِرد، جلال خان پر کچھ اثر نہ کر سکا۔

اسی تگ و دو میں دو مہینے گزر گئے۔ بچوں نے بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ تمام رات گہری نیند لیتے۔ رونا تو جیسے انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ جلال خان اور کلثوم بچوں کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے۔

کلثوم کا وزن بھی تیزی سے گرنے لگا تھا۔ جسم کا بے ڈھنگا پن اور طبیعت کی سستی نے رفو چکر ہو کر اس کے چہرے کو پُرکشش بنا دیا تھا۔ وہ پٹھانی فراک اور تنگ شلوار میں بھی بھلی لگنے لگی تھی۔

جلال خان کی اگلی کوشش شروع ہو چکی تھی۔ وہ اُسے بازار لے جاتا اور اُسے رواج کے مطابق کپڑے، جوتے خرید کر دیتا جسے آج تک پہننے کی اس میں ہمت نہ ہوئی تھی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com



جلال خان فی الحال خاموشی سے یکے بعد دیگرے اسے اپنے مطابق کر رہا تھا۔ زیادہ دباؤ کے حق میں وہ ہرگز نہ تھا۔ وہ پیار کی مار سے اپنی ہر بات منوانے کے درپے تھا جس میں کامیابی ہوتی نظر آ رہی تھی۔

یوں ہی چار مہینے گزر گئے۔ کلثوم کی شخصیت میں فرق نمایاں ہونے لگا۔ اب ہر اتوار کو جلال خان اُسے فلم کے لئے لے جانے لگا۔ رات کا کھانا بھی باہر ہوتا۔ کلثوم کو یہ سب کچھ اچھا تو لگ رہا تھا مگر گاؤں کی زندگی سے بڑھ کر نہیں۔ وہاں تو وہ آزاد پنچھی تھی۔ جو دل میں آیا، وہی کیا۔ کسی کا جبر یا زبردستی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ کئی دفعہ جلال خان کو واپس جانے کی دھمکی دے چکی تھی، جسے وہ مسکرا کر ٹال جاتا۔ مگر اپنے مقصد پر کمربستہ رہنا تو اس کی فطرت میں شامل تھا۔

آغا جی کے بھی خط آنے شروع ہو چکے تھے۔ ان کا شیر خان اور دلیر خان کے لئے اُداس ہونا قدرتی امر تھا۔ وہ انہیں ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتا۔ کیونکہ اُسے شک تھا کہ کلثوم ایک دفعہ چلی گئی تو پھر واپس نہیں آئے گی۔ وہ اُسے اس ماحول کا عادی بنانے اور اس کے ساتھ رہنے کی عیش و عشرت کی عادت ڈالنا چاہتا تھا۔

اب اس نے اس کو اصلی مقصد کی طرف لانا تھا۔ استانی اسے گھر پر پڑھانے آنے لگی تھی۔ مارے شرم کے وہ منہ سے ایک لفظ نہ نکالتی تھی۔ کئی ہفتے اسی طرح گزر گئے۔ زبان کے قفل اتنی آسانی سے کھلنے والے کہاں تھے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر قاعدہ، تختی اور سلیٹ کوڑے کے ڈھیر پر پھنکوا دیتی۔ جلال خان صبر و تحمل سے دوسرے دن پھر نئی خرید کر لا دیتا اور جی بھر کر اس کی حوصلہ افزائی کرتا۔ اُس کی کسی گستاخی اور بدزبانی پر برا منانا تو دُور کی بات، ماتھے پر شکن تک نہ ڈالتا۔ ہنستا مسکراتا اُسے سمجھانے پر اُتر آتا۔

اب کلثوم کو اس ماحول سے چڑ اور بوریت ہونے لگی تھی۔ پابندی اور قید کے احساس سے اُکتاہٹ اور گھٹن مضطرب کرنے لگی تھی۔ بات بات پر جلال خان سے اُلجھ جاتی۔ ہر کام اُلٹا کرتی۔ اُسے ستانے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی۔ کلثوم تربیت یافتہ آیا میں کیڑے نکالنے لگی۔ اب وہ اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ گاؤں سے نوکرانیاں لانے پر زور دینے لگی۔ کیونکہ اسے ویسی بے تکی اور بدسلیقہ نوکرانیوں کی عادت تھی۔ وہ ان کے ساتھ مکمل طور پر گھل مل کر رہنے، ان کے مسائل سننے اور اپنی روداد بتانے میں زیادہ خوش و



مطمئن رہ سکتی تھی۔ وقتاً فوقتاً اپنا غیظ و غضب بھی ان پر نکال کر دل کا غبار نکالنا بھی ضروری تھا۔ دوسری طرف سے پھر بھی خوشامدیں، شان میں قصیدے، تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا خاصا تسکین آمیز ہوتا۔ اُس نے جب سے آنکھ کھولی تھی، تب سے اُس نے ایسا ہی ہوتے دیکھا تھا۔ یہاں تک بیٹ مین، بیرے، نوکر چاکر اُسے قطعاً پسند نہ تھے۔ وہ اُن کے ساتھ لئے دیئے رہنے والے تعلقات سے اُکتا چکی تھی۔ وہ اس عارضی خول اور لبادے کے شکنجے سے نکل کر آزاد ہونا چاہتی تھی۔ اور یہ آزادی صرف گاؤں میں ہی ممکن تھی۔

جلال خان اُس کے روّیے سے خاصا افسردہ ہو گیا تھا۔ ہمت اور حوصلے بلند رکھنا اس کی فوجی تربیت کا حصہ تھا۔ وہ ہار ماننے والا کہاں تھا۔ وہ اُس کے اکیلے پن اور بوریت کو ختم کرنے کے منصوبے بنانے لگا۔ اُس نے اتوار کو اپنے دوستوں اور اُن کی بیگمات کو ضیافت پر اپنے گھر مدعو کر لیا۔ یہ سن کر کلثوم کے چہرے پر معمولی سی مسکراہٹ آئی اور غائب ہو گئی، جسے جلال خان نے محسوس کر لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ ان خواتین کو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اسے اوّل درجے کی جھوٹی اور مکار لگتی تھیں۔ ان سے مل کر اسے کبھی بھی تسلی بخش گمان نہ ہوا تھا۔

آج کلثوم نے دونوں بیٹوں کو خوب تیار کیا، صاف ستھرا کھلا پاجامہ، گریبان کڑھا ہوا چمکتا ہوا کُرتہ، ننھے منے لال رنگ کے کھسے پہنا کر بالوں میں تیل اور ٹیڑھی مانگ نکال کر آنکھوں میں سُرمے کے ڈورے کھینچ کر گورے توانا گالوں پر نظر بٹو کالا تل لگا کر وہ خوشی سے ہواؤں میں اُڑتی جا رہی تھی۔ کیونکہ آج وہ اُسے بہت حسین لگ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر گمان ہوتا جیسے بڑے جوان مردوں کو کسی نے چھوٹا کر دیا ہو۔ مگر بچے اس لباس میں بے آرام ہو چکے تھے۔ آیا نے کپڑے بدلنے کا مشورہ دیا تو وہ سیخ پا ہو کر اُن پر برس پڑی۔ آخر بچے مہمانوں کے آنے تک رو رو کر ہلکان ہو کر سو گئے۔

کلثوم نے اپنا سولہ سنگھار بھی کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ اُس نے زرد رنگ کے سنہری کام والے کپڑے زیب تن کر کے بالوں میں دھنیے کا تیل لگایا، دو چٹیاں بنا کر کپڑوں کے ارد گرد عطر کی شیشی اُنڈیلی، میک اپ ایسا کہ جیسے ابھی ابھی چونے کے ڈرم میں چہرہ ڈال کر نکالا ہو۔ آنکھوں سے کاجل باہر نکلنے کو تڑپ رہا تھا۔ لال لپ اسٹک نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہونٹوں کے اردگرد ہالہ بنا لیا تھا۔ آپا نے ایک دوسرے کو آنکھ ماری اور تعریفوں کے پُل باندھ دیے۔ اس نے بھاری بھرکم دوپٹے کو اپنی چاروں طرف لپیٹا اور سنہرے رنگ کی ایڑی والی جوتی پہن کر شیشے کے سامنے ہر زاویے سے خود کا جائزہ لیا۔ تفاخر سے بھوئیں اُوپر کی جانب تن گئی تھیں۔ بے چینی اور بے کلی سے جلال خان کا انتظار کرنے لگی۔ اُس کی گاڑی باہر آ کر رُکی ہی تھی کہ وہ بھاگتی ہوئی دروازہ کھولنے پہنچ گئی۔ جلال خان حواس باختہ اُسے دیکھنے لگا۔ وہ شرما کر بولی۔

"جلال خان! کیسی لگ رہی ہوں؟"

"بہت حسین۔" اُس کی آواز گلے میں ہی اٹک گئی تھی۔ مصلحتاً خاموشی ہی بہتر تھی۔ اس نے پیار سے اُس کے چہرے کو رومال سے صاف کرنے کی کوشش کی۔

"میرا میک اپ تو خراب نہ کرو۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی تو اُس نے ہاتھ کھینچ لیا اور مسکرا کر بولا۔

"اچھی لگ رہی ہو۔ ذرا سا کم کرو گی تو اور خوب صورت لگو گی۔"

کلثوم نے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے میں چلی گئی۔

شام سات بجے مہمان تشریف لا چکے تھے۔ جلال، بیگم کو بلانے آیا تو اُس نے شرما کر مردوں کے سامنے جانے سے انکار کر دیا۔ بات درست تھی کہ اس کے لئے غیر مردوں میں بیٹھنا معیوب تھا۔ خواتین کلثوم کے کمرے میں آ گئیں۔ جونہی اُن کی نظر کلثوم پر پڑی۔ ہنس کر بولیں۔

"آپ شادی سے آ رہی ہیں یا جانے کی تیاری میں ہیں؟ کہیں ہم غلط دن تو نہیں آ گئے؟"

یہ سن کر کلثوم جل کر رہ گئی۔ وہ ان کا مطلب سمجھ چکی تھی۔ مگر خاموشی ہی رہی۔ کوئی جواب نہ بن پایا تھا۔

اب خواتین آپس میں گپ شپ میں مصروف ہو گئیں۔ ہنسی مذاق، قہقہے، بچوں کی باتیں، نوکروں کی شکایتیں، گھر کو سجانے کے مشورے، نئے نئے فیشن اپنانے کے طریقے، شوہر کو ہاتھ میں کرنے کے ہتھکنڈے سسرال سے چھٹکارا حاصل کرنے کی نصیحتیں اور کڑوی کسیلی باتیں۔ غرضیکہ ہر موضوع پر تبادلہ خیال کیا جا رہا تھا۔ فراٹے سے انگلش، اُردو



بولے جا رہی تھی۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ جب کسی سے مرعوب ہو جائیں تو خاموشی ہونٹوں پر حیرت اور ندامت آنکھوں میں بسیرا کر لیتی ہے اور سر صرف ہاں اور نہ کی صورت میں جنبش کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال کلثوم کا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔ اُسے آج جلال خان کی تقریروں اور نصیحتوں کی سمجھ آ گئی تھی۔ اس کو اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش کا مقصد پا لیا تھا۔ اس کی سوچ ہمیشہ کی طرح آج بھی نفی ہی تھی۔ تلملا کر بولی۔

"آپ کو داج میں سونا کپڑے نہیں ملے۔ ہائے اللہ! مجھے تو آپ سب پر بے پناہ ترس آ رہا ہے۔"

"کچھ ایسا ہی سمجھیں مسز جلال!" ایک نے طنزیہ کہا۔

"مجھے ایک سو ایک تولے سونا میکے سے ملا تھا اور اتنا ہی سسرال سے۔ کپڑے دو سو جوڑے، بے شمار جوتے اور گھر کا سامان ملا تھا۔ ابھی تک بے شمار جوڑوں کے ٹانکے بھی نہیں کھلے۔ بچوں نے ہی پاگل کر دیا ہے۔ آج مہینوں بعد دل کھول کر تیار ہوئی ہوں۔" وہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولی۔

"آج تو جلال بھائی پاگل ہو گئے ہوں گے۔ ہے نا؟" دوسری نے تیر چھوڑا۔

"ہاں، کچھ ایسے ہی ہے۔" وہ شرما دی۔ اور ایک طویل اور گونج دار قہقہہ کمرے میں پھیل گیا۔

"آپ تو امیر کبیر خاندان سے ہیں۔ ہم بے چارے بھوکے پیاسے، بھیک منگے لوگ۔ ایسے کپڑے اور زیور ہمارے نصیب میں کہاں۔" ایک نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"سچ بتاؤں، مجھے بے حد افسوس ہوا ہے آپ لوگوں کی حالت دیکھ کر۔ جلال خان کو نہ جانے کیا سوجھی کہ فوجی بن بیٹھا۔ مجھے تو بڑی نفرت ہے فوجیوں سے۔ اپنی اوقات کو بھول کر انگریز بن بیٹھتے ہیں۔ اور بیویوں کی کوئی زندگی ہے۔ قید خانے میں بھوکی ننگی نجانے خوش کیسے ہیں۔ دراصل پیچھا بھاری نہیں ہے۔ ورنہ یہ دو ٹکے کی نوکری اور انگریز کی غلامی کیونکر کرتے؟" وہ دُکھی لہجے میں بولی۔

"بھابی! آپ ٹھیک فرما رہی ہیں۔" خواتین اُس کی بے وقوفانہ باتوں پر مزید اُلّو بنانے پر تُلی ہوئی تھیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"مجھے اب سمجھ آئی ہے کہ جلال خان نے میری زندگی کیوں حرام کر رکھی ہے۔ اُسے آپ جیسی بیوی چاہیئے تھی۔ سرکار کی غلامی نے اُسے بے غیرت بنا دیا ہے۔ میں سات پردوں میں رہنے والی عورت کی اُس کے پاس کوئی قدر و قیمت نہیں۔ وہ آپ سب کی تعریفیں کرتا تھکتا نہیں۔ مجھے بھی آپ جیسا بنانا چاہتا ہے۔" وہ دل کا دُکھڑا رونے لگی۔

"میرے لئے استانی لگائی ہے۔ کیا یہ میری بے عزتی نہیں؟ آپ بتائیں، مجھ میں کس چیز کی کمی ہے؟ آپ سب پر بھاری ہوں۔ پر اُسے کون سمجھائے۔"

"بھابی! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ہمارے بارے میں۔ ہم بھی بہت اونچے خاندانوں سے ہیں۔ تعلیم ہماری باندی ہے۔ آپ نے تو ہمیں بالکل ہیچ اور گیا گزرا سمجھ لیا ہے۔" ایک نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ "جلال بھائی کے ساتھ چلنے کے لئے آپ کو علم حاصل کرنا پڑے گا۔ وہ جو کہتے ہیں بھابی! آپ کو ماننا پڑے گا۔ ہمیں تو آپ پر ترس آرہا ہے۔ ہماری عورتوں پر کس قدر ظلم اور زیادتی ہو رہی ہے۔ انہیں اپنے حقوق سے ناآشنا رکھنا اُن کی ذات سے سراسر ناانصافی ہے۔ یہ بے عزتی ہے۔ نہ کہ اُستانی سے پڑھنا بے عزتی ہے۔ آپ اپنی سوچ کو مثبت بنائیں گی تو کچھ سیکھ پائیں گی۔"

"جلال خان کے منہ میں تمہاری زبان ہے۔ اب سمجھ آئی کہ فساد کی جڑ کہاں سے شروع ہوئی ہے۔ انگریز کی جوتیاں سیدھی کرتے تم لوگ اپنا مذہب، اپنا قبیلہ، اپنی تہذیب ہی بھول گئے ہو۔ ویسے میرا دل نہیں مانتا کہ آپ جیسے لوگوں کا تعلق باعزت اور غیرت مند خاندانوں سے ہوسکتا ہے۔ ہر بات اور ہر حرکت میں آپ لوگوں کی تنگ دستی اور کم مائیگی جھلک رہی ہے۔" اس کا لہجہ حقارت کی غمازی کر رہا تھا۔

"ویسے بھابی! آپ کا شوہر بھی ہماری فہرست میں آتا ہے۔" ایک نے زہرخند سے کہا۔

"اُس کا خاندان پھر بھی نظر آرہا ہے۔ عورت اپنے خاندان کے رسم و رواج اور تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ مجھے اور خود کو پرکھ کر تو دیکھیں۔ میری ہر ادا سے میرے خاندان کی خوشبو پھوٹتی ہے۔ اور آپ سب کیا ہیں؟" اس کا لہجہ نفرت آمیز تھا۔

خواتین نے مزید اُسے منہ لگانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اُس کی جہالت پر ماتم کرتی رہ گئیں۔ کلثوم غصے سے ٹِک ٹِک کرتی بچوں کے پاس جا چکی تھی۔ سب ایک دوسرے کا



منہ تکتی رہ گئیں۔

وہ اُسے بے وقوف بنانے کی کوشش میں تھیں۔ انہوں نے اُسے جاہل اور خود سے کمتر سمجھ کر اپنی گفتگو سے باہر کر دیا تھا۔ اُس نے اُنہیں مفلس اور حقیر سمجھ کر سیدھے منہ بات نہ کی تھی۔ وہ اُنہیں جوتی کی نوک پر مار کر جا چکی تھی۔ بغیر کسی لحاظ اور رکھ رکھاؤ کے۔

"ہائے، جلال بھائی کس قدر فرشتہ خصلت انسان ہیں۔" ایک نے بڑے دُکھ سے کہا۔

"اپنی نسل بدلنے کے لئے انہیں اپنے خاندان سے نکل جانا چاہیئے تھا۔ اس کو کہاں تک سدھائیں گے؟" دوسری نے آہستگی سے کہا۔

"دوسروں کے نجی معاملات میں دخل اندازی کرنا جرمِ عظیم ہے۔ ہم کھانا کھانے آئے ہیں۔ معاملہ یہاں سے آگے بڑھا تو ہم بھی اُسی جیسی جاہل عورتیں گردانی جائیں گی۔ اس لئے زبان کو دانتوں تلے دبا کر بیٹھو۔" تیسری نے نصیحتاً کہا تو سب ہنس پڑیں۔

کھانے کی میز پر سب موجود تھے۔ کلثوم کے بگڑے ہوئے مزاج پر اُس کی پردہ نشینی نے پردہ ڈال کر جلال خان کو شرمندگی اور ندامت سے محفوظ کر لیا۔ وہ پردے کی اوٹ سے اُن کا جائزہ لے رہی تھی۔

خواتین، جلال خان سے ہر موضوع پر گفتگو کر رہی تھیں۔ لطیفے زوروں پر تھے، قہقہوں کا باتوں کا شور برپا تھا۔ کلثوم کے سامنے آج جلال خان کا اصلی روپ آچکا تھا۔ اُسے جلال خان سے کراہت محسوس ہونے لگی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد وہ جلال خان پر ٹوٹ پڑی۔

"تمہیں ایسی بازاری، بے حیا اور عریاں بیوی چاہیئے تھی۔ اس لئے مجھ پر محنت کی جا رہی ہے۔ جلال خان! غور سے سن لو۔ میں ان جیسی فاحشہ اور چھنال بن کر تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ تمہیں یہ بدزبان اور بے شرم عورتیں پسند ہیں، جو غیر مردوں کے ہاتھ سے منہ میں نوالہ لیتی ہیں۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر باتیں کرتی ہیں۔ ان کے شوہر چڑو بنے ہوئے ہیں۔ غلاموں والی حیثیت ہے ان کی۔ ایسے بے غیرت مرد تو میں نے زندگی میں نہیں دیکھے۔ جلال خان! ایسی عورتوں سے اللہ بچائے۔ میری قدر کرو۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔ "یہ ہیں تمہارے دوست جن کے گُن گاتے ہو۔ تم پر بھی اُن کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com



رنگ چڑھ چکا ہے۔''

''یہ انکشاف تو بہت روح افزا ہے۔ یعنی میں بھی جورو کا غلام۔ خوش ہو جاؤ جاناں!'' وہ کھسیانی سی خوشامدی ہنسی سے بولا تو وہ چڑ کر بولی۔

''مجھے بے وقوف سمجھ کر مزید بے عزت مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ایک پل کے لئے بھی نہیں رہ سکتی۔ تمہیں میں پہلے دن سے ہی پسند نہ تھی۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ ایسی ہی فاحشہ بیوی لے آؤ۔''

''ایسا کچھ نہیں کلثوم! تمہیں برا لگا کہ وہ خواتین تم سے بالکل فرق ہیں۔ ٹھیک ہے۔ لیکن تم سے اعلیٰ ہرگز نہیں۔ مجھے تم جیسی بیوی چاہئے تھی۔ آئندہ ایسا کبھی سوچ میں بھی نہ لانا۔ کیا تم نہیں چاہتی کہ ہمارے بچے ہم دونوں کی شفقت اور پیار میں پل کر بڑے ہوں۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''نوکری چھوڑ دو جلال خان! میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے ڈر ہے، کل میرے بچے بھی انگریز کی غلامی قبول نہ کرلیں۔ یہ تو مستقبل میں اپنے گاؤں میں حکمران ہوں گے۔ لوگ ان کے غلام ہوں گے۔ تمہاری تو عقل ہی ماری گئی جو اس زندگی کا انتخاب کر کے پُرسکون ہو۔ یہ دو بالشت کا گھر، یہ دو ٹکے کی نوکری اور انگریزی وردی..... میں تھوکتی ہوں تم پر۔ میرے نصیب ہی پھوٹ گئے ہیں۔ لگتا ہے، مجھے کسی کی بددُعا لگ گئی ہے۔ کسی حاسد کی نظر کھا گئی ہے یا کسی نے کالا جادو کر دیا ہے۔ لگتا ہے تم پر بچپن میں ہی کسی بھوت پریت کا سایہ ہو گیا تھا۔ میرا یہاں دم گھٹ جائے گا جلال خان!'' وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

''سب تمہارا وہم ہے جان! ایسی فضول توہمات میں خود کو مت اُلجھاؤ دیکھو تمہاری رضامندی کے کتنے باثر نتائج نکلے ہیں۔ بچوں کی صحت دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ تم بھی کتنی حسین وجمیل ہو گئی ہو۔ تمہاری پڑھائی کا شروع ہو جانا بہت خوش آئند تبدیلی ہے۔ مجھے تو تم سے بہت اُمیدیں ہیں۔''

وہ اسے بچوں کی طرح سہلانے لگا۔ وہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''مجھے ابھی اور اسی وقت گاؤں جانا ہے۔ وہاں کی رونقیں، گہما گہمی کو میں نہیں بھول



سکتی۔ میرے رشتے دار، ماں باپ، سکھیاں، سہیلیاں سب ہی تو وہاں میری منتظر ہیں۔ یہاں کا مجھے کچھ بھی پسند نہیں۔ کن گھٹیا اور نیچ لوگوں میں مجھے لے آئے ہو۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ یہ پڑھنا لکھنا میرے بس کا روگ نہیں۔ تمہیں سمجھ کیوں نہیں آتی۔''

''چلو جان! یوں کرتے ہیں، تم فی الحال پڑھنا چھوڑ دو۔ یہاں کی عورتوں سے بھی ملنا بند کر دو۔ اور بھی جو کچھ تمہیں برا لگا ہے، سب کو خدا حافظ کہہ دو۔ ٹھیک ہے نا۔ لیکن مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ مجھے تمہاری اور بچوں کی عادت سی ہو گئی ہے۔ یہ کہتے ہوئے مجھے بالکل سبکی محسوس نہیں ہو رہی۔''

وہ بے حد رجائیت بھرے لہجے میں بولا تو وہ اور بپھر گئی۔ اور آخر اس گفت وشنید نے ایک بہت بڑے جھگڑے کا روپ دھار لیا۔ آخر جلال خان نے تنگ آ کر اسے تیار ہونے کی اجازت دے دی۔ جلال خان کے لاکھ سمجھانے کی کوشش بے سود ثابت ہوئی۔

کلثوم اپنی چھوٹی سی جنت اور متاعِ حیات کو چھوڑنے میں کس قدر شادماں تھی۔ اُسے کچھ علم نہ تھا کہ میاں بیوی چاہے کسی زمانے اور کسی معاشرے سے تعلق رکھتے ہوں، ذہنی ہم آہنگی اور مطابقت ومناسبت کو بڑھانے کے لئے باہمی رفاقت وقربت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ نشیب وفراز میں مل کر مقابلہ اور جدوجہد کرنے میں راحتیں اور مسرتیں ہیں۔

کلثوم کے لئے یہ سب بے معنی اور فضول تھا۔ جلال خان کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا۔ مردانگی اور خودداری عود کر آئی تھی۔ اُس نے ڈرائیور کے ساتھ کلثوم اور بچوں کو رخصت کر دیا اور خود میس کے ایک کمرے میں واپس چلا گیا۔

❖❖○❖❖

www.iqbalkalmati.blogspot.com



یہ 1947ء کا واقعہ ہے۔ جب پاکستان وجود میں آیا۔ دنیا کے نقشے میں ہمارا ملک اُبھر کر سب کے سامنے آگیا۔ اس کے پیچھے کیا کارفرما تھا؟ اس کی خاص وجوہات تھیں۔ یہ تماشا یا ڈرامہ تو نہ تھا۔ جب باہر کی گورنمنٹ، دوسرے ملک کی گورنمنٹ کو اپنے طور طریقے پر چلانا چاہتی ہو، ان کے رسم و رواج، ان کی زبان اور مذہبی عقائد میں دخل اندازی کرتے ہوئے اپنے فرسودہ اور مذہبی امور اور اپنی پالیسی لاگو کرنے کے منصوبے بناتی ہو، معاشی کمزوری اور اقتصادی بدحالی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے دین کو ختم کرنے پر تلی ہو، ان کی روایات و رسومات کی دھجیاں اُڑا کر کامیابی کے بگل بجا رہی ہو تو پھر وہاں ذلالت، آہ و بکا اور ظلم کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

ہندوستان میں مسلمان معاشی اور تعلیمی لحاظ سے ہندو سے کافی حد تک پیچھے تھے۔ ہندو، مسلمانوں کی اعلانیہ بے عزتی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے توہین آمیز روّیے سے ان کی دل آزاری کرتے تھے۔ ذات پات اور چھوت چھات میں مسلمانوں کو حقارت سے دیکھنا اور ان کے مذہب کا تمسخر اُڑانا ان کا خاص مشغلہ بن چکا تھا۔ اپنے مذہب کی خوبیاں اور برتری بیان کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے تھے۔ جھتوں کو بروئے کار لا کر تبلیغ پر پابندیاں لگانا، شرانگیزی کو ہوا دینا ہر روز کا وطیرہ بن چکا تھا۔ اُن کی مسجدوں اور عبادت گاہوں میں غلاظت پھینکی جاتی۔ درس و تدریس کا کھلم کھلا مذاق اُڑایا جاتا۔ اس ذلالت کو اپنی جہالت اور حد درجہ کسمپرسی کی وجہ سے برداشت کرنا اور صبر و ضبط کا مظاہرہ کرنا مسلمانوں کی مجبوری تھی۔ جس کے عوض ہندو انہیں مزید اذیتیں دینے میں پیش پیش رہتا تھا۔ یہ ظالمانہ برتاؤ اور بے انصافی کب تک چلتی؟ یہ نفرتیں کب تک پروان



چڑھتیں؟ ایک نہ ایک دن تو خون کی حدت میں جوش آنا ہی تھا۔ کہیں سے تو فرشتۂ رحمت نے وارد ہونا ہی تھا کسی نے تو مسیحائی کا رشتہ اُستوار کرنے کی آواز کو بلند کرنا تھا۔ وہ وقت بہت قریب تھا، جب مسلمانوں کی شنوائی اِک معجزہ بن کر اُبھرتی ہوئی نظر آئی۔

جب ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا دور دورہ تھا، ان کی عیاشیوں نے اپنے ہی مذہب کے پرخچے اُڑا دیئے تھے۔ وہ تمام حرام شدہ علتیں جو دوسرے مذاہب میں ممنوع نہ تھیں، اپنا لی گئیں۔ اورنگ زیب کے علاوہ تمام مغلیہ خاندان کے حکمران نہ مسلمان رہے، نہ ہندو بن سکے۔ ہندو کے شانہ بشانہ چلنے اور اپنے نام کو زندہ جاوید رکھنے کے لالچ میں ہندو عورتوں سے شادیاں کر کے ان کے رسم و رواج کو اپنا لیا۔ ان کی قربت کو پانے کے لئے ہولی اور دیوالی کھیلی گئی۔ نمسکار اور بندے ماترم میں شامل ہونا فوائد سے بھرپور لگا۔ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود رہے اچھوت کے اچھوت۔ قابلِ نفرت اور حقیر ٹھہرائے گئے۔ ان کی بے اتفاقی، نادانی اور کمزوری کو بھانپتے ہوئے انگریز نے فائدہ اُٹھانے کی کوشش شروع کر دی۔ اور آخر 1857ء میں یہ نفرت کھلم کھلا بغاوت کی شکل میں نمودار ہو گئی۔ گو کہ ہندوؤں نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا۔ جہاں بھی مسلمانوں کی بات ہوتی، مخالفت اُبھر کر سامنے آتی۔ لیکن غدر کے بعد انگریز کے جور و ستم اور انتقام کا نشانہ صرف مسلمان بنے۔ جنگ کے بعد اور خاص طور پر مسلمانوں کے قتل عام اور تعلیمی اداروں کے بند ہونے کے بعد مسلمان معاشرتی صفوں میں بہت پیچھے دھکیل دیئے گئے۔ ظاہر ہے ایسی فضا میں مسلمان اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ بدقسمتی سے وہ ان کی انگریزی تعلیم سے بھی بے پناہ نفرت کرنے لگے۔ انگریز کی اپنی شاطرانہ چالیں اور مکاریاں جاری تھیں۔ وہ اپنے ہتھکنڈے استعمال کر کے فسادات اور ظلم و ستم کو بڑھا رہے تھے۔ اس سونے کی چڑیا کو اپنے ہاتھ سے اُڑا دینا ان کے لئے آسان ہرگز نہ تھا جس کی وجہ سے وہ آخری سانس تک اپنی کامیابی کے لئے کوشاں رہنے کو تیار تھے۔ اُن کی دُور اندیشی اور مکر و فریب کی گرفت مسلمانوں پر دن بہ دن مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ وہ ہندوستان کو دیمک کی طرح چاٹتے کھوکھلا کرتے گئے۔ اور آخر کار ہندوستان پر حکمران کی صورت میں اُبھر آئے۔ ہندوستان کی دولت نے ان کی آنکھوں کو چندھیا دیا۔ اس ملک پر اپنے قدم جمانے کے لئے انہوں نے اپنی تہذیب اور زبان کو ہر

www.iqbalkalmati.blogspot.com



طرف پھیلانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ہندو فطرتاً بے حد شاطر اور وقت شناس مانا جاتا ہے۔ وہ انگریز کا ہم پیالہ وہم نوالہ بن کر اپنی ساکھ کو بچانے پر محنت کرنے لگا۔
مسلمان مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی طور پر انگریز کے سخت خلاف تھے۔ اُن کی زبان سے نفرت کی وجہ سے ان کی تعلیم نہ سیکھنے میں فخر محسوس کرتے ہوئے خود کو بے وقوف بناتے چلے گئے۔ جس کا نتیجہ بہت گھناؤنا اور خطرناک نکلا۔ مسلمان تعلیمی میدان میں پیچھے رہنے کی وجہ سے نہ سرکاری ملازمت کے قابل رہے، نہ ہی اپنی معیشت کو بہتر بنانے کی راہ سجھائی دی۔ جہالت اور کسمپرسی کے عالم میں گھرے زندگی کے دن پورے کرنے لگے۔ قدرت کو یہی منظور تھا کہ مسلمان زوال کے شکنجے میں پھنس کر ذلالت اور ظلم وستم کی سیاہی کو مقدر کا حصہ بنا کر جس اذیت سے گزر رہے تھے، قربانی اس سے ہزارہا درجے آسان اور پُرسکون تھی۔ آخر مسلمانوں کی غیرت اور انا نے ایک پرچم تلے جمع ہونے کا عہد کر لیا۔ اور آج ایفائے وعدہ کا وقت قریب آ چکا تھا۔ انگریز اور ہندو سے نجات حاصل کرنا اور آزادی کا نعرہ لگانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ نفرت کی آگ ہندوستان کے چپے چپے میں بھڑک اُٹھی تھی۔ ظلم وستم، قتل و غارت اور فسادات کو طول دینے میں سِکھ سرِفہرست تھے۔ اُن کی سفاکانہ حرکات نے ہر طرف قیامت برپا کر دی تھی۔ ہندو عاجزی وانکساری کا پیکر بنے رام رام کرتے، سِکھوں سے ہر طرح کے مظالم ڈھانے پر واہ واہ کر کے اُنہیں بے وقوف بنا رہے تھے۔ کیونکہ قتل و غارت میں آگے بڑھ کر حصہ لینا ان کے بس کا روگ ہرگز نہ تھی۔ سِکھ قوم کے جذباتی اور اکھڑ پن سے وہ خوب فائدہ اُٹھا رہے تھے جبکہ سِکھوں کو اُن کی چالاکی کا رتی بھر اندازہ نہ تھا۔ کیونکہ یہ اپنے ملک کی وفادار، کھری اور سچی قوم مانی جاتی تھی۔
انہی دنوں میجر جلال خان کا تبادلہ واہگہ چھاؤنی ہو گیا۔ وہ اپنے سپاہیوں کے ہمراہ یہاں اپنے فرائض نہایت دیانت داری اور محنت سے ادا کر رہا تھا۔ لوگ ہندوستان سے جوق در جوق اپنے نئے ملک میں ہجرت کر کے آ رہے تھے۔ ہر خاندان اس ہجرت سے بری طرح متاثر ہوا تھا۔ جوان مردوں کو بے دردی سے جامِ شہادت پلا دیا گیا تھا۔ جوان بچیوں کو اغوا کر کے بے حرمتی کی گئی اور اپنی عیاشیوں کے ٹھکانوں پر اُنہیں پہنچا دیا گیا تھا۔ کچھ کو اپنے گھروں میں ہی قید کر دیا گیا تھا۔ محلوں کے جوان لڑکے اور مرد، مسلمانوں



کے گھروں میں گھس کر لوٹ کھسوٹ کرتے اور ہر طرف تیل چھڑک کر آگ لگا رہے تھے۔ مفلس اور غریب طبقے کا رجحان دولت لوٹنے کی طرف تھا۔ وہ جو بہن بھائیوں کی طرح پل کر جوان ہوئے تھے، ایک دوسرے کی عزتوں اور حرمتوں کے محافظ تھے۔ جانی دشمن اور لٹیرے بن کر سامنے آ چکے تھے۔ گھروں کو نیست و نابود کرتے منہ بولی بہنوں اور ماؤں کے دوپٹوں کی دھجیاں اُڑاتے، خوشی کے نعرے لگاتے آگے بڑھ رہے تھے۔
ریل، ٹرک، تانگے اور ریڑھوں پر سوار ہو کر ہجرت ہو رہی تھی۔ پیادہ لوگوں کی تعداد اَن گنت تھی۔ اپنی بچی بچائی پونجی خچروں، گھوڑوں اور گدھوں پر لادے سب پاکستان کی حدود میں داخل ہونے کے لئے کوشاں تھے۔ اس افراتفری اور نفسانفسی کے عالم میں بچے ماؤں سے، بیویاں خاوندوں سے جدا ہو گئی تھیں۔ بزرگ اور اپاہج لوگ پاؤں کے نیچے تنکوں کی طرح روند دیئے گئے۔ عزت دار اور شریف زادیوں کے دوپٹے، چادریں اور برقعے گلیوں کے جھاڑن بن گئے تھے۔ اس کی بدولت مال ومنال، عزت وغیرت سے ہاتھ تو دھویا ہی تھا، مگر یہاں کی انتظامیہ کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ لاکھوں لوگوں کی ہجرت میں سینکڑوں فوجیوں کا ہونا ناکافی تھا۔ مقامی لوگوں میں بھی درندہ صفت لوگ موجود تھے جو لٹے لٹائے، پریشان حال لوگوں کے لئے مزید پریشانی کا سبب بنے ہوئے تھے۔ یہ کہنا کہ اُس وقت پاکستان بننے کے جذبے نے ہر ایک کو راست بازی، تعظیم و تکریم اور باہمی اتفاق سے ہمکنار کر دیا تھا، سراسر غلط بیانی ہو گی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اُس وقت کا ہر مسلمان فرشتہ خصائل سے لبریز تھا۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ یہاں بھی اُس وقت انسانی مزاج اور کردارِ عملی کا دور دورہ تھا۔ کیمپوں میں مقامی لوگ اپنی فراخ دستی اور فیاضی کی مثال بنے ہوئے تھے۔ وہاں ایسے چور اُچکے بھی موجود تھے جو رات کی تاریکی میں فصلِ شنیع اور قساوت پر تُلے ہوئے تھے۔ جہاں لوگ عجز وانکساری کا پیکر بنے ہمدردی کی آمیزش لئے سہارا بنے ہوئے تھے۔ وہاں آدمیت کا جامہ پہنے لٹیرے بھی گھات لگائے بیٹھے تھے۔ کھیتوں اور زمین پر اَن گنت خیمے نصب کر دیئے گئے تھے۔ لاکھوں لوگ کھلے آسمان تلے تپتی زمین پر براجمان تھے۔ کسی کو کھانا ملا، کسی کے نصیب میں پانی تھا۔ بھوکے پیاسے، غم سے نڈھال، مظلوموں کی آہ و بکا دل کو ہلا کر رکھ دیتی تھی۔ بڑھاپا اور بیماری لاعلاج ہونے کی وجہ سے بے شمار لوگ موت کی آغوش میں پناہ لے رہے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



بچے گرمی کی شدت، بھوک اور پیاس سے دم توڑ رہے تھے۔ ہجرت کرنے والی بچیاں جو سِکھ اور ہندو کے ہاتھ سے بچ کر آ گئی تھیں، اسی پاک سرزمین پر اُنہیں بے حرمت کیا جا رہا تھا۔ نہ ماؤں کی عزت محفوظ تھی، نہ بچیوں کی عصمت کی نگہداشت تھی۔ بزرگوں کی آنکھیں بے بسی اور لاچارگی سے جھک گئی تھیں۔ ننگے آسمان تلے بچوں کی پیدائش زوروں پر تھی۔ والدین کمسن بچیوں کے نکاح عمر رسیدہ مردوں سے کر کے اپنی مشکلات کو کم کرنے کی کوشش میں تھے۔ بیوہ عورتیں، بیمار اور بوڑھے، کمسن اور نوزائیدہ بچے اپنے پیارے ملک کو آباد کرنے پہنچ تو گئے تھے، مگر یہاں کی درندگی اور زیادتیوں نے اُنہیں حیران اور پریشان کر دیا تھا۔ حالات پولیس اور آرمی کے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ ہر ذی روح کسی معجزے کے انتظار میں جھولیاں پھیلائے دُعا گو تھا۔

''واہگہ ریلوے اسٹیشن پر واہگہ سے آنے والی ریل رُکی۔ فاطمہ جناح صاحبہ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو خوش آمدید کہنے پہنچ چکی تھیں۔ پھولوں کے ہار اور مٹھائی کے ٹوکروں کی بہتات تھی۔ ریل کے دروازے کھلنے پر اِک شور برپا ہو گیا۔ ٹرین میں لاشوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسری ریل آ رُکی۔ تمام مسافر راستے میں زہریلا پانی پینے کی وجہ سے شہادت پا چکے تھے۔ صرف ایک خاندان بچ گیا تھا، جنہوں نے رستے بھر نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ یہ خاندان تھا فیروز خان کا۔ جو گورداس پور سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ اس خاندان کا واحد جوان مرد فیروز خان تھا۔ باقی چھ بھائیوں کی بیوہ خواتین، بے شمار بچے، ماں اور اپنی بیوی بچے شامل تھے۔ سب کے زیورات اس نے کمر پر باندھے ہوئے تھے۔ یہی ان کی بچی ہوئی پونجی تھی۔ تمام عورتیں اور لڑکیاں چادروں اور برقعوں میں خود کو محفوظ سمجھ رہی تھیں۔ بھوک اور پیاس نے نقاہت اور تڑپ کا روپ دھار لیا تھا۔ چند گھنٹوں پہلے پیدا ہونے والے بچے اور ماں کو سائے کے نیچے لٹا کر ماں پنکھا جھول رہی تھی۔ فوج، پولیس اور مقامی غم گسار اُن کی مدد کو پہنچ چکے تھے۔ تسلی و تشفی دینے والوں کی کمی نہ تھی۔ مگر کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ تھی۔ جوان بچیوں کا تحفظ کس قدر اہم تھا، فیروز خان کو اس کا علم تھا۔ مگر خیمہ نہ ملنے کی وجہ سے اُنہیں رات پلیٹ فارم پر ہی گزارنا پڑی۔ سب مارے تھکان کے ننگی زمین پر ہی لیٹ گئے۔ اور فیروز خان اُن کی رکھوالی میں اِدھر اُدھر گشت کرنے لگا کہ یکدم خیموں کی سمت سے چیخنے چلّانے، دوڑنے بھاگنے کی



آوازیں آنے لگیں۔ ابھی وہ معاملہ سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ چند سیاہ پوش لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا اور فیروز خان اس سے پہلے کہ کچھ سمجھ کر سنبھلتا، اُس کی دو بیٹیوں کو اغوا کر لیا گیا...... یہ سب کیا تھا؟ وہ ہکا بکا دیکھتا رہ گیا۔ میں اپنی عزت سکھوں اور ہندوؤں سے بچا کر لایا تھا۔ اس سرزمین پر بھی ڈاکو موجود ہیں۔ وہ خود کلامی کر رہا تھا۔

بھاگتے دوڑتے ایک لڑکی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ تیزی سے مخالف سمت بھاگ کھڑی ہوئی۔ اندھیرے میں کوئی اس کا تعاقب نہ کر سکا۔ وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی ایک میل پر لگے ہوئے ایک خیمے میں گھس گئی۔ میجر جلال خان ابھی ابھی گشت سے واپس آ کر بیٹھا ہی تھا، ہڑبڑا کر کھڑا ہو کر ٹارچ کی روشنی میں خیمے کا جائزہ لینے لگا۔ خیمے کے درمیان لٹکی ہوئی لالٹین بھی بجھنے کو پَر تول رہی تھی۔ وہ اُس کے نیچے کھڑی ہانپ رہی تھی۔ میجر جلال نے غور سے دیکھا کہ ایک جوان لڑکی بغیر دوپٹے اور جوتوں کے اُس کے سامنے تھی۔ دُور سے ابھی بھی چیخ و پکار کی صدائیں رات کی خاموشی کو نگل رہی تھیں۔ ان میں تمیز کرنا کافی دُشوار تھا کہ یہ نوحے اور فریادیں اپنوں کے فراق میں ہیں کہ حملوں کا احتجاجی رونا ہے۔ وہ تذبذب کے عالم میں ہی تھا۔ بے اختیار سا ہو گیا۔

''تم کون ہو؟...... کہاں سے آئی ہو اس وقت؟...... اپنا خیمہ بھول گئی ہو کیا؟'' اُس نے فوراً کئی سوال کر دیئے اور بستر کی چادر اُٹھا کر اُس کے سر پر ڈال دی۔ وہ ابھی بھی خوف سے کانپ رہی تھی۔

اُس نے اردلی کو آواز دی اور اُسے پانی پلانے کو کہا۔ وہ ایک سانس میں پانی کا بھرا ہوا گلاس پی گئی۔

''بیٹھو!'' میجر جلال نے نرمی سے کہا۔ ''بیٹا! اب بتاؤ، مسئلہ کیا ہے؟ تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں سے آئی ہو؟''

''نام زہرہ بتول۔ بابا کا نام فیروز خان۔ گورداس پور سے آئے ہیں صبح والی ریل گاڑی سے...... خیمہ نہیں ملا۔ پلیٹ فارم پر ہی سو رہے تھے...... ڈاکوؤں نے ہم دو بہنوں کو اُٹھا لیا۔'' خوف سے اُس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ پھوٹ رہے تھے۔

''زہرہ بتول! فکر نہ کرو۔ تمہیں صبح تمہارے خاندان میں پہنچا دوں گا۔ یہاں آرام کرو۔ کھانا کھاؤ۔'' اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"یہ حملہ کرنے والے کون لوگ ہیں؟ کیا اس سرزمین پر سکھ اور ہندو ابھی تک موجود ہیں؟ ہم تو سمجھے تھے ان کو ہم وہیں چھوڑ آئے ہیں۔ یہاں تو شانتی ہوگی، پاکیزگی اور سچائی ہوگی اس سرزمین پر۔ ہم سب کی جان و مال، عزت و حرمت محفوظ ہوگی۔ لیکن یہاں بھی وہی ظلم و ستم، آہ و بکا کا عالم ہے۔ نجانے میری ثریا آپا کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ میرے بابا جان اور بی بی جان کس حال میں ہوں گے۔" وہ اس کی نرمی دیکھ کر ہمت میں آ گئی تھی۔

"پاک فوج اور پولیس ایسے ڈاکوؤں کو ڈھونڈ نکالے گی۔ تم فکر نہ کرو۔ ابھی تو میں پھر گشت پر جانے والا ہوں۔ یہاں اردلی تمہاری حفاظت کے لئے ڈیوٹی پر کھڑا ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" اس نے اسے حوصلہ دیا۔

"آپ مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ ہوسکتا ہے وہ ڈاکو میرا پیچھا کرتے یہاں تک پہنچ جائیں۔" وہ خوف زدہ ہوگئی۔

"اُن کا یہاں تک پہنچنا ناممکن ہے۔ تم فوج کے تحفظ میں ہو۔ میرے ہوتے ہوئے یہ بھیانک حادثات ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے مقصد میں ناکام ہو گیا ہوں۔ مجھے کھوج لگانی ہے، تفتیش کرنی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں جو پاکستان کی پاکیزگی کو داغ دار کر رہے ہیں۔" وہ بے حد سنجیدہ ہو گیا اور بوٹ کے تسمے باندھنے لگا۔

"میری سہیلیاں اور رشتے دار لڑکیاں اغوا ہونے کے بعد نہیں ملیں۔ جو ملیں وہ زندہ نہ تھیں۔ ہم نے یہاں پہنچ کر ابھی سکھ کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ حملہ ہوگیا۔ کیا یہ ملک بھی درندوں اور ڈاکوؤں کی آماجگاہ ہے؟ ہم نے وہاں اپنے تمام مردوں کو شہید ہوتے دیکھا۔ اُن کے جسم کے بکھرے ہوئے حصوں کو کس بے بسی اور بے چارگی سے دیکھا۔ کس لئے ہم نے اپنے پیاروں کے خون سے ہولی کھیلی؟ اس ملک کے لئے، جو ہمیں تحفظ نہ دے سکا۔ کاش! ہمیں پہلے اس کی خبر ہوتی۔ ہم پاکستانی کہلوانے کے نشے میں سرشار، حقیقت اور سچائی کو فراموش کر بیٹھے۔" اُس کی زبان اور آنکھوں میں پچھتاوے کے سیاہ بادل لہرا رہے تھے اور وہ اپنی عمر سے کتنی بڑی لگنے لگی تھی۔

جلال خان نے رحم سے اُس کی طرف دیکھا اور بے حد لگاوٹ سے بولا۔

"بیٹا! تم آرام کرو۔ یہاں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔ یہ ملک پناہ گاہ ہے ہمارے



پیاروں کی۔"

اُس نے اردلی کو اسے کھانا کھلانے کی تلقین کی اور باہر نکل گیا۔ گھوڑے ہنہنانے کی آواز آ رہی تھی۔ گھوڑا گھڑسواری کے لئے تیار کھڑا تھا۔ آہستہ آہستہ ٹاپوں کی آواز دُور ہوتی چلی گئی۔ اور یہ سہم کر کھڑی ہوگئی۔ اردلی کھانا اور پانی رکھ کر باہر کھڑا ہو کر اُس کا پہرہ دینے لگا۔

اُس نے دو نوالے زہر مار کئے اور چارپائی پر لیٹ گئی۔ دن بھر کی تھکن کے باوجود نیند کوسوں دُور تھی۔ اُسے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ ذہن میں لامتناہی سوچوں کا ڈیرا تھا۔ کان کسی نئے راکشس کے حملے کی آواز پر کھڑے تھے۔ وہ سر سے پاؤں تک سوالیہ نشان بن چکی تھی۔ مگر جواب ندارد۔

فجر کی اذان کے بعد میجر جلال خان واپس پہنچ گیا۔ طلوعِ سحر کی ملگجی روشنی میں اُس نے چند سپاہیوں کی موجودگی میں زہرا کو ہمراہ لیا اور پلیٹ فارم کی طرف چل پڑا۔ زہرا نے دور سے ہی اپنے خاندان کو پہچان لیا۔ وہ بھاگتی ہوئی ان میں پہنچ گئی۔ فیروز خان نے جلال خان کا شکریہ ادا کیا اور ثریا کے لاپتہ ہونے کی بے بسی پر وہ اُس کے سامنے مٹی کا ڈھیر ہوگیا۔ میجر جلال نے اُسے تسلی دیتے ہوئے اُس کے خاندان کا حدود اربعہ معلوم کرلیا اور پٹھان بھائی ہونے کے ناتے تھوڑی دیر میں اس سے گھل مل گیا۔

ہوس کے شکار میں مچان لگا کر بیٹھنے والے کون لوگ ہیں؟ ہر طرف کڑی نگرانی ہے، پھر یہ معمہ کیا ہے؟...... بچیوں کو اغوا کرلیا جاتا یا صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے کیمپوں کے احاطے میں چھوڑ دیا جاتا۔ لٹی لٹائی یہ بچیاں سکتے کے عالم میں اپنوں کے پاس پہنچ تو جاتیں مگر کئی ذہنی توازن کھو بیٹھتیں، کئی مارے ندامت کے دوسروں کا سامنا ہی نہ کرتیں۔ ہر رات ایسی مظلوم لڑکیوں کی آہوں سے آسمان ڈھل جاتا۔ نہ جانے اس گھناؤنے کردار کے پیروکار کون تھے؟ معاملہ سمجھ سے بالاتر تھا۔

❖❖○❖❖

"اماں گل! مجھے سمجھانے کی ناکام کوشش مت کریں۔ جو درد مجھے ہے، وہ کسی اور کو نہیں ہوسکتا۔ میری کوکھ کی آگ نے مجھے راکھ کر دیا ہے۔ میرے سینے میں ہوک پھوٹتی ہے اماں گل! اس میں صرف ایک ہی نام اُبھرتا ہے۔ مجھے میری ثریا چاہئے۔ ہفتہ گزر گیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہے۔ وہ ایسے غائب ہوئی ہے جیسے کبھی اس دنیا میں آئی ہی نہ تھی۔ یہ جھوٹی تسلیاں سب اپنے پاس رکھیں۔ میرے جسم کا حصہ کٹ گیا، مجھے چین کیسے آئے؟ بتائیں آپ، مجھے جواب دیں۔ یہ آس پاس کی عورتیں کم بخت تسلی دینے کم، زیادہ تر تماشا دیکھ کر اپنے دل کو ٹھنڈا کرنے آتی ہیں۔'' وہ غم و غصے سے بولے جا رہی تھی۔ حالانکہ صفیہ ایسے تلخ مزاج کی ہرگز نہ تھی۔

''صفیہ! یہاں ہر تیسری عورت ایسے ہی دُکھوں کی شکار ہے۔ سب تمہارے پاس ہمدردی دینے اور لینے آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی آزمائش کا مقابلہ ہمت وحوصلے سے کرنا سیکھو۔ مجھے دیکھو، کیا میں اپنے چھ جوان بیٹے، اکلوتی بیٹی اور اُس کی اولاد، اپنی زندگی کا ساتھی قربان کر کے بہت خوش ہوں؟ یہ میرا دل دُکھوں اور غموں کی آماجگاہ ہے صفیہ! ہماری ہمت فیروز خان کے حوصلوں کو بلند رکھے گی۔'' وہ اُسے سمجھاتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔ میں تمہیں بہت صابر و شاکر نظر آتی ہوں نا۔ یہ مکر و فریب کرنا بھی بڑا ہی مشکل کام ہے۔ اُس نے صفیہ کو گلے لگا لیا اور چار قُل پڑھ کر اُس پر دم کرنے لگی۔

فیروز خان اپنے پیاروں کی شہادتوں کے غم کو دل میں دبائے اس نئی ناگہانی آفت کا مقابلہ کر رہا تھا۔ تمام دن خیموں کے آس پاس مارا مارا پھرتا رہتا۔ ہر خیمے میں جھانکتے ہوئے گزرتا کہ شاید کہیں ثریا نظر آ جائے۔ ہو سکتا ہے وہ ہمیں ڈھونڈنے میں ناکام کہیں منہ بسورے بیٹھی ہو۔ ہر شام ناکامی اور مایوسی کی تصویر بنا خیمے میں پہنچ جاتا۔ یہ سوچ کر وہ بے بس ہو جاتا کہ بھیڑیوں کے غول سے نکل کر خونخوار درندوں کے چنگل میں کیونکر پھنس گئے ہیں۔ کیا اب بھی واپس گھر جا سکتے ہیں؟ وہاں تو ہمارا اپنا کوئی بھی نہیں رہا۔ وہ گھر جو میرا تھا، وہاں کسی ہندو، سکھ کا قبضہ ہو گا۔ صدیوں کی محنتوں سے بنا ہوا خاندان پل بھر میں ملیامیٹ ہو گیا۔ وہ گھنٹوں سر پکڑ کر بیٹھا سوچتا رہتا۔ وہ کس قدر بیمار اور لاغر لگنے لگا تھا۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ ماتھا شکنوں سے بھر گیا تھا۔ جسم ڈھانچے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ کندھے بار سے جھک گئے تھے۔ وہ کپڑوں کے گٹھر سے ٹیک لگائے رات کھلی آنکھوں میں گزار دیتا۔ بیٹے چاروں بیٹوں سے چھوٹے تھے۔ مگر ایک رات نے ہی انہیں جوان مرد بنا دیا تھا۔ ان کا لاابالی پن اور بچپنا اُن سے رُوٹھ گیا تھا۔ وہ خاندان کے



پہرے دار بنے اپنے ملک سے کیے ہوئے قول و قرار پر ثابت قدم تھے۔ بھلے وقت کے انتظار میں ہر دن گزر جاتا اور اُمید سحر میں شب بیت جاتی۔

میجر جلال خان گہرے دُکھ و تاسف کی کیفیت میں فیروز خان کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ دونوں مل کر درندوں کی فوج میں سرگراں رہتے۔ سورج اُمید و بیم کی روشنی لئے طلوع ہوتا اور حسرت و یاس کا لبادہ اوڑھے ڈوب جاتا۔ فوج نے حالات پر کافی حد تک قابو پا لیا تھا۔ یہاں کی لاقانونیت سے پیدا ہونے والے مسائل میں کمی ہو رہی تھی۔ مگر ابھی تک بڑے مانے ہوئے پختہ مغز لوگ بھی یہ معمہ حل نہ کر سکے کہ اس پاک سرزمین پر یہ فحش، شرم ناک اور قبیح حرکات کرنے والے کون لوگ تھے؟ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کہ اغوا شدہ بچیوں کو زمین کھا گئی ہے یا آسمان نگل گیا ہے جو نہ زندہ ملیں، نہ مُردہ پائی گئیں۔

میجر بختیار اپنے سپاہیوں کے ہمراہ ہندوستان پہنچ کر اپنی نگرانی میں مسلمانوں کے قافلے کو لے کر پاکستان پہنچ گیا۔ تمام لوگ بخیر و عافیت پہنچ کر اس سرزمین پر سربسجود ہو گئے۔ آج جلال خان کا دسواں قافلہ اُس کی نگرانی میں صحیح سلامت منزلِ مقصود تک پہنچا تھا۔ فوجی افسران اپنی جان ہتھیلی پر رکھے بار بار خدمتِ خلق اور جذبۂ انسانیت کے میدان میں کُود رہے تھے اور ہمیشہ سرخرو ہو کر واپس پلٹتے۔

اس دفعہ جلال خان پھر ہندوستان جا کر ایک قافلے کا رہبر بن رہا تھا مگر ساتھ مقصد کچھ اور بھی تھا۔ واہگہ بارڈر کے پار ہندوستانی فوج کے بے شمار خیمے نصب تھے۔ ان خیموں پر سنگین پہرہ لگانے کا کوئی جواز نہ تھا۔ میجر جلال خان کی تجزیہ کار نگاہوں اور سوچ نے نتائج تک پہنچنے میں دیر نہ لگائی۔ اُسے یقین تھا کہ ان خیموں میں ہماری بچیاں قید کر رکھی ہیں۔ صبح کی ملگجی روشنی میں میجر جلال خان نے سرحد کراس کرتے ہی اُن خیموں پر حملہ بول دیا۔ ہندو اور سکھ فوجی ابھی تک نشے میں دُھت اوندھے پڑے تھے۔ خیموں کے باہر سپاہی چوکیداری کا فریضہ ادا کرتے ہوئے خیموں سے ٹیک لگائے اونگھ رہے تھے۔ میجر جلال خان نے نہایت پھرتی اور چالاکی سے درجنوں لڑکیوں کو ان درندوں کے قبضے سے چھڑا کر واہگہ بارڈر پار کروا کر تمام بچیوں کو میجر بختیار کے حوالے کیا اور خود اگلی مہم کے لئے چل نکلا۔ یہ آپریشن اتنا آناً فاناً ہوا تھا کہ کسی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل پایا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



میجر بختیار نے نیم برہنہ بچیوں کو فوری طور پر اپنے خیموں میں پناہ دے کر ان کے کپڑوں کا انتظام کیا اور سب کے ناموں کی فہرست تیار کر لی۔ مگر ثریا کا نام سننے میں نہ آیا۔ میجر جلال خان خاصا پریشان نظر آنے لگا۔ وہ فیروز خان کو مزید کیا تسلی دیتا؟ وہ مارے ندامت کے اپنی ناکامی کو اُس کے سامنے تسلیم کر رہا تھا کہ چند سپاہیوں نے اسے تنہائی میں بلا کر سرگوشی میں کوئی معاملہ سمجھانے کی کوشش کی تو وہ فوراً اسلحہ اُٹھا کر خیمے سے باہر نکل گیا۔

''کوئی تسلی بخش خبر ہے کیا؟'' فیروز خان کا لہجہ پُر اُمید تھا۔

''جی لالہ! اطلاع ملی ہے کہ ساتھ والے گاؤں کی حویلی میں سینکڑوں بچیاں قید ہیں۔ مقامی لوگوں نے بتایا ہے کہ اس حویلی کے مکین اوائل دنوں میں ہی ہندوستان چلے گئے تھے۔ اور اس حویلی پر گاؤں کے چودھری نے قبضہ کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے بے شمار غنڈے اور بدمعاش پال رکھے ہیں۔ جو ہجرت کرنے والے معزز خاندانوں کی بچیوں کو اُٹھا کر اس حویلی میں لے آتے ہیں۔ پچھلی رات دو لڑکیوں کی بھاگنے کی کوشش پر انہیں گولی کا نشانہ بنا کر لاشوں کو کھیتوں میں پھینک دیا گیا۔

جلال خان نے فیروز خان کو تمام رُوداد سنا دی اور وہ وہیں بیٹھ گیا۔ مارے ضبط کے آنکھیں لال ہو گئی تھیں اور اُس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ وہ ثریا کے زندہ ملنے کی دعائیں کرنے لگا۔

رات کے دو بجے جلال خان بیسیوں بچیوں کے قافلے کو لے کر پہنچ گیا۔ فیروز خان نے اپنے خون کو لالٹین کی روشنی میں ہی پہچان لیا۔ وہ باپ کے بازوؤں کا سہارا لے کر بھاری قدموں سے چل رہی تھی۔ جسم درد سے کراہ رہا تھا۔ وہ جو سج دھج کی شوقین تھی، جس کی پوشاک شاندار اور وضع سے فیشن نمایاں ہوتا تھا، آج گُل در گُل ہو چکی تھی۔ بیتے ہوئے اُفتاں و خیزاں شب و روز کے تمام نقوش اُس کے چہرے اور جسم پر ثبت تھے۔ چہرے پر نئے شباب کا خمار اور شادابی دُھندلا چکی تھی۔ جگہ جگہ نیل اِک داستان سنا رہے تھے۔ خوف سے چہرہ فق اور پژمردہ ہو چکا تھا۔ ہونٹوں پر خشک پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ آنکھیں بسیار اشک باری سے سرخ ہو کر سوجن اور سوزش سے نیم وا تھیں۔ جیسے یہ دنیا کو مزید دیکھنے کی خواہش مند ہی نہ ہوں۔ وہ اس ظالم اور بے درد سماج کو ایک پل کو دیکھنے



کی روادار نہ تھی۔ خوب صورت ستواں ناک پر چمکتا ہوا لونگ نہ جانے کن کن زیادتیوں کی نذر ہو چکا تھا۔ لمبے کالے چمکتے ہوئے سیاہ بال کسی گھونسلے کا سماں پیش کر رہے تھے۔ تمام بچیاں اسی حال میں تار تار ہو چکی تھیں۔ کائنات لرز اُٹھی تھی، آسمان ڈھل گیا تھا۔ جب اپنے ہی قاتل نکل آئیں تو غیروں سے کیسا گلہ، کیا شکایت۔

ماں جو ذہنی اور جسمانی طور پر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی تھی، جس نے اس زندگی کی حقیقت کو نہایت تلخی سے تسلیم کر لیا تھا، اپنی بیٹی کو زندہ و سلامت پا کر اسے اپنے بانہوں کے حصار میں محفوظ کر لیا۔ اس کی ممتا اور بے لوث پیار حیات تھے۔ حد درجے کی ابدیت اور کبھی نہ ختم ہونے والی محبت اور احساسات سسکیاں لے رہے تھے۔ اُس کی لگاوٹ و شفقت، ذاتِ الٰہی کے ایک ہونے اور ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے وارد ہونے کی صداقت کے مانند نمایاں تھی۔ جس کے قریب نفرت و حقارت، ممتا کی لاتعلقی اور بے رخی گناہِ عظیم کی نشاندہی کرتی تھی۔ اُس نے اپنے لختِ جگر کو آزردگی اور کرب سے سینے سے بھینچ لیا۔ ثریا پتھر کی سِل بنی ہوئی تھی، جس پر ماں کا پیار اور تڑپ بھی بے اثر اور بے معنی تھی۔ آنکھیں بالکل بے حس اور ویران سب کو دیکھ رہی تھیں۔

''میری بچی! تم فرشتوں کے مانند معصوم اور پاکیزہ ہو۔ اس پاک سرزمین کو تم جیسی بیٹیوں پر ہمیشہ فخر ہوگا۔ تمہارا وجود قابلِ آفرین ہے۔ تمہارا ایثار قابلِ ستائش ہے۔ ماں تجھ پر واری جائے۔ میرا رواں رواں تجھ پر صدقے و قربان جائے۔ بھول جاؤ جو ہوا اور زندگی سے یہ ایک مہینہ نکال دو جو بیت گیا۔ ہمارے حکمران ہمیں انصاف دینے میں کہیں بھی کوتاہی نہیں کریں گے۔ ہماری اُمیدیں فقط خوش فہمیاں ہرگز نہیں۔ بالکل ایسے، جیسے پورب سے اُبھرنے والا اور پچھم میں اُترنے والا سورج اِک اٹل حقیقت ہے۔ جیسے چاند کا اپنے وقت پر نمودار ہونا سچائی ہے، بالکل ایسے...... بالکل ایسے ہمیں انصاف ملے گا۔''
وہ اسے محبت میں سرشار تسلی دے رہی تھی۔

''یہ آپ کا ملک مجھے میری کھوئی ہوئی عزت واپس دلا سکتا ہے تو میں آپ کی تمام باتوں پر یقین کر لیتی ہوں۔'' وہ مردنی آواز میں بولی۔

''کیوں نہیں؟'' صفیہ سوچ میں پڑ گئی۔

''ہزاروں لڑکیوں کی عصمتیں، لاکھوں جوانوں کے خون، ہمارا تمام مال و دولت،

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہمارا خاندانی نام و نمود، شان و شوکت...... کیا یہ سب ہمیں لوٹا دے گا آپ کا پیارا پاکستان؟'' وہ تڑپ کر بولی۔

بات تو سچ تھی۔ لاقانونیت کے عالم میں عزت و ناموس جو اپنے چوراہے پر نیلام تو ہوا ہی تھا۔ مگر اپنوں سے یہ اُمید تو کسی کو نہ تھی۔ اپنا ملک پانے کا جذبہ اتنا مقدس اور روح افزا تھا کہ ہر طرح کا ظلم و تشدد، شہادتیں اور قربانیاں، صبر و جبر ہیچ نظر آتا تھا۔ مگر اپنی سرزمین پر اپنوں کا ڈسنا ناقابلِ فراموش تھا۔

خیمے کے دائیں بازو مغلیہ خاندان کے کچھ بچے بچائے لواحقین خیمہ زن تھے۔ ان کی ایک بچی اغوا ہونے کے بعد سرحد پر مری پائی گئی تھی۔ دوسری بچی آج ثریا کے ساتھ ہی برآمد ہوئی تھی۔ ان کے خیمے میں اِک ہُو کا عالم تھا۔ والدین کو بچی پانے کی خوشی کم، ندامت اور کم مائیگی کا احساس بہت زیادہ تھا۔ دوسری صبح وہ بدنصیب بستر پر مری ہوئی پائی گئی۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں اور قیاس آرائیاں چل رہی تھیں۔ کسی نے کہا، باپ نے زہر دے دیا ہے۔ کسی نے گلا دبا کر مارنے کا خدشہ ظاہر کیا۔ اللہ بہتر جانتا تھا کہ حقیقت کیا تھی۔

مرزا صاحب بھانت بھانت کی چہ میگوئیوں سے بالکل بے پروا تھے۔ کسی کو خاطر میں لانا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ مغلیہ خاندان کا یہ باشندہ اپنی کسمپرسی کی کھلم کھلا غمازی تو کر رہا تھا، مگر مغلیہ خون سے گہرا تعلق رکھنے والا یہ فرد کبر و پندار کی ذلالت میں ابھی تک مقید تھا۔ اپنے نام کا زعم ابھی تک برقرار تھا۔ جبکہ ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ کن پر فخر تھا؟ جو اپنی عیاشیوں کی وجہ سے مسلمانوں کے نام پر اِک کلنک کا ٹیکہ تھے؟...... جن کو سینکڑوں سالوں کی حکمرانی بھی انصاف اور دیانت داری کی شُد بُد نہ سکھا سکی؟

فیروز خان کو اُس کے خیالات کی خبر تو تھی۔ اُسے تو پورا پورا یقین تھا کہ اس نے اپنی مظلوم بچی پر مزید ظلم ڈھا کر گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے۔ اماں گُل خوف زدہ سی ہو کر فیروز خان کو سمجھانے لگی۔ اپنے خون اور اپنی نسل کا قاتل، ظلم کے زمرے میں آتا ہے۔ ہمیں بے گناہ اور معصوم بچیوں کے دکھ و غم کا مداوا کرنا چاہئے۔ ان کے ساتھ جو ہوا ہے، ایسے ہولناک حادثات کا تصور سر سے لے کر پاؤں تک جھنجوڑ دینے کو کافی ہے۔ اگر ضمیر زندہ اور سلامت ہے تو تم ایسے جاہل اور ناعاقبت اندیش لوگوں میں مت بیٹھو۔ مجھے



تمہاری رحم دلی اور دُور اندیشی پر بہت فخر ہے۔ کیا تم میں غیرت مند اور غیور قوم کا خون سرایت نہیں کر رہا؟ میں سب سمجھ سکتی ہوں۔''

''ایسے لوگوں کی جاہلانہ پیشین گوئیاں اور دلائل میری سوچ کو نہیں بدل سکتے۔ آپ بے فکر رہیں اماں گُل! میں نے آپ کی آغوش میں آنکھ کھولی ہے۔ آپ کی گود میری درس گاہ رہی ہے۔'' وہ ماں کے خدشات کو سمجھتے ہوئے بولا۔

''بیٹا! یہ دنیا بھی کیا جگہ ہے اور اس کے باسی بھی کیسے کیسے ہیں۔ جن کی بچیوں کی اللہ نے حفاظت فرمائی ہے، وہ کیسے سینہ تان کر چلتے ہیں ہمارے سامنے۔ حالانکہ ناشناس لوگ ہیں۔ ایک دوسرے سے کیا لینا دینا۔ مگر یہ انسانی فطرت سب کو بے بس کئے ہوئے ہیں۔ عورتیں ہمدردی کے دو بول میں بھی ایسے نشتر چلا جاتی ہیں کہ سینہ چھلنی ہو جاتا ہے۔'' وہ آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی ''بیٹا! سنا ہے، لوگوں کو گھر ملنے لگ گئے ہیں۔ کیا ہم بھی اُمید رکھ سکتے ہیں یا ابھی دیر ہے؟''

''اماں گُل!'' وہ سوچ میں ڈوب کر بولا۔ ''لگتا ہے، یہ کھلا آسمان ہی میرا پاکستان اور گھر ہے۔ کھلا، کشادہ اور ہوا دار۔'' وہ زبردستی مسکرا دیا۔ لہجے میں سخت ناگواری در آئی تھی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مگر سر چھپانے کے لئے چھت اور تند و تیز طوفانوں کو روکنے کے لئے دیواریں تو چاہئیں نا۔'' اماں گُل نے اُس کی ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے بات کو ٹالنا چاہا۔

''اماں گُل! مہاجروں کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ نہ ہی اُن کا کسی سے رشتہ ہوتا ہے۔ نہ ہی اُن کے نصیب میں اعلیٰ عہدہ اور رُتبہ لکھا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ غریب، بے گھر اور مفلس ہی رہتے ہیں۔ حسرت و یاس میں اپنی زندگی کے دن پورے کرتے ہوئے خالقِ حقیقی سے جا ملتے ہیں۔ اماں گُل! ہم بھی ہجرت کر کے ایسے ہی انجام تک پہنچنے والے ہیں۔ مجھے کسی قسم کی کوئی خوش فہمی نہیں رہی۔ میں تنہا کس کس سے زیادتیوں کا بدلہ لے کر خود کو مطمئن کر سکتا ہوں؟'' اُس کے لہجے میں افسردگی کے ساتھ نااُمیدی کی جھلک نمایاں تھی۔

''بیٹے! تم نے کم ہمتی کا ثبوت دیا تو سچ ہے کہ ہمارا خاندان بربادی اور تباہی کے منہ میں چلا جائے گا۔ میری تم سے جو توقعات وابستہ ہیں، وہ تو بہت پُر اُمید ہیں۔ کامیابیاں

www.iqbalkalmati.blogspot.com



اور کامرانیاں تمہاری منتظر ہیں۔ اس وقتی اور عارضی شکستہ حالی پر دل برداشتہ کیوں ہو گئے ہو؟ دیکھو ہمت اور حوصلہ بلند رکھو۔ ہم پر ہونے والی زیادتیوں اور مظالم کا بدلہ ہمارے ملک کا بچہ بچہ لے گا۔ تم تنہا نہیں ہو۔ تمہارا پاکستان تمہارے ساتھ ہے۔'' وہ اپنے زخموں سے رِستے خونِ دل پر خود ہی پھاہا رکھ کر بولی۔ ''نااُمید ہونے والے مسلمانوں کو اس ملک میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ پاکستان ہماری چھت ہے، ہمارا پردہ ہے۔ ہماری شرم و حیا ہے اور ہماری آن بان ہے۔''

''ہاں، آپ کی ہو گی۔'' وہ ابھی بھی سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''فیروز! میں نے ایسے کمزور اور کم ہمت بیٹے کو جنم تو نہیں دیا تھا'' وہ غصے سے بولی۔ ''خبردار جو تم نے باقی لوگوں کے سامنے ایسی فضول باتیں کیں۔ وہ سب تمہاری طرف نظریں لگائے بیٹھے ہیں۔ واپس آتے ہو تو سوالوں کی بوچھاڑ ہو جاتی ہے۔ وہ تم سے دل آزردہ باتیں سننے کو ہرگز تیار نہیں ہوتے، وہ اچھی خبر سننے کے انتظار میں دن گزار دیتے ہیں۔ تم اُن کی زندگی کی مشعل ہو۔ تم نے اُن کی راہوں کو ہموار اور پُر رونق بنانا ہے۔ سر اُٹھا کر، سینہ تان کر چلو۔ آج کے بعد میں تمہاری آنکھوں میں اُمید کی کرنیں پھوٹتی ہوئی دیکھوں۔ سیدھے ہو کر بیٹھو!'' ماں نے اُس کی جھکی ہوئی کمر پر ہلکی سی چپت رسید کی تو وہ فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس کے جسم کی تمام سستی اور نقاہت ماند پڑنے لگی۔

اُس نے اپنی چٹان جیسی ماں کے پاؤں پکڑ لئے۔

''اماں گل! آپ کی ہمت کا جواب نہیں۔ مجھ سے خفا ہو کر مجھے گناہگار کرنا ناانصافی ہے اماں گل! ہم سب بہت دُکھی ہو گئے ہیں۔'' وہ ماں کے گھٹنوں پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔ ماں بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی۔

''مجھے معاف کر دیں۔ آج کے بعد آپ کا بیٹا کم ہمت اور بزدل نہیں کہلائے گا۔ کیونکہ بہادر ماں کی اولاد پشتوں سے دلیر اور بلند حوصلے والی ہوتی ہے۔'' وہ ماں کے آنسو پونچھنے لگا۔

❖❖❖○❖❖❖



سردار کرن سنگھ، گورداس پور میں خان برادری کے پڑوسی اور پشت در پشت منہ بولے بہن بھائی بن کر زندگی گزار رہے تھے۔ مرنا جینا، اُٹھنا بیٹھنا سانجھا تھا۔ ان کے خاندانوں نے وقت کے مدوجزر اور حالات کے نشیب و فراز میں ایک دوسرے کے غمگسار بن کر بھائی بندی کی مثال قائم کر رکھی تھی۔ بچوں نے انہی گلی کوچوں میں گلی ڈنڈے کھیل کر بچپن کی دہلیز کو پار کیا تھا۔ اُن کی جوانی کی داستانیں یہاں سے شروع ہوئی تھیں۔ شادی کی رونقوں نے انہی دالانوں اور چوباروں کو چار چاند لگائے تھے۔ انہی محلوں میں رزق کی ریل پیل ہوا کرتی تھی۔ آج کرن سنگھ سب کو یہ شہر، یہ سجے سجائے گھر چھوڑنے پر مجبور کر رہا تھا۔

''سردار جی! ہم نام و نہاد والے لوگ ہیں۔ کسی کی جرأت ہے کہ ہمارے گھروں کی طرف کوئی آنکھ بھی اُٹھا کر دیکھ جائے۔'' وہ بے حد خود اعتمادی سے کہتے اور اس کی بات کو سرے سے ٹال جاتے۔ وہ اپنے گھر، اپنا شہر چھوڑنے کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ رہنے میں ان کو کوئی دُشواری نہ تھی۔ مگر حالات بدلتے پل نہ لگا تھا۔ کرن سنگھ اور باقی دوستوں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ گھر بطورِ امانت ہمارے پاس رہے گا۔ آپ اپنے خاندان کو لے کر پاکستان چلے جائیں۔ کیونکہ اس وقت سب نظریں بدل چکے ہیں۔

آخر خان صاحب نے فیصلہ کیا کہ فیروز خان، خاندان کی تمام خواتین کو بچوں کو لے کر کرن سنگھ کے تہہ خانے میں چھپ جائیں۔ اور خود اور چھ بیٹے اپنے گھروں میں ہی مقابلے کے لئے رُکیں گے۔ کیونکہ ہمارے خون کا بزدلی سے کوئی ناطہ نہیں جڑا ہوا۔ جب سکھوں کا جتھہ خون کے دریا بہاتا ہوا، شہروں اور قصبوں کو لوٹتا ہوا ان کی طرف چل پڑا تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com



بھی کرن سنگھ نے منت سماجت کر کے انہیں ہجرت کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ مگر اس کی ایک نہ سنی۔ آخر اس نے اپنی جان داؤ پر لگا کر فیروز خان کے ہمراہ تمام خواتین اور بچوں کو تہہ خانے میں چھپا دیا۔ جلد ہی اس خبر نے سب کو ہلا کر رکھ دیا کہ گھر کے دلیر وارث اور رکھوالے، بے دردی سے شہید کر دیئے گئے ہیں۔ جب اس وسیع و عریض گھر سے خواتین نہ ملیں تو سکھ غصے سے پھنکارتے ہوئے ان کی لاشوں پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے کان، ناک اور زبانیں کاٹ کر گلیوں میں گھسیٹنے لگے۔ لاشوں کی اس بے حرمتی پر کرن سنگھ چیخ اُٹھا۔ اُسی کے ایک سکھ بھائی نے اُس کے سر پر ضرب لگائی اور وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔

جب اس محلے سے سکھوں کا جتھہ روانہ ہو گیا تو سردار کرن سنگھ کے بیٹوں نے اس خاندان کو گورداس پور کے ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ دیا اور ریل کے روانہ ہونے تک ان کے سر پر سایہ بن کر چھائے رہے۔ کیا ان کا مذہب دوسرے سکھوں سے مختلف تھا؟ یا ہو سکتا ہے، انسانیت کا یہی مذہب ہو۔

پاکستان کی ہر سرحد پر جلال خان جیسے محنت کش جیالے پھیلے ہوئے تھے۔ جو ہر آنے والے کو عزت و احترام سے خیمے اور کھانا پینا فراہم کر رہے تھے۔ اگلا قدم ان کو چھت کے نیچے محفوظ کرنے کا تھا۔ جلال خان نے قریبی گاؤں میں فیروز کے نام ایک وسیع و عریض حویلی اور زرعی زمین دلوا دی۔ یہ حویلی یشونت سنگھ نے جاتے وقت جلال خان کے سپرد کی تھی کہ واپس آنے تک اس کی نگہداشت ہوتی رہے تو بہتر ہے۔ اگر حالات نے واپس آنے کی اجازت نہ دی تو یہ حویلی تحفتاً جلال خان کی ملکیت میں رہے گی۔

جلال خان کو علم تھا کہ جو یہاں سے چلا گیا، وہ کبھی بھی واپس پلٹ کر نہ آئے گا۔ جو ہندوستان سے یہاں ہجرت کر کے پہنچا ہے، وہ بھی لوٹ کر نہ جائے گا۔ یہ حویلی پاکستان کی خاطر قربانی دینے والوں کی امانت ہے۔ اس لئے جلال خان نے یہ حویلی فیروز خان کے نام لکھوا دی۔ اس وسیع و عریض حویلی کو دیکھ کر امارت اور جاہ و جلال کا گمان ہوتا تھا۔ لال اینٹ سے بنی ہوئی یہ حویلی سال خوردہ ہونے کے باوجود امیر و کبیر لوگوں کا اثاثہ اور شوقین مزاجی کی غمازی کر رہی تھی۔ محرابی دروازوں والے کھلے کمرے، کشادہ دالان اور طویل برآمدے۔ درمیان میں لال اینٹ سے پکا کیا ہوا کھلا صحن تھا۔ برآمدے کے



سامنے جعفریاں اور اس سے باہر ستونوں کے ساتھ چپکی ہوئی بیلیں اور کیاریوں میں گلاب اور موتیے کے پودے پانی نہ ملنے کی وجہ سے اُداس اور بیمار نظر آ رہے تھے۔ صحن اور برآمدے مٹی اور پتوں سے اٹے ہوئے، اپنے مالکوں کی یاد میں افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔ جب کمروں کے دروازے کھولے گئے تو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اس گھر کی سلیقہ شعار عورتوں نے جاتے جاتے بھی گھر کو سنوار کر چھوڑا تھا۔ پلنگوں اور دیوانوں پر ریشمی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ مخملیں گاؤ تکیے آگے پیچھے بے حد قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ ریشمی تکیوں کے غلافوں پر دھاگے کی کڑھائی سے نام اور پھول بُوٹے بنا کر رنگوں کی قوس و قزح بکھیر دی تھی۔ ایسا لگا جیسے یہ لوگ ابھی رخصت ہوئے ہوں اور اگلے لمحے واپس آنے کو ہوں۔ در و دیوار سے لوٹ آنے کی اُمید کی جھلک نمایاں تھی۔

ہائے...... کس دل سے یہ بنا بنایا گھر چھوڑا ہوگا۔ فیروز خان کی بیگم کو اپنے گزرے ہوئے کمزور اور بے بس لمحے یاد آ گئے۔ اُس نے اپنا سینہ پیٹ لیا۔

اس گھر کی مالکن کا کیا حال ہوا ہوگا؟...... وہ ہر کونے میں چھپ کر روئی ہوگی۔ اُس نے جاتے وقت اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہر چیز کو گلے لگا کر ''واہ گرو دی جے'' کہا ہوگا۔ بچوں کے ان ویران جھولوں اور پنگھوڑوں سے واپس آنے کا وعدہ کیا ہوگا...... اپنے بزرگوں کی تصویروں سے گھنٹوں فریادیں کی ہوں گی۔ اُن سے دعاؤں کی التجائیں کی ہوں گی۔ نجانے اس حویلی کے کتنے لوگ ہندوستان پہنچے ہوں گے، کتنے راستے کی دھول بن کر بے نشان ہو گئے ہوں گے...... وہ حویلی کا ایک ایک کمرہ دیکھتے، سوچے جا رہی تھی۔

کمروں میں چھوٹے چھوٹے جھروکے بنے ہوئے تھے، جن میں ابھی بھی تیل سے بھرے دیئے پڑے ہوئے تھے۔ زنان خانہ اور مردانہ خانہ کافی وسیع اور طویل کمرے تھے جن کے کونوں میں کوئلے کی انگیٹھیاں بنائی گئی تھیں۔ چھت کے دوسرے کونے میں قندیل لٹک کر اپنی موجودگی کا اقرار کر رہی تھی۔ دونوں کمروں کی چھتوں کے درمیان پانچ فٹ کا رنگا رنگ نقش و نگار اور شیشوں سے سجا خوب صورت پنکھا جھول رہا تھا، جس کی ڈور کو ملازم اپنے پاؤں کے انگوٹھے میں باندھ کر ہوا دیتے ہوں گے۔ سوتے جاگتے اس مشقت میں ایسے گمان ہوتا ہوگا، جیسے اسے ہر وقت پاؤں ہلانے کی بیماری لاحق ہوگئی ہو۔ کارنس پر سفید لٹھے کا کڑھائی کیا ہوا کارنس پوش بچھا ہوا تھا، جس پر بے شمار ہاتھ سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہوا لینے والے چوکور پنکھے جن کو ریشمی رنگ برنگے کپڑوں اور شیشوں سے سجایا گیا تھا۔ ایک برآمدے میں چارپائیاں دیوار کے ساتھ کھڑی کی ہوئی تھیں، جو غالباً رات کو صحن میں بچھا کر سونے کے کام آتی ہوں گی۔ برآمدے کے ایک کونے میں لکڑی کی بنی ہوئی گھڑونچی تھی، جس پر مٹی کے گھڑے اور گاگریں اُلٹی کی ہوئی تھیں۔ صحن کے بائیں جانب ایک دروازہ تھا۔ صفیہ نے اس کا تالا کھولا۔ باہر ایک اور صحن تھا، جس کے سامنے ایک کمرہ اور برآمدہ تھا۔ وہ فوراً سمجھ گئی کہ یہ احاطہ رسوئی کا ہے۔ ایک طرف تنور لگا ہوا تھا۔ ساتھ ہی اینٹوں کا بنا ہوا بہت بڑا چولہا تھا جس کے اوپر بڑا سا توا رکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی مٹی کے دو چولہے جن میں ابھی بھی بجھی ہوئی لکڑیاں اور راکھ پڑی ہوئی تھی۔

برآمدے کے ایک کونے میں چاٹی اور مدھانی، دوسری طرف گندم پیسنے والی ہاتھ کی چکی اور قریب ہی سل بٹہ اُلٹے پڑے ہوئے تھے۔ صحن کے ایک کونے میں ہاتھ سے پانی نکالنے والا نلکا لگا ہوا تھا۔ کپڑے دھونے والی پیتل کی بالٹیاں اور رسّی کی الگنی پر ابھی بھی بچوں کے چند کپڑے بے ترتیب پھیلے ہوئے تھے۔

برآمدے کو عبور کر کے صفیہ نے کمرے کا دروازہ کھولا، جو چھوٹے بڑے دیگچوں، پیتل کی گاگروں اور گڑوئیوں، مٹی کی ہانڈیوں، کنالیوں غرضیکہ استعمال کا ہر برتن کارنس پر سجا ہوا تھا۔ بڑے صحن میں رسوئی کے قریب نعمت خانہ تھا، جس میں سنی بانس کی سرکی والی طویل چٹائی بچھی تھی۔ اوپر دستر خوان بچھا تھا۔ کھانا کھانے کے تمام برتن کارنس پر سجا کر اوپر ململ کے رومال سے ڈھکے ہوئے تھے۔ تمام برتن پیتل، تانبے اور کانسی کے تھے۔ کچھ قلعی شدہ تھے، کچھ بغیر قلعی کے چمک رہے تھے۔

باہر بڑے گیٹ کے دائیں جانب ایک ریڑھا اور دو تانگے کھڑے تھے۔ گھوڑے اور بیل ندارد۔ گیٹ کے سامنے سے لمبا راستہ ایک چھپر تک جاتا تھا، جہاں ایک سفید رنگ کی پرانے ماڈل کی گاڑی ترپال سے ڈھکی ہوئی تھی۔ لگتا تھا، اس گاڑی کی رونمائی خاص خاص موقعوں پر کی جاتی ہو گی۔ اس کے پیچھے احاطے میں نوکروں کے کچے کمرے اور سایہ دار درخت لگے ہوئے تھے۔

مردانہ خانہ گھر سے جڑا ہوا تھا مگر بالکل الگ تھلگ، بڑے گیٹ کے قریب۔ اس کے آگے پیچھے برآمدے اور باہر بیٹھنے کو چبوترا بنا ہوا تھا۔ مردان خانہ کشمیری قالینوں پر



چھوٹی بڑی رُوئی کی گدیوں اور گاؤ تکیوں سے کافی آرام دہ بنا دیا تھا۔ حقے اور چلمیں ان کے رواج کی گواہی دے رہے تھے۔ بانس کی ٹوکری میں مونگ پھلی اور پیتل کے تھال میں گڑ بھی ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے چاروں طرف رنگین پاوے والی چارپائیاں اور پلنگ بچھے ہوئے تھے، جن پر صاف ستھری رنگ برنگی چادریں اور سرہانے رکھے گئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا، عشاء کی نماز کے بعد بڑے بوڑھے، مردان خانوں میں بیٹھ کر حالاتِ حاضرہ پر گفتگو کرتے، اخبار کے کالموں پر اپنے اپنے تجربات کے مطابق روشنی ڈال کر دل کی بھڑاس نکالا کرتے تھے۔ سیاست کو زیر بحث لانا ان کا بہترین مشغلہ ہوتا تھا۔ کبھی نوکروں کے مسائل پر غور و فکر ہوتا۔ گاؤں اور گھریلو معاملات پر بھی نظرثانی کی جاتی اور مل کر حل تلاش کئے جاتے۔

پتنگ بازی اور کبوتر بازی کا رواج عام تھا۔ اس حویلی کی چھت پر بھی کبوتروں کے بے شمار ڈربے خالی پڑے ہوئے تھے۔ کبوتر بھی اپنا کھانا پینا ڈھونڈنے ہجرت کر چکے تھے۔ برآمدے میں طوطے کا خالی پنجرہ بھی ویران جھول رہا تھا۔

تمام خواتین نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ گھر کا جائزہ لیا۔ چھوٹے بچے خوشی کے مارے برآمدوں میں پکڑن پکڑائی کھیلنے لگے۔ لڑکیاں اپنے لئے کمروں کا انتخاب کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ ثریا کسی میں کوئی دلچسپی نہ لے رہی تھی۔ وہ سر جھکائے برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھی اپنی قسمت کو کوس رہی تھی۔ سب کی آنکھیں اپنے جلے نصیبوں پر اشکبار تھیں۔

گورداس پور میں یہ خاندان اپنے الگ الگ گھروں میں آباد تھا۔ سب کے چوبارے اور بنگلے ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ سکول، کالج، ہسپتال غرضیکہ تمام شہری سہولتیں میسر تھیں۔ لڑکیاں قریبی مدارس میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ لڑکے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے دُور دراز علاقوں میں جا چکے تھے۔ زندگی اُن کے حساب سے بہت شاہانہ اور آسودہ تھی۔ قریبی گاؤں میں اُن کی زرعی وراثت تھی۔ وسیع و عریض مشترکہ حویلی اور بے شمار زرعی زمین اور باغات کی بھرمار تھی۔ ابھی جائیداد کے حصے بخرے نہیں ہوئے تھے کیونکہ والد صاحب کی حیات میں بٹوارے کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ عموماً اس خاندان کی چھٹیاں گاؤں میں بڑے آزادانہ طریقے سے گزرتیں۔ بچے نہر میں چھلانگیں لگاتے،

www.iqbalkalmati.blogspot.com



تیرنے کے مقابلے ہوتے اور پہلے نمبر پر آنے والے کو انعام سے نوازا جاتا۔ بڑے حضرات دسہری، لنگڑا، منجری اور سیندوری آموں کے باغ میں گھس جاتے، اپنی اپنی پسند کے آم توڑ کر نہر کے کنارے بیٹھ کر چوسے جاتے۔ خواتین لذیذ کھانوں کو دسترخوانوں پر سجا کر سب کی خوب خاطر و مدارات کرتیں۔ نوکرانی چھپر کے نیچے چاٹی میں تازی تازی لسی بناتی۔ سب خوب لطف اندوز ہوتے اور حویلی واپس پہنچ کر لمبی تان کر سو جاتے۔ مگر بچے قابو میں نہ آتے۔ چھٹیاں گزار کر سب اپنے اپنے گھروں کو واپس آ جاتے چند دن سب بہت دل آزار رہتے۔ بچے ماؤں کی زندگی اجیرن کر دیتے۔ آخر کار زندگی اپنے معمول پر چل پڑتی۔

فیروز خان کو گاؤں میں حویلی اور زرعی زمین تو مل گئی تھی، مگر شہر میں کوئی ٹھکانہ نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کی تعلیم رُک چکی تھی۔ گاؤں کے دو کمروں کے سکول میں بکریوں کے ریوڑ موجود تھے۔ استاد جا چکے تھے۔ دوبارہ سے سکول شروع ہونے کی کوئی اُمید نظر نہیں آ رہی تھی۔ فی الحال لڑکے اور لڑکیوں کو ہاسٹل بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ ان کے اندر جو خوف و ہراس رچ بس گیا تھا، اس کے ختم ہونے میں کئی سالوں کی مسافت درکار تھی۔ تمام نئے لوگ، نئی جگہ، نئی دنیا اور نئی نئی باتیں غرضیکہ رہنا سہنا بھی نیا تھا۔

جلال خان ہر اتوار کی شام فیروز خان اور گاؤں کے افراد کے ساتھ مردان خانے میں گزارتا تھا۔ اُس کی موجودگی فیروز خان کے حوصلوں کو مستحکم اور ارادوں کو بلند رکھتی تھی۔ کیونکہ یہ ان کا محسن اور سچا ہمدرد جو تھا۔ آج فیروز خان جو بھی تھا، اس کی نوازشات اور لاتعداد احسانات کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اب تک نہ جانے وہ اپنا کیا کچھ کھو چکا ہوتا۔ اس احساس کی وجہ سے وہ جلال خان کے سامنے ہمیشہ آنکھ نیچی ہی رکھتا تھا۔

چند دن ہوئے، جلال خان نے حویلی کے دائیں بائیں اور سامنے والے گھروں میں تین خاندانوں کو آباد کیا تھا۔ سامنے والے گھر میں آباد ہونے والا راجپوت خاندان، جالندھر سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ اُن کی ایک بچی نے چند دن پہلے خودکشی کو قبول کر کے زندگی بھر کی شرمندگی اور ندامت سے چھٹکارا حاصل کرنے میں عافیت سمجھی تھی۔ جوان بچی کی ایسی روح فرسا موت پر گھر سے ہر وقت آہ و بکا اور بین کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔



ماں تو نیم پاگل ہو کر گھر سے فرار ہونے کی کوشش میں رہتی۔ باپ مارے غم اور سُبکی کے کسی کے سامنے جانے کی تاب نہ لاتا تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک کمرے میں بند، بچی کی باتیں کرتے، دل گیر بین کرنے لگ جاتے۔

دائیں طرف دلاور نام کا شخص اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آباد ہوا تھا۔ اُس کا جوان بیٹا شہید ہو گیا تھا۔ ایک بیٹی ابھی تک لاپتہ تھی۔ یہ مردان خانے میں بیٹھا ہر وقت حکومت کے خلاف شکوے شکایتیں کرتا رہتا تھا۔

بائیں طرف جہانگیر اپنے چار بچوں کے ساتھ اس گھر میں منتقل ہوا تھا۔ انہوں نے ہندوؤں کا ایک ایک برتن اور بستر گلی کی نکڑ پر پھینک دیا تھا۔ ان کی دو بچیوں کے ملنے کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ دو بیٹے بھی غائب تھے، جن کے ملنے کی آس میں ان کے گھر سے ہر وقت قرآنِ پاک کی تلاوت کی آواز سنائی دیتی رہتی تھی۔

بی بی فاطمہ کا معجزہ، مزاروں پر حاضری، صدقے خیرات، نوافل غرضیکہ ہر طرح کی منتیں مانگی جاتیں۔ جہانگیر ہمیشہ دلاور کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کے دلائل کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ دونوں بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں جو منہ میں آتا، اپنے خدشات کا اظہار کرتے۔ اپنے تاریک مستقبل پر نالاں ہوتے۔ پاکستان کے وجود میں آنے پر رنج و افسوس کا ورد پڑھتے نہ تھکتے تھے۔

جلال خان ان سب کو ان کے حقوق دلانے کا وعدہ کرتا۔ انہیں روشن پہلو دکھاتا۔ تسکین آمیز باتوں سے انہیں بہلاتا تو وہ وقتی طور پر مطمئن ہو جاتے۔ بے شک پاکستان بننے کا جذبہ صادق ضرور تھا، مگر یہ لوگ جس اذیت سے گزر رہے تھے، شک و شبہات، غم و فکر سے دوچار ہونا قدرتی امر تھا۔ جلال خان کو اس کی سمجھ تھی، اس لئے وہ ان کے سامنے انہی کا بن جاتا۔ اس کی نرم دلی، اخلاقیات اور خدمتِ خلق ہی اُس کا جہاد تھا۔

❖❖○❖❖

''آپا گُل! میں دیکھ رہی ہوں، ایک گھنٹہ ہونے کو آیا، آپ ان پھول پتوں میں کسے تلاش کر رہی ہیں؟'' زہرہ نے حیرت سے پوچھا۔

''کس کس کو تلاش کریں گے ہم؟ نہ پا کر آہیں بھرتے رہیں گے ہم۔'' اُس نے آہ بھری اور پھر باہر گھورنے لگی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"آپا گُل! دل کے ساتھی کھو گئے۔" وہ سسک اُٹھی۔ "ہم غیروں کے ہو گئے۔"

"یہ ڈرامہ بند ہو جانا چاہئے۔" ثریا جو پہلے ہی رنجیدہ بیٹھی تھی، تڑپ کر بولی تو سچ مچ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

فیروز خان کی سب سے بڑی اولاد خوش بخت، حساس اور کم گو واقع ہوئی تھی۔ اس کی نسبت بچپن سے ہی پھوپھی کے بیٹے رحیم خان سے ٹھہرائی گئی تھی۔ وہ خاندان لاپتہ تھا۔ خوش بخت دل ہی دل میں ہر گھڑی اُن کے انتظار میں رہتی تھی۔ ہمیشہ سے غور و فکر کرنا، ہر مسئلے کو کئی زاویوں سے دیکھنا اُس کا شیوہ تھا۔ بہن بھائیوں کی تعلیم نے اسے خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ جوان لڑکیوں کی تعلیم کا بند ہو جانا بالکل نا قابلِ قبول تھا۔ وہ اندر ہی اندر گھُٹتی رہتی۔ گاؤں کے تمام بچے سارا دن گلیوں میں خاک اُڑاتے پھرتے۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے۔ جب شام کو گھر پہنچتے تو مائیں بدلہ لینے کھڑی ہو جاتیں۔ ہر ماں کا بچہ راہِ راست پر ہوتا۔ ظاہر ہے، ایسا ہی ہونا تھا۔ وہ سوچتی کہ پاکستان کا مستقبل انہی بچوں سے وابستہ ہے۔ ان کی جہالت اور گنوار پن، پاکستان کو ترقی کے زینے کیسے طے کرنے دے گا؟ ہماری قربانیوں کا صلہ پاکستان کی خوشحالی میں پوشیدہ ہے۔ وہ دل گیر اور افسردہ ہو کر ایک ایک بچے کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگتی۔ اُسے خدشہ تھا کہ کہیں اُس کا خاندان بھی خالی الذہن اور بجھ کر اس وطنِ عزیز پر نا قابلِ برداشت بوجھ نہ بن جائے۔

اُس نے اپنا پلنگ عقب میں کھلنے والی کھڑکی کے ساتھ لگا لیا تھا۔ ثریا اور زہرہ بھی اسی کمرے میں براجمان ہو چکی تھیں۔ سب سے چھوٹی بہن جہاں آرا، ثریا کے پاس سوتی تھی۔ خوش بخت نے کمرے کا جائزہ لیا، جو اس کے گورداس پور والے گھر کے کمرے سے کافی مختلف تھا۔ وہ اپنے اُس گھر کے کمرے میں رکھے فرنیچر اور دیوار پر لگی ہوئی تصویروں اور سلیقے سے رکھی ہوئی ڈھیروں کتابوں کو دیکھنے کی عادی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ ہی مولسری کا درخت اپنے سفید پھولوں کی خوشبو سے ان کے کمرے کو معطر کر رہا تھا، جس پر ہر صبح کوئلیا اپنا راگ الاپتی بڑی اُداس لگتی تھی۔ اُسے بھی اپنے پرانے اور انجان لوگوں کو دیکھنے کی عادت تھی۔ بیل پر لٹکتے ہوئے پھولوں کے دھمکے کھڑکی کے اندر جھانک کر انہیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ چند ہاتھ پرے سنہرے مخملیں پتوں والے لوکاٹ اور



خوبانی کے درخت ہوا سے جھوم کر ان کو اپنے ہونے کا احساس دلانے میں کوشاں تھے۔ لیکن یہاں کی قید و بند کی صعوبتیں، یادوں پر حاوی ہو چکی تھیں۔ گورداس پور کے گھر کے چوبارے، محرابی دروازے، کھلے اور بڑے وسیع برآمدے، پورچ میں کھڑی دو دو موٹریں، اپنا سکول اور کالج۔ وہ متلاشی نظروں سے وہی نقشہ ڈھونڈتی کس قدر مایوس ہو جاتی تھی۔ گھر میں بیٹھے بٹھائے ہم رانیوں کے لئے کپڑے تھانوں کی صورت میں، جوتے ڈھیروں کے حساب پہنچ جاتے۔ اور ان میں سے اپنی پسند کو گھنٹوں لگا کر ڈھونڈنا کیسا بھلا لگتا تھا۔ ہر جوتا پہنا جاتا اور ہر رنگ کا کپڑا سر پر ڈال کر آئینہ دیکھا جاتا۔ وہ ماضی میں گم مسکرا دی۔

سلائی کڑھائی، گوٹے کناریاں عید سے کئی مہینے پہلے شروع کر دی جاتی تھیں۔ اب کی بار عید بھی کتنی سوگوار تھی۔ نہ دادا سے عیدی وصول ہوئی، نہ چچاؤں سے پیار دُلار ملا، نہ ہی پھوپھی جان کی طرف سے میری عیدی آئی، نہ محلے کی سکھیوں کا مذاق، نہ چھیڑ خانیاں، نہ شرارتیں۔ کیسی جان لیوا خاموشی تھی۔ وہ ایک دم سے اُداس ہو گئی تھی۔ زہرہ اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو پڑھتے جا رہی تھی۔

"آپا گُل! کہاں ہو؟" وہ بے چینی سے بولی۔ خوش بخت جواب دیئے بغیر باہر گھورنے لگی، جہاں نوکرانی گلابو سبزی توڑ رہی تھی۔ چمکتی دھوپ میں اُس کا کالا رنگ سرخی مائل ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔ سمجھ میں پڑنا بڑا مشکل تھا مگر آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اس نوکری سے مطمئن اور خوش ہے۔

واہ! کتنی بے فکری ہے۔ خوش بخت نے حسرت سے سوچا۔ یہ سبزی توڑ کر رسوئی کی لکڑیوں کی جلا دینے والی آگ پر کھانا پکائے گی، ہم سب کو کھلا کر تعریف اور انعام وصول کرے گی۔ پھر خود جی بھر کر کھائے گی، پیئے گی اور گہری نیند سو جائے گی۔

"آپا گُل! پھر کوئی شعر کہہ دیں۔ کوئی فلسفہ جھاڑ دیں۔" ثریا نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہمیشہ کی طرح فلاسفر جو ٹھہری ہماری آپا گُل۔"

"ہر وقت کی سوچ بچار اچھی نہیں ہوتی۔" زہرہ نے لقمہ دیا۔

"میں نے جو سوچا ہے، اگر میری بہنیں سننا پسند فرمائیں تو بیان کروں۔" خوش بخت نے جواب سنجیدگی میں ہی دیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"شعر اور فلسفے کے علاوہ جو بتائیں گی، ہم سننے کو تیار ہیں۔" زہرہ نے مذاقاً کہا اور دونوں اُس کے پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔

"میں نے سوچا ہے، ہم بہنیں مل کر ایک اچھے سکول کی شروعات کیوں نہ کریں؟ مجھے گلی کُوچوں میں کھیلتے ہوئے یہ معصوم بچے افسردہ کر دیتے ہیں۔ ان کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ ہماری اگلی نسل جاہل گردانی جائے گی۔ ہمیں اپنے دُکھوں کی آماجگاہ سے باہر نکل کر دیکھنا چاہئے۔ خوشیاں حاصل کرنے کو بہت کچھ ہے۔ ثریا! تم میری بات غور سے سن لو۔ یہ رونا دھونا اور دوسروں سے ہمدردیاں بٹورنا بند کرو۔ اپنی زندگی کا رخ خوشیوں اور مسکراہٹوں کی طرف موڑنے میں صرف تمہاری ہی نہیں، ہم سب کی بھلائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دوبارہ زندگی بخشی ہے، اس سے انصاف کرنا سیکھو۔ یہ ہر وقت کا کُوھنا اور منہ لٹکائے پھرنا تمہاری کم ہمتی اور بزدلی کا ثبوت ہے۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی ڈانٹ تھی۔

"آپ بہت منطقی ہیں آپا گل!" ثریا نے ناگواری سے کہا۔ "بعض اوقات ہر منطق کے پیچھے کامیابی نہیں ہوتی۔ سب سوچنے کی باتیں ہیں۔ اس دنیا کی پیدائش ناکامی سے شروع ہوتی ہے اور ناکامی پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔"

"ثریا! تم ایسی تو کبھی نہ تھی۔" خوش بخت نے اسے پیار سے گلے لگا لیا۔

ثریا، خوش بخت سے صرف گیارہ مہینے چھوٹی ہونے کی وجہ سے اس کی بہترین دوست اور ہم جماعت تھی۔ دونوں کا ہر کام، ہر شرارت اور ہر امتحان ایک ہی منصوبے کے تحت پایۂ تکمیل تک پہنچتا۔ گو کہ خوش بخت کافی کم گو تھی، لیکن اس کی قربت میں وہ بھی کافی شوخ و شنگ ہو جاتی تھی۔ خوش بخت کا دل و دماغ ہمیشہ نئی تخلیق کی طرف مائل رہتا تھا۔ وہ اپنا ہر نیا منصوبہ ثریا کو بتاتی اور وہ اس کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ گھر کی تمام لڑکیوں کی آئیڈیل تھی۔ سب اس کی ہر بات اور ہر ادا کی نقل کرنے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔ مگر آج ثریا نے اُس کو زِچ کر دیا تھا۔ اُس کے لہجے کی ناگواری نے خوش بخت کو غصہ دلانے کے بجائے اس میں ترس اور ہمدردی کُوٹ کُوٹ کر بھر دی تھی۔

"ہم سب مل کر یہ نیک کام کریں گے۔ تمہارے مشورے کے بغیر میں نے کبھی کوئی قدم اُٹھایا ہے؟ بتاؤ نا ثریا! تم میرا ساتھ دو گی؟ آج رات تم میرے ساتھ بیٹھ کر سکول



کھولنے کا تمام خاکہ بناؤ گی۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے جان!" وہ پیار سے بولی۔

"یہ سب کیسے ہو گا؟...... کب ہو گا؟" زہرہ نے بے چینی سے ثریا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ثریا کی مدد کے بغیر ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ انفرادی کام نہیں۔ اس میں اجتماعی کوشش اور محنت کی ضرورت ہے۔ دیکھ لیں ثریا! آپ کتنی اہم ہیں ہم سب کے لئے۔"

"ابھی بھی؟" ثریا نے غیر یقینی سے کہا۔

"ہاں..... ابھی بھی۔ تم ہر حالت اور ہر صورت میں ابھی بھی ثریا ہی ہو۔" خوش بخت نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "آج ہم اپنی پڑھائی شروع کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ تم اور میں ایف اے کے امتحان کی تیاری شروع کرتے ہیں۔ زہرا اور جہاں آرا اور باقی چچا کی بیٹیاں میٹرک کرنے کا تہیہ کر لیں۔ ساتھ ہی اپنے گھر اور گاؤں کے بچوں کے لئے انگلش میڈیم اور اُردو میڈیم سکول کھولے جائیں۔ جوان بچیوں کے لئے سلائی کڑھائی اور بُنائی کا سکول بھی میرے منصوبے میں شامل ہے۔"

"پہلے بابا جان اور اماں گل سے اجازت نامہ تو لے لیں۔" زہرہ بولی۔ "کیوں ثریا! بزرگوں کی شمولیت ہی ہمارے تمام منصوبوں کی کامیابی ہو گی۔"

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" ثریا منہ بسورے بیٹھی ہوئی تھی۔

"ثریا! تم پر میری کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ ظلم و ستم اور زیادتی پر گھٹ گھٹ کر رونا کوئی زندگی ہے؟ سب کچھ بھول جاؤ۔ پاکستان کی ہزاروں لڑکیاں اس بے انصافی سے دوچار ہو چکی ہیں۔ کیا سب نے ہمت سے جینا چھوڑ دیا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں۔ زندہ و سلامت مل جانے پر شکر ادا کرو ثریا! اللہ نے تمہیں سنہرا موقع دیا ہے دوسروں کے کام آنے کا۔ تم ہو کہ ٹھکرائے جا رہی ہو۔ یہاں سے بدقسمتی کا نزول ہوتا ہے۔" خوش بخت پھر سنجیدگی سے سمجھانے لگی۔

"ثریا! تم طبعاً بہترین منیجر ہو۔ ایک سکول کی ہیڈ مسٹریس تمہیں بنائیں گے۔" زہرہ نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا تو ہلکی سی مسکان اس کے لبوں پر پھیلی جو اک لمبی آہ میں پنہاں ہو کر رہ گئی۔

صبح ناشتے پر گھر کے تمام چھوٹے بڑے، دستر خوان پر بیٹھے تھے۔ خوش بخت نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



بات چھیڑ دی۔ سب ناشتہ کرنا بھول گئے۔ کسی نے خوشی کا اظہار کیا، کسی نے ٹالنا چاہا، کسی نے مذاق اُڑایا۔ لیکن اماں گُل نے اس کو بے حد سنجیدگی سے لیا۔ اور آخر کار چند دنوں کے بحث مباحثے کے بعد سکول کھولنے کا خواب اپنی تعبیر پا گیا۔ اس خوشی میں گھر پر قرآن خوانی ہوئی اور گاؤں بھر میں بتاشے تقسیم کر دیئے گئے۔

حویلی کے سب سے پچھلے احاطے میں ایک بہت بڑا گودام تھا، جو غلے اور اناج سے بالکل خالی تھا۔ فیروز خان نے اس کو صاف کروا کر مرمت کروائی، چونا پانی کر کے اس کے اندر صاف ستھرے نئے ٹاٹ بچھائے گئے۔ باہر چار دیواری بنا کر اس کو سکول کی شکل دے دی گئی۔ یونیفارم اور کتابوں کا انتظام کر کے سکول کی بنیاد رکھ دی گئی۔ یہ انگلش میڈیم سکول صفیہ کی بہن خدیجہ کی نگرانی میں سونپ دیا گیا، جو صفیہ کی دیورانی بھی تھی۔ اس کے اپنے تین بچے تھے۔ ہر وقت کی سوگواری اور مایوسی نے اس کو خاموشی سونپ دی تھی۔ فیروز خان کے کہنے پر اُس نے اس ذمہ داری کو ہنس کر قبول کر لیا تھا۔ گھر کی بچیاں اپنی پڑھائی شروع کرنے کے ساتھ اس سکول کی ذمہ دار اُستانیاں بننے میں بے حد فخر اور خوشی محسوس کرنے لگیں۔ گاؤں کے دو کمرے والے سکول کو بھی صاف ستھرا کر کے وہاں اُردو میڈیم سکول شروع ہو گیا۔

اگلا مرحلہ لڑکیوں کے لئے سلائی کڑھائی کا ادارہ کھولنے کا تھا۔ صفیہ نے حویلی کے ایک کمرے ہی میں اس کی شروعات کرا دی۔ اماں گُل اپنا کردار ادا کئے بغیر کیسے رہ سکتی تھیں؟ انہوں نے بچوں کو درس و تدریس کا سبق دینا شروع کر دیا۔ چھٹی کے بعد بچوں کو ایک گھنٹے کے لئے روک لیا جاتا اور قرآن کی تجوید کی کلاس اماں گُل لینے لگیں۔ ان تمام کاموں کو تشکیل دینا خوش بخت کی ذمہ داری تھی۔

چند مہینوں میں سکول میں بچوں کی تعداد بڑھنے لگی جلال خان کی مدد سے فیروز خان نے گاؤں میں ایک گھر خرید لیا اور سکول حویلی سے منتقل ہو گیا۔ گاؤں سے گھر میں بیٹھی پڑھی لکھی ناکارہ بچیوں کو پڑھانے کے لئے منتخب کر لیا۔ اور یوں ہر عورت اور لڑکی اس نیک کام میں ایسی مصروف ہوئی جیسے جیسے آزمائش ان پر آئی ہی نہ تھی۔ گاؤں میں خوشحالی اور کامیابی نظر آنے لگی۔ فیروز خان نے گاؤں میں قابلِ عزت مقام بنا لیا۔ ہر کوئی اُس کو سیاست میں آنے کے مشورے دینے لگا۔ کیونکہ اس گاؤں کو ایسے ہی محنتی اور مخلص نمبردار



کی ضرورت تھی۔

❖❖○❖❖

"جلال خان! تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اگر مزاج پر گراں نہ گزرے تو۔" فیروز خان نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ضرور پوچھیں، لالہ جان! ایسی کون سی بات ہے جو مجھ سے اجازت لی جا رہی ہے؟" وہ مسکرا دیا۔

"تم اتوار کا دن ہمارے ساتھ گزارتے ہو۔ میں تم سے کتنا کچھ سیکھتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے۔ میرے گھر کی عورتیں بھی کچھ سیکھ پائیں تمہاری بیگم سے۔ کسی دن ان کو بھی لے آنا۔ یہ گھر آپ کا تو ہے ہی، ان کا تعلق بھی ایسا ہی ہے۔ گھر سے بھی بار بار یہی فرمائش کی جا رہی ہے۔" وہ اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔

"میرے بیوی بچے......" تھوڑی دیر خاموشی چھا گئی۔ "لالہ! میں اکیلا رہتا ہوں۔ بیوی بچے نہیں ہیں۔" جلال نے مختصر بات کرنے پر اکتفا کیا۔

وہ اپنی خودی اور انا میں رہنے والا شخص تھا۔ زیادہ تر مرد اپنے گھریلو مسائل اور نجی پریشانیاں دوسروں سے بیان کرنا طبعاً معیوب سمجھتے ہیں۔ ان کی گہرائی اور خودمختاری ہی ان کی خودداری ہے۔

"تم ابھی تک غیر شادی شدہ ہو۔ ایسا کیوں ہے جلال خان؟ کبھی ماں باپ کو فکر یا شوق نہیں ہوا تمہارے سر سہرا سجانے کا؟ بہت حیرت کی بات ہے۔" فیروز خان حیرت میں ڈوب گیا تھا۔

"بس ایسا ہی سمجھیں کہ کسی کو میری فکر نہیں ہوئی۔" اس نے سنجیدگی سے موضوع بدلا۔ "آپ چھوڑیں ایسی باتیں۔ آپ میری ترقی کی دعا کریں۔ گھر میں اماں گُل کو بھی میرا پیغام پہنچا دیجئے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں ترقی کے ساتھ تمہاری شادی کے لڈو بانٹنے کے خواب دیکھنے لگا ہوں۔ اگر کسی کو فکر لاحق نہیں ہوئی تو کوئی بات نہیں۔ میں اس بارے میں سوچ بچار کرتا ہوں۔"

"یہ غیر ضروری موضوع کسی اور وقت چھیڑیں گے۔ اپنی تنہائی اور اکیلے پن کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com



وجوہات آپ کو ضرور بتاؤں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ کتنی مشکلات کے بعد آپ نے سُکھ کا سانس لیا ہے۔ اب میرا غم پالنا بہت بڑی بے انصافی ہوگی۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''تم میرے چھوٹے بھائی اور محسن ہونے کے ناطے پریشان تو کر گئے ہو یار! بیوی کا ساتھ مرد کو جوان اور تر و تازہ رکھتا ہے۔ بچے زندگی کو بامقصد بنانے میں مدد کرتے ہیں۔ تم بڑے عجیب انسان ہو۔ میس کی زندگی کوئی زندگی ہے؟...... جلال خان! میری بات پر غور کرنا۔ گھر آباد کرنے کا سوچو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ حد کر دی تم نے۔'' فیروز خان نے افسردگی سے کہا۔

''فیروز لالہ! آپ ہرگز فکرمند نہ ہوں۔ مجھے اسی زندگی میں ہنسنے بولنے، خوش رہنے کی عادت ہوگئی ہے۔ میس کے کھانے مجھے بھلے ہی لگتے ہیں۔ سب کچھ بہترین ہے۔ میں چودہ سال کی عمر سے گھر سے دُور ہوں۔ چھٹی جاتا ہوں تو ماں کو سمجھ نہیں آتی کہ اس کو سال بھر کا کھانا ایک مہینے میں کیسے کھلادوں۔ ماں کو کون سمجھائے؟ ماں کے دل کو ایک ماں ہی جان سکتی ہے۔ اس کے احساسات و جذبات نہ آپ سمجھ سکتے ہیں، نہ میں۔ آج آپ کی فکرمندی اور میلان میں مجھے اپنی ماں کی جھلک نظر آئی ہے۔ ماں بے اختیار یاد آگئی ہے۔'' وہ ماں کے احترام میں بولے جا رہا تھا۔

''تمہارا یہ سب کچھ کہنا درست ہے۔ ماں ہی اپنی اولاد کی زندگی کو ہر زاویے سے پرکھتی ہے۔ خاردار زندگی کا گل و گلزار ہو جانا ماں کی قربت اور دعاؤں کے اثرات ہیں۔ ماں کا اتنا ہی کہہ دینا، بیٹا! حوصلہ بلند رکھو، کامیابی تمہاری منتظر ہے۔ کتنی گہرائی ہے اس چھوٹی سی بات میں کہ دنیا فتح کر لینے کی دعوت ہے۔ ہر طرح کے نشیب و فراز پر غلبہ پا لینے کا سندیسہ ہے۔ ماں کے ہر لفظ میں منطق اور حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ بات غور و فکر کرنے والوں کو سمجھ آتی ہے۔ آج میری ماں کا سایہ میرے سر پر نہ ہوتا تو میں دُکھوں اور غموں کو سینے سے لگائے صحراؤں، جنگلوں اور بیابانوں میں عالمِ دیوانگی میں سرگرداں ہوتا۔ ہمارے خونی رشتوں کی شہادتیں اور باقی خاندان کا لاپتہ ہو جانا ہر فرد پر کس قدر گراں ہے۔ میں بتانا چاہوں تو بھی تصویر میں وہ پژمردگی پینٹ نہیں کر سکتا۔ یہ حویلی جوان بیواؤں اور یتیموں سے بھرپور ہے۔ معصوم بچوں کو کون سمجھائے، جو ہر رات اس اُمید کے سپنے دیکھتے ہیں کہ کل آنکھ کھلتے ہی وہ اپنے باپ کو بے شمار کھلونوں اور تحائف



کے ساتھ پالیں گے۔ جب اُن کی اُمید بر نہیں آتی تو سوالات کی بھرمار ہو جاتی ہے۔ جب انہیں بتایا جاتا ہے کہ ان کا باپ تو جنت الفردوس میں جا چکا ہے تو وہ معصوم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بلبلاتے ہوئے ضد پر اُتر آتے ہیں کہ ہم نے بھی جنت میں بابا کے پاس جانا ہے۔ ہماری اس نسل کے پروان چڑھنے کے دن ہیں۔ ان کی تعلیم حاصل کرنے اور آگے بڑھنے کے دن ہیں۔ مگر یہ سب معصوم کس شکنجے میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ جب تک شہر میں ہمارا ٹھکانہ نہیں بن جاتا، کچھ بہتر ہونے والا نہیں۔ بیٹیوں کو ہوسٹلوں میں بھیجنا ناممکن ہے۔ مالی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ لڑکیوں کو گھر سے باہر نکالنے پر دل آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ خود بھی اس قدر خوف زدہ ہو چکی ہیں کہ کسی حالت میں رضامند نہ ہوں گی۔ میری بچی ثریا پل پل جیتی اور مرتی ہے زہرہ کے لئے تم رحمت کا فرشتہ نہ بن جاتے تو وہ بھی نہ جانے کس حال میں ہوتی۔ جلال خان! تم نے تو اس کٹھن آزمائش میں میرا ساتھ دے کر چھ بھائیوں کی جگہ لے لی ہے۔ میرا صابر و شاکر ہو کر زندگی کی اس نئی ڈگر پر گامزن ہو جانا تمہاری مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔'' وہ احسان مندی سے بول رہا تھا۔

''ایسے شرمندہ نہ کریں لالہ! میں نے ایسا کیا کر دیا آپ کے لئے؟ یہ سب کچھ میرے فرائض میں شامل تھا۔ آپ کی طرح اس گاؤں کا ایک ایک گھر میں نے آباد کروایا ہے۔ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ ہاں، آپ میرے لالہ ضرور ہیں۔ ہم نے دستار بدلی ہے۔ یہ رشتہ ہر طرح کے احسانات سے بہت بالاتر ہے۔ آج کے بعد آپ نے ایسی بات کی تو میں پھر یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔ آپ کی رفاقت میں تو مجھے بے پناہ سکون ملتا ہے۔ کیا آپ میرا سکون غارت کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں؟'' وہ بہت سنجیدگی سے کہہ گیا۔

''یار! تم برا مان گئے ہو۔'' فیروز خان مسکرا دیا۔ ''چلو کوئی اور پروگرام بناتے ہیں۔''

''میں سمجھ گیا۔'' وہ بھی مسکرا دیا۔ ''شکار کا پروگرام بناتے ہیں۔ ذہن ان مسائل سے ہٹ کر اچھے فیصلے کرنے کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔''

''درست...... تم اپنی زندگی کا بہترین فیصلہ مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ کام تمہارے یا تمہارے خاندان کے بس کا نہیں لگتا۔ اس کی ذمہ داری میں اُٹھانے کو تیار ہوں۔'' فیروز خان کے ذہن میں یہ بات گھوم رہی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



جلال خان نے پھر مسکرا کر ٹالنے کی کوشش کی۔

''فیروز لالہ! آپ کی باقی جائیداد کے کاغذات جا چکے ہیں۔ شہری جائیداد کا ملنا آپ کا حق بنتا ہے۔ دیکھتے ہیں کس علاقے میں آپ کے نصیب میں جانا لکھا ہے۔ لیکن یہاں کے سکولوں کا کیا بنے گا؟ سینکڑوں بچے تعلیم سے مستفید ہو رہے ہیں۔ بے شمار جوان لڑکیاں ہنر سے خود کو آراستہ کر رہی ہیں۔ مجھے آپ کی محنت سے اس گاؤں کا مستقبل بے حد روشن نظر آ رہا ہے۔'' جلال خان کا لہجہ تحسین آمیز تھا۔

''جلال خان! بات کا رُخ موڑنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو، کہ میں تمہارے لئے جو فیصلہ کرنے جا رہا ہوں، بہترین نتائج کا حامل ہوگا۔ بے فکر رہو۔ اب سوچ و بچار اور فکرمندی میں نے اپنے سر لے لی ہے۔'' فیروز خان بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔

جلال خان نے پھر موضوع بدلا۔ ''فیروز لالہ! آپ نے جواب نہیں دیا۔''

''ہاں......'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''سکول بند کرنے کے لئے نہیں کھولے جاتے۔ یہ ایسا ادارہ ہے جو دن بہ دن آسمان کی وسعتوں کو چھوتا چلا جاتا ہے۔ میری اور تمہاری بھابی کی سرپرستی میں سب کچھ بہترین چلے گا۔ مجھے اس کی فکر نہیں۔ میری زندگی کا ساتھی دم قدم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہے۔ یہی تو تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

''فیروز لالہ! میں چلتا ہوں۔ آپ کی سوچ ایک نقطے پر منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔'' وہ ہنس رہا تھا۔ ''ویسے میں نے آپ کی شخصیت میں بے حد پکا پن دیکھا ہے۔ آپ جو سوچ لیتے ہیں، اس کو عملی جامہ پہنا کر چھوڑتے ہیں۔ خدا خیر کرے، اب آپ کی سوچ کا محور میں بن چکا ہوں۔''

''یہی سمجھو۔'' فیروز خان بھی ہنسنے لگا۔ اور دونوں باہر نکل گئے۔

بات تو سچ تھی۔ فیروز خان اپنے ارادوں میں ہمیشہ سے مستحکم رہا تھا۔ چھ عدد بھابیوں اور ہر عمر کے بچوں کو قابو میں رکھنا آسان کام نہ تھا۔ ماں کا کردار بھی قابلِ ستائش تھا۔ اس حویلی میں رہنے والی تمام خواتین کو ایک دوسرے سے بے پناہ لگاؤ، اُنس اور ہمدردی تھی مگر حسد اور بغض بھی موجود تھا۔ یہ قدرتی اور طبعی امر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کی



فطرت میں خود پسندی اور خود نمائی غیر متناہی حد تک ڈال رکھی ہے۔ ان میں رشک و حسد کی بنیادی وجہ بھی یہی تھی۔ اتنے الم ناک سانحے کے باوجود گھریلو سیاست کی رونقیں برقرار تھیں۔ فیروز خان ان کے لئے بہت معزز اور عالی مرتبہ شخصیت تھی۔ ان سب کا کرتا دھرتا اور سربراہ ہونے کی وجہ سے سب اس کے سامنے دنگا فساد کرنے میں بہت محتاط رہتی تھیں۔ ہر غلط فہمی، گلہ و شکوہ اماں گل تک ہی رہتا تھا۔ وہ سب کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا رکھتیں۔ اُن کی نظر میں سب برابر تھیں۔ سب جوانی میں ہی لاتعداد محرومیوں کا شکار ہو کر مزاج بدل چکی تھیں۔ کبھی وہ بھی سر پر تاج سجائے اپنی سلطنت، اپنی حکومت کی ملکہ تھیں۔ اب سب جیٹھ کی سرپرستی میں آ کر خوش و خرم کیسے رہ سکتی تھیں۔ لیکن کسی کو شر انگیزی اور فتنہ گری کی اجازت ہرگز نہ تھی۔ آرائش، بناؤ سنگھار اور سج دھج پر پابندی تھی۔ اندرونِ خانہ میں ہر طرح کی آسودگی اور خوشحالی سے لطف اندوز ہونے پر کوئی قید نہ تھی۔ بہوئیں اماں گل کی اپنی بہنوں، نند اور بھائی کی بیٹیاں تھیں جو اس کے اپنے جگر کا ٹکڑا تھیں۔ سب کے خاندان صفحۂ ہستی سے مٹ چکے تھے۔ ماں کی آغوش، باپ کا شفقت بھرا ہاتھ، رونے کے لئے بھائی کا کندھا اور اپنے دُکھ درد بانٹنے والی بہن کا سہارا...... کچھ بھی تو باقی نہ رہا تھا جن کے ملنے کی آس میں شب و روز گزر رہے تھے۔

جب سے سب نے خدمتِ خلق کی طرف رجحان کیا تھا، اس خاموش اور افسردہ حویلی میں قہقہے گونجنے لگے تھے۔ اماں گل اپنا کردار بے حد خوش اسلوب سے نبھا رہی تھیں۔ رات سونے سے پہلے تمام پوتے پوتیوں کو اپنے کمرے میں بلا لیتیں۔ تمام بچے شور و غل اور شرارتیں کرتے چٹائی پر بیٹھ جاتے اور اماں گل اُن کو کہانی سناتیں، جس میں دُکھ درد کے ساتھ خوشی اور اُمید کا عنصر بھی شامل ہوتا۔ کہانی کا اختتام بہت خوشگوار اور کامیاب ہوتا۔ بُرے کام کا انجام عبرت ناک اور اچھے کام کے نتائج بہت شاہانہ اور تسلی بخش ہوتے تھے۔ بچے تالیاں بجاتے، نعرے لگاتے اپنے اپنے بستروں میں گھس جاتے۔ اماں گل کو بھی اپنی ذات ناکارہ اور کم قیمت نہ لگتی تھی۔ وہ بھی ان کی پرورش اور تربیت میں اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ ان کو سر اٹھا کر جینے کا شعور، اُمید اور حوصلے سے آگے بڑھنے کی اُمنگ، اخلاقیات، دینی اور دنیاوی قدریں، ان پر خاندان کی توقعات، معاشرے کی کامرانی میں ان کا کردار اور طرزِ زندگی کے سنہرے اصول اور قانون غرضیکہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہر موضوع پر ایک نہ ایک پُر اثر کہانی تیار کی ہوتی تھی۔ جو زندہ مثالوں اور کارناموں کے ساتھ بچوں کے گوش گزار کر دی جاتی۔ بچوں کو کہانی کا کچھ حصہ سمجھ آتا کچھ سر سے گزر جاتا، کچھ پر سوالات کی بھرمار ہو جاتی۔ عموماً بچے مل کر کہانی پر تبادلۂ خیالات ضرور کرتے۔ اپنی اپنی جماعت میں جا کر دوستوں کو چسکے لے لے کر کہانی کو توڑ پھوڑ کر سنانے کی کوشش کرتے۔ اماں گُل کے پیغام کا کچھ حصہ اس طریقے سے باقی بچوں تک بھی پہنچ رہا تھا۔

وہ کتنا اچھا اور کارآمد زمانہ تھا، جب نانی اور دادی کے کردار کا مقصد ہی نئی نسل کے اندر خوبیاں اُجاگر کرنا اور معاشرے کا بہترین فرد بنانا تھا۔ ایسی آغوش میں پلے ہوئے بچے جب جوان ہوئے تو ایسے بااعتماد، خوش گفتار، مستحکم اور اصول پرست ثابت ہوئے کہ اپنی آزادی کی خاطر تن من دھن نچھاور کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اماں گُل اپنے خاندان کا بہت مضبوط ستون تھیں۔ ان کی پختگی اور صبر و تحمل نے سب کو حوصلہ مندی اور دلیری سے جینے کا وہ سبق سکھایا تھا کہ گاؤں کا ہر گھرانہ اس سے فیض یاب ہو رہا تھا۔ اور ان کی عزت و شان کو چار چاند لگ گئے تھے۔ وہ اپنوں اور غیروں کے لئے مشعلِ راہ تھی۔ حالانکہ اُس کی اپنی ذات دکھوں اور محرومیوں کی آماجگاہ تھی۔ شبِ تنہائی اور تاریکی میں وہ خون کے آنسو بہاتی۔ اپنے جگر اور جسم کے ٹکڑوں کا پیدائش سے لے کر شہادت تک کا ایک ایک لمحہ آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح گھوم جاتا۔ اپنے جیون ساتھی کے ساتھ نشیب و فراز میں گزرا ہوا وقت کیسے یاد نہ آتا۔ مگر کیا مجال کبھی کسی پر اپنے دُکھوں کا اظہار کیا ہو۔ اُنہیں دیکھ کر چٹانوں جیسی مضبوطی اور اُونچائی اور سمندر جیسی گہرائی کا گمان ہوتا تھا۔ اپنے شاندار اعمال کی وجہ سے وہ گاؤں بھر کی اماں گل تھی۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی ہرگز نہیں تھی، مگر باشعور اور باہوش ہونے کی وجہ سے ہر ایک پر بھاری تھی۔ وہ اپنی فراست و ذہانت سے سب کو حقیقت اور صداقت کے جامے میں لے آتی اور ان کے خیالات پر اپنی منطق اور پختہ دلائل کے ساتھ حاوی ہو جاتی۔ یہ بھی تو اسی مرد کی دنیا کی باسی تھی۔ باہر کی دنیا سے رابطہ، نیکی بدی، خوشی و غمی پر حاضری اماں گُل کے فرائض میں شامل تھا۔ عاجزی و انکساری اور اُنس و لگاؤ نے اُن کی شخصیت کو ایسا مکمل بنا دیا تھا کہ گاؤں کے کڑیل جوان بھی اُن کے مشورے پر سرِ تسلیم خم کر لیتے تھے۔ یہ عورت بھی تو اسی دنیا کی چلتی پھرتی مثال تھی۔ ایک اُجڑا ہوا خاندان تھوڑی ہی مدت میں نئے لوگوں اور



نئے ماحول میں اپنا مقام بنا کر باعزت زندگی گزارنے لگا تھا، اس میں اس عورت کا کردار قابلِ ستائش اور تحسین آمیز تھا۔ انہوں نے اپنے خاندان میں رکھ رکھاؤ، رنگ ڈھنگ اور اپنی روایات و رسومات کو بحال رکھنے کے ساتھ تمام بہوؤں اور بیٹیوں کو تعلیم کے میدان میں اُترنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس کو اپنے حقوق کی شناخت مرد کے شانہ بشانہ چل کر اس کے بوجھ کو بانٹنے کی تلقین کرتی۔ اسے منطق سے، تعلیم سے، اپنے کردار کی شرافت اور پارسائی سے اس معاشرے میں آزاد سانس لینے کے گُر سکھاتی۔ اُنہیں خود پذیرائی، خود پسندی اور خودنمائی کو خیرباد کہنے کے فوائد سے روشناس کراتی۔ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کی اصلاح پر زور دیتی۔ ہم نفس کی یکجہتی کی فائزیابی کی مثالیں بیان کر کے سب کو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر زندگی کی راہوں پر گامزن رہنے کی ہدایت کرتی جس کے خوش آئند اثرات اس خاندان کی ہر عورت میں نظر آ رہے تھے۔ حالانکہ اس حویلی میں عورتوں کی آپس میں مقابلہ بازی بھی ہر وقت زندہ و جاوید رہتی۔ کبھی حُسن کا، کبھی سلیقے کا، کبھی بچوں کو پرورش کرنے کے جدت پسند طریقوں کا، کبھی اپنے رواج کے پہناوے اور خوبصورت رنگوں کے انتخاب کا۔ یہ بھی فطری عمل تھا۔ اور ایسی مقابلہ بازی ان کی زندگی میں نہ ہوتی تو یہ حسرت و یاس کی تصویر بن چکی ہوتیں۔ ایک دوسرے کو زیر کرنے اور شکست دینے کا جذبہ ان میں بھی پایا جاتا تھا۔ لیکن اماں گُل نے اس پر بھی حدیں مقرر کر رکھی تھیں۔ وہ کسی قسم کی مقابلے بازی سے منع نہیں کرتی تھیں۔ اُن کے خیال اور عقل میں مقابلہ شخصیت، ماحول اور معاشرے کو سنوارنے کا سبب بنتا ہے۔ ہر ایک آگے بڑھنے کی تگ و دو میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ باتوں باتوں میں ان کے کان میں یہ بات ڈالتی رہتی تھیں کہ اگر تم عورتوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور الگ ہونے کا سوچا بھی تو یہ خاندان کرچی کرچی ہو کر بکھر جائے گا، دوسروں کا محتاج ہو جائے گا۔ غربت، مفلسی اور جہالت اگلی نسل کا مقدر بن جائے گی۔ عزت کی دھجیاں اُڑ جائیں گی۔ ہماری یہ معصوم بچیاں اس نئے ماحول اور معاشرے کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن جائیں گی۔ کھلونے سے بڑھ کر نہ ان کی قیمت ہو گی نہ کوئی وقعت ہو گی۔ وہ ہمیشہ اس حقیقت سے پردہ کشائی کرتی رہتی تھیں۔ اور سب گوش بر آواز ہو کر ایک دوسرے کا سہارا بنی، زندگی کی ان راہوں پر کانٹے چننے اور پھول بکھیرنے میں مگن رہتیں۔ مقصدِ حیات جو یہی تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



آج جلال خان کو حویلی آئے مہینہ بیت گیا تھا۔

فیروز خان اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ مجھ سے ایسی کون سی غلطی انجانے میں سرزد ہو گئی کہ اس نے آنا ہی چھوڑ دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ گاؤں چلا گیا ہو۔ یا اس کی یونٹ کہیں دوسرے اسٹیشن پر اپنے فرائض انجام دے رہی ہو۔ لیکن اسے تو اس کے ہر پروگرام کی خبر ہوتی تھی۔ مسئلہ باعثِ حیرت ضرور تھا۔ کیونکہ ایسے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات میں ایک دوسرے سے بے خبر ہو جانا خام خیالی ہرگز نہ تھی۔ فیروز خان غیرت مند ضرور تھا مگر احسان فراموش اور بے فیض ہرگز نہ تھا۔ وہ اپنے محسن اور غمگسار کی بازپُرسی کئے بغیر کیسے تسکین حاصل کر سکتا تھا؟

جلال خان کمرے میں موجود نہ تھا۔ وہ باہر برآمدے میں ہی اس کا انتظار کرنے لگا۔

بیرے نے چائے لا کر دی۔ بے چینی اتنے عروج پر تھی کہ چائے کی طرف دھیان ہی نہ گیا۔

کافی وقت گزرنے کے بعد جلال خان ٹریک سوٹ میں وارد ہوا۔ ہاتھ میں ریکٹ اُٹھائے اپنی مخصوص چال میں چلتا ہوا وہ کس قدر بارُعب لگ رہا تھا۔ فیروز خان کو دیکھ کر دُور سے ہاتھ ہلاتا اس کے قریب پہنچ گیا۔

''خیریت تو ہے؟'' وہ اُس کے چہرے کی بے چینی اور پریشانی کو فوراً بھانپ گیا۔

''اپنی سزا خود تجویز کر لو تو فائدے میں رہو گے۔ یہ کہاں کی شرافت ہے کہ تمام گاؤں والوں کو اپنا گرویدہ بنا کر یک دم لاتعلق ہو جاؤ۔ یہ ناقابلِ معافی ہے۔'' لہجے میں ناراضگی عود کر آئی تھی۔

''فیروز لالہ! میں دو ہفتے کے لئے گاؤں گیا ہوا تھا۔ وہاں کے مخصوص حالات میں میرا وہاں پر ہونا بے حد ضروری تھا۔ آپ کو بتا نہ سکا، جس کی معافی چاہتا ہوں۔'' لہجہ پریشان تھا۔

''کیا میں تمہارے لئے کچھ کر سکتا ہوں؟ مجھے کبھی تو اپنے مسائل کے بارے میں بتاؤ۔ شاید تمہارا راہبر بن سکوں۔ تم سے میرا کیا رشتہ ہے، اچھی طرح جانتے ہو نا؟'' فیروز خان نے شکوے بھرے لہجے میں کہا۔

''جی! جانتا ہوں، فیروز لالہ! پھر کبھی اس موضوع پر بات کریں گے۔ کوئی خاص



پریشانی والی بات نہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔'' اُس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر دونوں اُٹھے اور میس کے ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے۔

''جلال خان! صبح چھٹی ہے۔ میں نے شکار کا پروگرام بنا لیا ہے۔ دوسرا تم سے بے حد ضروری مشورہ بھی لینا ہے۔ کل تڑکے ہی پہنچ جانا۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''لگتا ہے، تمہیں ملے مدت ہی ہو گئی ہے۔ آج تو میں نے معاف کر دیا، آئندہ ایسی غلطی ذرا سوچ سمجھ کر کرنا۔''

''یس سر!'' جلال خان نے سلیوٹ کیا اور ایک قہقہہ فضا میں تحلیل ہو گیا۔

❖❖○❖❖

www.iqbalkalmati.blogspot.com



**مرغابی** کا شکار بڑا کامیاب رہا تھا۔ دونوں غسل سے فارغ ہو کر مرغابی کے پکنے کا انتظار کرتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ آج مردان خانہ میں کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ جلال خان مسلسل فیروز خان کو الیکشن کی تیاری پر اُکسا رہا تھا۔ کیونکہ اس گاؤں کو سنوارنے اور بنانے کی ذمہ داری یہ بخوبی نبھانے کی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ اچانک ہی فیروز خان نے بات کا رُخ بدل ڈالا۔

”جلال خان! جو کہو گے، اس پر عمل کرنا میرا فرض ہے۔ مگر میری بھی تو خواہش پوری کرو۔ یہ تمہارا اکیلا پن مجھے مضطرب کیے رکھتا ہے۔ تمہارے جیسے فرشتہ صفت انسانوں کی نسلیں جاوداں رہ کر معاشرے کو سنوارا کرتی ہیں۔ تمہاری نسل کا چلنا بے حد ضروری ہے۔“ فیروز خان نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”فیروز لالہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری زندگی کا ہر سانس خودغرضی جیسی نحوست سے بے بہرہ ہے۔ اس دھرتی کے ایک ایک ذرّے پر جان نثار کرنا میری زندگی کا اوّلین مقصد ہے۔ ورنہ میں بھی اپنی خاندانی روایات اور رسومات کو اپنا کر شاہانہ اور حاکمانہ زندگی کا انتخاب کر چکا ہوتا۔“

”تمہارے نام کی بقا و جلا کا شمار کارِ خیر میں ہو گا۔ اپنے ملک کو یہ تحفہ سونپ دو۔ تمہارے دل نے کبھی تو کسی کو اپنا کہنے کی خواہش کی ہو گی۔ آنکھوں کو کوئی تو بھایا ہو گا۔ مجھے بتاؤ، میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ اس نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ تم بھی اچھی طرح سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔“ فیروز خان نے بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

جلال خان کو ایسا محسوس ہوا، جیسے کسی نے سر پر ہتھوڑا مار دیا ہو۔ وہ خود کو سنبھالتے



ہوئے بولا۔

”فیروز لالہ! یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں بالکل تن تنہا ہوں؟ گاؤں میں میری بیوی اور دو بیٹے ہیں۔“

”تم نے کبھی ذکر نہیں کیا۔“ اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔ اُنہیں اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے؟ اپنے بیٹوں کو اپنی شفقت، اپنی تربیت اور اپنی قربت دے کر انہیں اپنے جیسا انسان بناؤ جلال خان! ویسے تم نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔ میں تو تمہیں بہت منطقی، حقیقت پسند اور جہاندیدہ انسان تصور کرتا تھا۔ کیا بیوی بچوں کی ذمہ داری اُٹھانے سے گھبراتے ہو؟“

جلال خان نے جز بز ہوتے ہوئے اپنی ازدواجی زندگی کا نقشہ اُس کے سامنے کھینچ دیا۔ وہ دو ہفتے گھر گزار کر آیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ناقابلِ فہم باتیں، پُر پیچ مسائل اور بے تکے دلائل نے اُسے رنجیدہ و پشیمان ہی رکھا تھا۔ سولہ سال کی شادی کے باوجود نہ خیالات میں ہم آہنگی اور نہ مزاج میں مطابقت ہوئی تھی۔ دونوں بیٹے شیر خان اور دلیر خان، ماں کے بے جا لاڈ و پیار میں پڑھائی سے دستبردار ہو کر غلط صحبت اپنا چکے تھے۔ بزرگوں سے گستاخی، ہم عمر بچوں سے دنگا فساد اور کمی کمین لوگوں پر ظلم و تشدد ان کا شیوہ بن چکا تھا۔ آس پاس کے گاؤں میں دنگا فساد کی وجہ سے اپنے ہم عمر لڑکوں سے جان لیوا دشمنی پروان چڑھ کر بول رہی تھی۔ سب اپنی عزت بچاؤ مہم پر کاربند ہو کر تمام شکایات کا کھاتہ جلال خان کے سامنے کھول دیتے۔ سوائے ندامت اور بے بسی کے اسے کوئی دوسرا رستہ نظر نہ آتا تھا۔ ماں اور بچے اس کے ساتھ رہنے کو تیار نہ تھے۔ ایک عورت کی ہٹ دھرمی اور ضد نے نئی نسل کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اس کی جہالت اور کم عقلی کو اس نے بے حد صبر و تحمل سے برداشت کیا تھا۔ طلاق اُس کے خاندان میں ممنوع تھی۔ ماں کے بغیر بچوں کو ساتھ رکھنا مناسب نہ تھا۔ وہ جب بھی اپنی آواز بلند کرنے کی کوشش کرتا تو خاندان کا ہر فرد اُس کی مخالفت پر اُتر آتا تھا۔ کلثوم تھی کہ اپنے ہی خول میں طمانیت اور تسکین سے بھرپور زندگی گزار رہی تھی۔ جلال خان اپنے خاندان اور آباء و اجداد سے لگاؤ کی وجہ سے ہر طرح کی دقیانوسی اور جاہلانہ رسم و رواج پر صبر و جبر کے ساتھ ہر رشتے کے تقدس اور اہمیت کو نبھائے جا رہا تھا۔ یہی لگاوٹ کمزوری بن کر اُبھر چکی تھی، جس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



اثرات اُس کی اولاد میں نظر آنے لگے تھے۔ باقی سب اپنی طرز اور اپنی ڈھنگ کی دنیا میں اپنی اپنی ازدواجی زندگی میں خوش تھے۔ ان کے بچے بھی نافرمان اور خودسر نہیں تھے۔ بہار خان بڑا بھائی ہونے کے ناطے اور گاؤں میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے سب کا کرتا دھرتا اور بہت معتبر اور باعزت مانا جاتا تھا۔ جلال خان کی عدم موجودگی نے اُسے گاؤں سے بہت دُور کر دیا تھا۔ یہ آج بھی سب کی نظر میں گورا سپاہی اور ناقابلِ برداشت تھا۔ ہر دفعہ وہ دل پر منوں بوجھ لئے واپس آ جاتا تھا۔ آج فیروز خان کی ہمدردانہ گفتگو نے اُسے اپنے دل کے پھپھولے دکھانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"اللہ تعالیٰ نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دے رکھی ہے۔ تم غور وفکر کرو گے تو اس اجازت میں گہرائی پاؤ گے۔ ویسے بھی تمہاری بیوی تمہیں خود شادی پر اُکساتی رہتی ہے اور تم ہر دفعہ عاجزی و انکساری کا پیکر بنے ہنس کر ٹال جاتے ہو۔ تمہاری شرافت اور محبت بے بسی اور لاچارگی کا روپ دھار کر تمہاری نسل کو نیست و نابود کر دے گی جلال خان! ہوش اور سمجھ سے کام لو۔" فیروز خان اُس کی روداد سن کر مزید پریشان ہو گیا تھا۔

"کلثوم ناراضگی اور غصے میں شادی کا کہہ کر میری خواہشات کو رد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسری عورت کا تصور بھی اُس کے لئے موت کے مترادف ہے۔ ہاں، یہ بات آپ نے درست فرمائی ہے کہ میری ہر خوبی اور اچھائی، ہر قربانی اور صبر کمزوری کی غمازی کرنے لگی ہے۔ میں اپنے خاندان سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا۔ میرے خاندان کا ہر فرد کہیں نہ کہیں سے کلثوم کا رشتے دار اور ہمدرد ہے۔ میرے لئے خونی رشتوں کو نظرانداز کرنا اور اپنے خاندانی رسم و رواج کو خیرباد کہنا امرِ دشوار ہے۔ دوسری شادی کا مطلب کافی بھیانک ہے۔ جس کے بارے میں سوچنا بھی صریح غلطی ہے۔ میں بالکل اکیلا اور بے نام ہو کر زندگی گزارنے کے حق میں ہرگز نہیں ہوں۔" وہ نشیب و فراز کو مدِنظر رکھتے ہوئے سوچے جا رہا تھا۔

"تم تو ابھی بھی اکیلے ہو جلال خان! خاندان کے کس فرد نے تمہاری زبان اور سوچ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے؟ سب نے کلثوم کی ضد اور ہٹ دھرمی کا ساتھ دے کر تمہارے لئے مسائل کے انبار لگا دیئے ہیں۔" فیروز خان نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"اپنے خونی رشتوں پر جان نثار کرنا میرے والدین کی مجبوری تھی۔ انہوں نے کلثوم



کی ہر خامی کو خوبی کا نام دے کر ہمارے رشتے کو قائم و دائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ تمام قباحتوں کی ابتدا یہاں سے ہی ہوتی ہے۔ میں نہ پہلے کوئی قدم اُٹھا سکا ہوں، نہ ہی ابھی اس قابل خود کو سمجھتا ہوں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"میں تمہاری مجبوری کو بخوبی سمجھ رہا ہوں۔ کیونکہ میرے خاندان میں پشتوں سے رشتے اپنی قرابت داریوں میں ہی طے ہوتے آئے ہیں۔ بعض اوقات بزرگوں کے یک طرفہ فیصلے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ لیکن اب میں خودمختار ہونے کا پورا پورا فائدہ اُٹھانے والا ہوں۔ میرے گھر میں چھ جوان بیوہ بھابھیاں کس آزردگی سے اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں۔ میں ان کے بھرپور جوبن کو اپنی انا، خودداری اور غیرت کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتا۔ میں نے ان کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہے اور فیصلہ کرنا ہے۔ میں بچیوں کی اس تربیت کے سراسر خلاف ہوں کہ ایک دن کی دُلہن بھی اپنے مرحوم خاوند کے نام پر اپنی تمام زندگی آگ میں جھونک دے۔ ایسا کرنے میں اُس کی عظمت کو سلام کیا جاتا ہے۔ ہندو کے شانہ بشانہ چلتے اور اُن کے رسم و رواج اپنائے ہماری عمریں بیت گئی ہیں۔ جبکہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ میرا خاندان اپنی تمام روایات و رسومات کو ساتھ لئے نیست و نابود ہو چکا ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ اب میں مجبوراً ان تمام بندھنوں سے آزاد ہو چکا ہوں۔ تم بھی ان فضول اور بے ہودہ رسومات سے رہائی حاصل کر لو۔" فیروز خان سمجھانے کی کوشش میں تھا۔

"سوچ قابلِ ستائش ہے۔" جلال نے مختصر جواب دیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

جلال خان ایک خوبرو، وجیہہ، دراز قامت اور خوش مزاج انسان ہونے کے ساتھ فراخ دل و فیاض اور قابلِ فہم واقع ہوا تھا۔ اُس کا تابش چہرہ شرافت اور لگاوٹ کی غمازی کرتا تھا۔ دلسوز مسکراہٹ اور بشاشت نے اُس کی شخصیت کو مکمل اور اتنا بھرپور بنا دیا تھا کہ لوگ اُس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ اُس کی طبیعت میں طنز و مزاح کے ساتھ سنجیدگی اور ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ دوسروں کے دُکھ اور رازدارانہ باتوں کو اپنے اندر سمو کر دوسروں کے لئے بااعتماد سہارا بن جاتا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں اس طرز سے حسرتوں کی چاشنی بھر رکھی تھی۔ مگر آج فیروز خان نے اُس کے دل میں دبے ہوئے جذبات کو ہوا دے کر اُس کی سوچ کا دھارا بدل ڈالا تھا۔ اُس کے ذہن میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ایک حسین خواب گھول کر ڈالنے میں وہ پوری طرح کامیاب ہو چکا تھا۔ جس کی تعبیر کا جلال خان کو ابھی کچھ اندازہ تھا نہ اس بارے میں سوچا تھا۔ اُس کے ذہن کا پروجیکٹر بیتی ہوئی ازدواجی زندگی کے شب و روز کے تمام سین اُس کے سامنے لا رہا تھا۔ زندگی فلم کے مانند چل رہی تھی، جہاں محض اُداسیاں، پریشانیاں، آہیں اور پچھتاوؤں کے ساتھ تلخ زندگی کی کبھی نہ ختم ہونے والی محرومیاں اور تشنگی براجمان تھی۔ زندگی جیسے تیسے بیت رہی تھی۔ لیکن اب اولاد کے مستقبل کی فکر نے اُس کی زندگی کو ننگی تلوار کے مانند کر دیا تھا۔ اُسے ہر وقت اُن کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ بیوی سے رشتہ کچے دھاگے سے باندھا گیا تھا، جو وقت کی بے انصافیوں اور زیادتیوں سے مزید کمزور ہو چکا تھا۔ یہ شادی کا طوقِ غلامی اُس نے مجبوری کے تحت اپنے گلے میں ڈال تو لیا تھا جو اب قدموں کی بھاری زنجیر کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ مگر آج اُس نے اپنی سوچ کا انداز ہی بدل ڈالا تھا۔ اُس کی ریٹائرمنٹ کے بعد کے خدشات نے اُسے پوری طرح گرفت میں لے کر اُسے ہراساں و پریشان کر دیا تھا۔ بیوی کی کلفت آمیز باتیں، جان لیوا طعنے اور پھر بھرے خاندان میں بھی احساسِ تنہائی کا روگ تو اسے کھا جائے گا۔ وہاں اس کی بات سننے اور سمجھنے والا کوئی نہ ہوگا۔

وہ ایک جھٹکے سے بستر پر بیٹھ گیا۔ سال میں ایک مہینہ وہ اُن کے تمام جاہلانہ دلائل کو شہد کے گھونٹ سمجھ کر پی جاتا تھا۔ مگر ہمیشگی کا لبادہ اوڑھ کر چوہے کی طرح بلوں میں گھس کر زندگی گزارنا اُس کی جبلّت کو گوارا نہ تھا۔ وہ سراب کی دنیا سے باہر آ چکا تھا۔ وہ حقیقت اور صداقت کی دنیا میں پہنچ کر پرکھ اور برت سے روشناس ہو رہا تھا۔ اُس کے سامنے کچھ بھی پنہاں نہ رہا تھا۔ مستقبل کا ایک ایک پہلو صبحِ صادق کی طرح وفشاں ہو کر اُسے اندھیروں اور خوش فہمیوں کی دنیا سے باہر لا رہا تھا۔ وہ کبوتر کی طرح آنکھیں موندے زندگی کا قلع قمع کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔ مگر فیصلہ کرنا بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اسی شش و پنج میں دفتر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ جیپ حویلی کی طرف چل پڑی۔ بڑے گیٹ کا تالا کھل چکا تھا۔ وہ باہر برآمدے میں ہی رُک کر سوچنے لگا کہ فیروز خان اس وقت آنے پر حیران ضرور ہو جائے گا۔ مگر کیا کروں؟ وہ اسی جزبز میں تھا کہ مردان خانے کا دروازہ کھلا اور نوعمر، شستہ اور مترنم نسوانی آواز اُبھری۔



"ماسی جی! گاؤں میں رہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ گندگی غلاظت جیسی نحوست میں زندگی گزار دی جائے۔ گھر کا چپہ چپہ تمہاری توجہ کا مرہونِ منت ہے۔ ہماری مصروفیت کا خوب فائدہ اُٹھایا تم نے۔" وہ نوکرانی کو دھیمے پن سے ڈانٹ رہی تھی۔ "آج تو میں نے تمہیں بابا جان سے بچا لیا ہے۔ آئندہ کی ذمہ داری نہیں اُٹھاؤں گی۔ اچھی طرح برآمدے کے جالے اُتارو۔ دیواروں پر بھی جھاڑو لگا دو۔ مسہریوں اور تمام دیوانوں کے غلاف دھو کر......"

اُس کی بات مکمل نہ ہو سکی۔ برآمدے کے کونے میں جلال خان یونیفارم میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ فوراً پہچان گئی۔ دوپٹہ درست کرتے ہوئے اِک دلسوز مسکراہٹ کے ساتھ ہرنی کی طرح قلابیں بھرتی مردان خانے کے اندر چلی گئی۔ وہ مارے تجسس کے سکتے کے عالم میں وہیں کھڑا دروازے کو دیکھتا جا رہا تھا۔ یہ حسین وجمیل اپسرا کون تھی جس کے لبوں پر شناسا مسکان، آنکھوں میں مانوسیت کی چمک اور پورے وجود میں شرم وحیا کی دوڑتی ہوئی لہر کو جلال خان نے فوراً محسوس کر لیا تھا۔ ماشاءاللہ اس حویلی میں کس قدر قیمتی نگینے اور ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کی نگہداشت میں فیروز خان ہر وقت سر کے بل کھڑا رہتا ہے۔ جلال خان اپنی جوانی کی دوپہر میں ابھی بھی پوری آب و تاب کے ساتھ براجمان تھا لیکن صنفِ نازک پر فریفتہ ہونا اُس کا شیوہ نہ تھا۔ دھوکا بازی اور فریب اُس کی غیرت اور فطرت کے منافی تھا۔ مگر آج حُسن کے اس پیکر کو دیکھ کر وہ ہل گیا تھا۔ زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ شاید شب بیداری اور بے کلی کے اثرات تھے کہ وہ اُسے کسی دیوی سے کم نہ لگی تھی، جس کی پوجا کرتے عمریں بیت جائیں تو تشنگی نہ مٹے۔ پرستش اور عبادت کے اس معیار پر وہ خوف زدہ ہو کر واپس جانے لگا تو ماسی کی آواز پر رُک گیا۔

"صاب جی! اندر بیٹھیں۔ خوش بخت بی بی نے آپ کے آنے کا اندر بتا دیا ہوگا۔"

'اچھا، تو یہ ہے خوش بخت۔ جس کی تعریفیں کرتا فیروز خان تھکتا نہیں۔ خوش شکل ہونے کے ساتھ خوش گفتار اور خوش اخلاق بھی ضرور ہوگی۔' وہ یہ سوچتا ہوا مردان خانے میں چلا گیا۔ خوش بخت وہاں کسی کام میں مصروف تھی۔

"آپ مجھے تو پہچانتی ہیں نا؟" وہ قریب جا کر بولا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



''جی!'' نظریں نیچی تھیں۔

''تو اپنا تعارف بھی کرادیا ہوتا۔'' وہ مسکرادیا۔

خوش بخت بھاگنے کی تیاری میں تھی۔

''مجھے تم سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ فیروز لالہ کی تعریفوں نے مجھے تجسس میں ڈال دیا تھا۔'' وہ ستائش بھرے لہجے میں بولا۔ وہ ذرا سا مسکرادی۔

''خوش بخت! تم مجھ سے پوچھو گی نہیں کہ آج اس وقت میں یہاں کیسے اور کیوں آ گیا؟'' وہ اور قریب ہو گیا۔

خوش بخت نے بادامی آنکھوں کے غلاف اُٹھا کر اُسے حیرت سے دیکھا کہ وہ کون ہوتی ہے یہ سوال کرنے والی۔

''میں نے رات بھر اِک بھیانک خواب دیکھا۔ کھلی آنکھوں سے، باہوش وحواس۔ سننے میں آیا ہے کہ برے خواب، خوش کن تعبیر کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' وہ گفتگو کو طول دینا چاہتا تھا۔ ''اور کیا تم ہاتھوں کی لکیروں پر اعتماد کرتی ہو؟'' وہ خوش بخت کا نازک مخروطی دبیز انگلیوں والا ہاتھ پکڑ کر لکیروں پر غور کرنے لگا۔

خوش بخت کے وجود میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ گوری رنگت میں سیندور کی آمیزش نے اُسے اور پُرکشش و پُرکیف بنا دیا۔

''لگتا ہے آپ کو پامسٹری میں کافی دلچسپی ہے۔ کیسی ہے میری قسمت؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں کس کالج کی پروفیسر بن کر اس ملک کی خدمت کروں گی؟'' وہ ہمت بحال کرتے ہوئے لرزش زدہ آواز میں بولی۔

''تمہاری قسمت کی لکیر بہت صاف شفاف ہے، جو تمہاری نیک نیتی کی دلیل ہے۔ ایسے لوگ حاکمیت بھری زندگی گزارتے ہیں۔ دوسروں کی خوشی میں اُن کے لئے تسکین اور راحت پوشیدہ ہوتی ہے۔'' وہ قابلِ آفرین نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ بھی انجانے میں اُس کی آنکھوں میں اُترتی چلی گئی۔ وہ اُس کی قسمت کا حال بیان کرتا رہا اور وہ سنتی رہی۔ یکدم اُسے اپنی ذات کی گم شدگی کا احساس ہوا۔ اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور خوداعتمادی سے بولی۔



''نوشتۂ تقدیر پر یقین رکھتی ہوں۔ مگر ان ٹوٹی پھوٹی لکیروں پر کوئی بھروسہ نہیں۔ ستارے جو فلک میں محوِ گردش ہیں، وہ میری قسمت کا حال نہیں جان سکتے۔ ساعتوں اور گھڑیوں کی پیشین گوئیاں سراسر جھوٹ اور فریب ہے۔ آپ بھی ان چکروں سے نکل آئیں۔ یہ تو ہم پرست اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کی باتیں ہیں۔''

وہ اُس کی باتوں سے مرعوب تو ہوا ہی تھا، فیروز خان کے مشورے بھی بڑے ہی سچے نظر آنے لگے تھے۔

گھر میں اُس کا چرچہ رہنے کی وجہ سے آج وہ اُسے کہیں سے بھی انجان نہ لگا تھا۔ چند لمحوں کی رفاقت میں بے پناہ اپنائیت اور شناسائی کی جھلک نمایاں تھی۔ اُس کے انگ انگ میں کس قدر اپناپن تھا۔ ہر وقت اُس کے ذکرِ خیر کی وجہ سے وہ اُس کے حُسنِ کردار سے متاثر تو رہتی تھی، وقتاً فوقتاً پردے کی اوٹ سے جھانک بھی لیتی تھی۔ من کی گہرائیوں میں پسندیدگی بھی دبی ہوئی تھی، اس لئے وہ اُسے اجنبی ہرگز نہ لگا تھا۔

اُدھر جلال خان مختصر ملاقات میں ہی بہت دُور کی سوچنے لگا تھا۔ اس خاندان کی عورتوں کی شرافت اور لیاقت کا اسے اندازہ تو ہو چکا تھا۔ آج خوش بخت کو روبرو دیکھ کر اُسے ایسے لگا جیسے اسے وہ جنم جنم سے جانتا ہو۔ چھوٹی سی عمر میں اس قدر ٹھہراؤ اور دھیما پن دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اُسے ایسے ہی ساتھی کی ضرورت تھی۔ فیروز خان تو اُس کا جگری دوست اور دستار بند بھائی بن کر زندگی کے ہر شعبے میں اس کے ساتھ تھا۔ اور جلال خان یاروں کا یار تھا۔ قدردان تھا۔ وہ یہ خبر فیروز خان کو سنانے کے لئے بے تاب ضرور تھا۔ مگر کس منہ سے خوش بخت کا ہاتھ مانگے۔ کہیں فیروز لالہ اس کو حریص اور خودغرض قرار دے کر منہ نہ پھیر لیں۔ وہ اسی سوچ بچار میں اپنے گھائل شدہ دل پر خود ہی پھاہا رکھتا اور نورِ سحر کی کرنوں کا بے چینی سے انتظار کرنے لگ جاتا۔ ذہنی انتشار اور اعصابی جنگ نے اُسے حویلی سے قدرے دُور کر دیا تھا۔ اُسے خوش بخت تک رسائی کی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔

دوسری طرف خوش بخت ہر دوسرے دن صبح سویرے مردان خانے میں صفائی کرانے پہنچ جاتی کہ شاید وہ بیتے لمحے پھر سے واپس آ جائیں۔ اور سچ مچ ایک دن ویسی ہی نکھری اُجلی صبح جلال خان حویلی پہنچ گیا۔ مردان خانے کے برآمدے میں وہ اُسی کی آمد کی منتظر،

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہار سنگھار کے سائے میں کھڑی گیٹ کو تکے جا رہی تھی۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اپنائیت اور لگاوٹ سے بھرپور سراپا اُس کے سامنے تھا۔ فوجی وردی میں وہ کس قدر بارُعب اور فرض شناس افسر لگ رہا تھا۔ خوش بخت ہر زاویے سے اُس کا جائزہ لیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس نامحرم اور غیر مرد میں ایسی کون سی بات ہے کہ مجھے غیریت اور بے گانگی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اس سے کسی قسم کا ڈر یا اندیشے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ کیا وجہ ہے؟

''خوش بخت! کس سوچ میں پڑ گئی ہو؟'' وہ بے حد مانوسیت سے بولا۔

وہ چونک اُٹھی۔ ''بابا جان کو بھیجتی ہوں۔ آپ تشریف رکھیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''بابا جان سے ملنے کا وقت شام کا ہے۔ سنا ہے، آج رات ہماری ضیافت میں مغلئی کھانا پک رہا ہے۔ ویسے فیروز لالہ کا جواب نہیں۔ نہ جانے اُنہیں میری پسند کی خبر کہاں سے ہو گئی ہے؟'' وہ بات کو طول دے کر ملاقات کے وقت کو بڑھانا چاہتا تھا۔

''کھانا شام کو ہے۔ کیا آپ دن بھر یہاں ہی ٹھہریں گے؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''جی ہاں، بالکل۔ اسی مردان خانے میں۔'' وہ اُسے چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

مگر وہ خاموش رہی۔

''اگر تم کہتی ہو تو چلا جاتا ہوں۔'' جواب نہ پا کر اُس نے چھیڑا۔

''میرے کہنے یا نہ کہنے سے کیا فرق پڑے گا؟ بابا جان جانیں اور آپ۔'' وہ لاپروائی سے بولی۔ ''بچوں کے سالانہ امتحان شروع ہو چکے ہیں۔ دعا کریں، نتائج بہترین رہیں۔ سخت فکرمندی ہے۔''

''تم نے میری بات پر غور نہیں کیا۔ شام کا وقت فیروز لالہ اور صبح کا وقت......'' آنکھوں میں ہلکی سی شرارت تھی۔

''صبح کا وقت سکول کا۔'' وہ بھی شرارت سے بولی اور باہر نکل گئی۔ وہ اُس کی کالے ناگ جیسی بل کھاتی ہوئی چٹیا کو دلچسپی سے دیکھتا رہ گیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

رات کا پُرتکلف مغلئی کھانا کھا کر جلال خان عش عش کر اُٹھا۔ فیروز خان سے رہا نہ گیا۔ اُس نے دل کھول کر خوش بخت کی تعریف کر ڈالی کہ ہماری یہ بچی ہر فن مولا ہے۔ پڑھائی میں بھی لاجواب، گھرداری میں بھی خوب۔ نت نئے کھانوں کے تجربات ہم پر



آزما کر تعریف بھی بٹورتی ہے اور انعام بھی وصول کرتی ہے۔'' باپ کے لہجے میں خوشی کے ساتھ فخر بھی تھا۔ ''اماں گُل کی جھلک اس میں نظر آتی ہے جلال خان! جس گھر جائے گی، اُس گھر کے بھاگ ہی تو جاگ جائیں گے۔''

''فیروز لالہ! آج میں خود بھابی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اور اگر ممکن ہو تو خوش بخت کا بھی۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

''کیوں نہیں؟'' فیروز خان نے اپنائیت سے کہا اور صفیہ، خوش بخت کو مردان خانہ میں بلا لیا۔ وہ اپنی ماں کے ہمراہ مردان خانہ میں پہنچ گئی۔ بات کھانوں سے ہٹ کر پڑھائی کی طرف چل پڑی تھی۔ خوش بخت بے حد خود اعتمادی سے سوالات کے جوابات دیتی مکمل طور پر گفتگو میں شامل تھی۔ جلال خان بھی موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بات سے بات نکال رہا تھا۔ اُسے خوش بخت کے خیالات نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ واپسی کا تمام راستہ خوش بخت اُس کے ہوش و حواس پر چھائی رہی۔

❖❖○❖❖

دن گزرتے گئے۔

جلال خان ہر دوسرے دن علی الصبح حویلی پہنچ جاتا۔ چوکیدار بڑے گیٹ کا تالا کھول کر اپنی کوٹھری میں سو جاتا۔ خوش بخت، مردان خانہ کا دروازہ کھولتی۔ اُس سے نپی تلی باتیں کرتی اور صفیہ کو اُس کی آمد کی اطلاع دیتی اور غائب ہو جاتی۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے تلملا اُٹھتا۔ وہ جس کے لئے حاضری دیتا تھا، وہ اسے کسی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ حالانکہ خوش بخت کو وہ ہمیشہ منتظر پاتا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی حیا کو محسوس کرتا تھا۔ سال بھر یہی معمول رہا۔ پسندیدگی، ہمدردی کا روپ دھار کر محبتوں کے سفر پر گامزن ہو چکی تھی۔ فیروز خان ابھی تک جلال خان کو نیا گھر بسانے کے مشورے دے رہا تھا، جسے وہ ہنس کر ٹال جاتا تھا۔ اس میں ابھی تک دل کی خواہش کے اظہار کی ہمت نہ تھی۔ گاؤں جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ تمام توجہ خوش بخت کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔ صفیہ کو اس تعلق کا شک ہو چکا تھا۔ مگر فیروز خان ابھی تک انجان تھا۔

آج خوش بخت کے ایف اے کے نتائج کا خوشگوار دن تھا۔ ثریا نے تھرڈ اور خوش بخت نے فرسٹ ڈویژن میں ایف اے پاس کر لیا تھا۔ جلال خان کا ڈرائیور مٹھائی کے ٹوکرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



حویلی چھوڑنے صبح سویرے پہنچ گیا۔ آج بھی مردان خانہ کا دروازہ خوش بخت نے ہی کھولا تھا۔ جلال خان کو نہ پا کر وہ یک دم اُداس ہو گئی تھی۔ ڈرائیور نے اُسے ایک بند لفافہ تھماتے ہوئے کہا۔

"بی بی جی! میں اڑھائی بجے آپ کو لینے آجاؤں گا۔ آپ تیار رہیے گا۔"

وہ خاموش اُس کو ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔ لفافہ اُس نے بغل میں چھپا لیا۔ وہ اسی بے چینی کے عالم میں اپنے کمرے میں آ گئی، جہاں اُس کی تینوں بہنیں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ اُس کی نیندیں اُجڑے ہوئے سال ہونے کو آیا تھا۔ مگر دلِ نادان پوری آب و تاب سے آباد ہو چکا تھا۔ اُس نے یہ کیا روگ پال لیا تھا، جس میں نہ انکار اور نہ ہی اقرار تھا اور نہ اعتراض تھا۔ عالمِ برزخ میں شب و روز بیت رہے تھے۔ جلال خان کے اشارے کنایئے اُس کے لگاؤ اور پیار کی کھلم کھلا داستان تھے۔ وہ خوش بخت کی اندرونی کیفیت کو بھی اُس کے چہرے کی کھلی اور روشن کتاب سے پڑھ رہا تھا۔ مگر روشن ضمیری، رکھ رکھاؤ اور شرم و حیا آڑے آ کر بے کلی اور بے چینی کے بھیس میں بدل چکی تھی۔ وہ جوانی کی اس تپتی دوپہر میں جلد بازی سے آبِ حیات کا پیالہ ہونٹوں کو لگانے کے حق میں نہ تھی۔ اور جلال خان اُس کی کم عمری اور نوخیزی کا بھرم رکھتے ہوئے اپنی تمناؤں اور چاہتوں کا اظہار شعر کی صورت میں لبوں پر لاتا، کبھی آہ بن کر بکھر جاتا۔ بے تابی دونوں طرف عروج پر تھی۔ بس زبانیں گنگ تھیں۔ آج جلال خان کی طرف سے پہلا خط موصول ہونے پر وہ تذبذب کے عالم میں عقب میں کھلنے والی کھڑکی میں کھڑی خط پڑھنے لگی۔ مضمون بہت مختصر تھا۔

"میرے دل پر حکمرانی کرنے والی ملکہ کو اِک سندیسہ بھیج رہا ہوں۔
کہ میرے سینے میں تیرے تصورات کا جو غلبہ ہے۔
آج آ کر دیکھ لو...... نہ جانے کل ہم ہوں نہ ہوں۔"

"کیوں نہ ہوں؟" وہ خط کی عبارت پڑھ کر تڑپ اُٹھی۔ وہ ابھی سنبھلی بھی نہ تھی کہ ایک ہاتھ بڑھا اور خط اُس کے ہاتھوں سے نکل کر پرایا ہو گیا۔ خوف زدہ ہو کر مڑی تو صفیہ قہر آلود نظروں سے گھور رہی تھی۔ شعلہ بار آنکھوں نے اُسے مارے ندامت کے بھسم کر دیا۔ وہ بے بسی سے باہر دیکھنے لگی۔ دُور بان کی چارپائی پر چوکیدار نیم دراز تھا۔ حقے



کی نے اُس کے منہ میں تھی۔ ایک چنگاری اُبھری اور نیچے بکھرے ہوئے پھوس پر گری اور فوراً اِک شعلے میں بدل گئی۔ صفیہ نے ایک دھموکا اُس کی کمر میں دیا اور چٹیا سے پکڑ کر باہر برآمدے میں لے آئی۔ خوش بخت نے ماں کا یہ روپ کبھی نہ دیکھا تھا۔

"ہم نے آگ اور پھوس کو ایک ساتھ رکھ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ مجھے شک تو تھا ہی کہ ہو نہ ہو، کچھ کھچڑی ضرور پک رہی ہے۔ سال بھر سے تم نے میری نیندیں اور سکون غارت کر رکھا ہے۔ آج تمہارے بابا جان کو بتا کر تمہارا بندوبست کرتی ہوں۔ نامراد اور بے غیرت کہیں کی۔ تمہارے ان کرتوتوں کے اثرات ہمارے نام و ناموس کو داغ دار کر دیں گے۔" وہ آنسوؤں سے رو رہی تھی۔

"بی بی جان! کیا میری بات نہیں سنیں گی؟" وہ لاچارگی سے بولی۔

"میں نے بیٹیوں کو ممتا کے پیار میں دوستی کی چاشنی گھول کر پالا پوسا ہے۔ تم نے تمام حقیقت مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟ اب بتانے کا کیا فائدہ؟" غصہ تھوڑا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ خوش بخت نے ماں کا ہاتھ پکڑا اور مردان خانہ میں لے گئی۔

"بی بی! یہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ آپ میری بہترین دوست اور بہت دانشمند ماں ہیں۔ آپ کو میرے لفظوں کی سچائی پر یقین آ جائے گا۔" وہ ماں پر دوزانو جھک گئی اور دل کی تمام روداد سنا دی۔

"مجھے پسندیدگی پر رتی بھر اعتراض نہیں۔ مجھے یہ لیلیٰ مجنوں بننے پر اعتراض ہے۔ تم نے پیار کی پینگیں بھی ڈالیں تو کس تناور اور پھل دار درخت پر۔ تمہیں علم ہے، وہ تم سے بیس سال بڑا ہے۔" ماں کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"بی بی جان! یہ خامی پریشان کن ہرگز نہیں۔ آپ سب مجھ سے زیادہ اسے جانتے ہیں۔ اس کے کردار میں پاکیزگی اور شرافت، اس کے اعمال میں سچائی اور خلوص ہے۔ وہ اِک کھلی کتاب کے مانند ہے۔ وہ شریف النفس اور عالی مرتبہ انسان ہے۔" خوش بخت مؤدبانہ لہجے میں بول رہی تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ شخص تو بے مثال ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔" صفیہ سوچتے ہوئے بولی۔

"بی بی جان! ہمارے اپنے تمام خونی رشتے قربانی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ اب

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہمیں بیاہنے کون آئے گا؟ اس گاؤں کے لوگوں میں سے کوئی نکما، نکھٹو یا کنگلا......" وہ فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

صفیہ اُس کی سمجھ داری پر حواس باختہ ہو گئی۔ اتنی گہرائی میں سوچنے والی بچی نہ بدکردار ہو سکتی ہے، نہ غلط فیصلہ کر سکتی ہے۔" صفیہ نے اُسے سینے سے بھینچ لیا۔ "مجھے معاف کر دو میری بچی!"

"بی بی جان! ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ہم راہِ فرار میں سکون اور خوشی کو ڈھونڈتے ہیں۔ سراب سے ناطہ جوڑ کر آس کی دنیا کے باسی بن کر خود کو بے وقوف بناتے زندگی گزار دیتے ہیں۔ کیونکہ نا اُمیدی کا انجام اتنا عبرت ناک ہوتا ہے جو بڑے بڑے پختہ مغز لوگوں کے احساس کو زیر کر کے اُنہیں موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ کبھی کبھی خوش فہمی، جھوٹی تسلی اور اُمید و بیم کے سائے میں بھی ستا لینا چاہئے۔ حقیقت تو سراسر سچائی ہے۔ اور سراب نام ہے آس کا۔" لہجے میں ہمت کے ساتھ دکھ بھی نمایاں تھا۔

"زندگی کے تجربات نے تمہیں بہت دُور اندیش بنا دیا ہے خوش بخت! تم سچ کہتی ہو۔ جلال خان کی بڑھتی ہوئی عمر خامی نہیں۔ اُس کا ہمارے خاندان میں شامل ہونا اچھا شگون ہو گا۔ میں تمہارے لئے دُعا گو ہوں میری بچی! تم اڑھائی بجے تیار رہنا۔ تمہارے بابا جان کو میں دیکھ لوں گی۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ اُس کے سینے میں تصورات کی تصویر کو حقیقت کی نظر سے دیکھنا۔ زندگیوں کے فیصلے سراب کی بنیاد پر نہیں کئے جاتے۔" ماں نے نصیحتاً کہا۔

"بی بی جان! جلال خان اِک اٹل حقیقت ہے۔ شادی اِک سراب ہے۔ خوشگوار مستقبل کی آس اور حال سے فرار۔ ہے نا بی بی؟" وہ ابھی بھی سنجیدہ تھی۔ ماں نے اُس کے سر پر بوسہ دیا۔

"جلال خان کو بتا دینا کہ ماں کی اجازت سے آئی ہوں۔ یہ ضروری ہے۔" لہجے میں فکرمندی تھی۔

"بی بی! آپ ساتھ کیوں نہیں چلتیں؟ دس لوگوں کی جوابدہی سے بچ بھی جائیں گی اور آپ کو تسلی بھی رہے گی۔" خوش بخت نے ماں کو فکرمند دیکھ کر کہا۔

"ایسا کرتے ہیں بیٹا! میں ثریا کو بھی ساتھ لے لیتی ہوں۔ ہمیں بازار سے کتابیں



اور سٹیشنری کا سامان خریدنا ہے۔ تم ہمیں اُتار کر آگے چلی جانا۔ ہم اپنے کام سے فارغ ہو کر میس پہنچ جائیں گی۔ سب سے پردہ داری بھی رہے گی۔ جہاں تک تسلی کی بات ہے، مجھے تم سے زیادہ جلال خان پر اعتماد ہے۔" لہجہ پُر اعتماد تھا۔

"یہ پروگرام درست ہے۔ ورنہ مجھے سب کے سامنے سبکی ہوتی ہے۔" خوش بخت نے لمبا سانس لیا۔

اڑھائی بجے گاڑی پہنچ چکی تھی۔ آج خوش بخت کس قدر دلکش لگ رہی تھی۔ چہرے پر اطمینان اور تسکین نے اُس کے حُسن کو اور اُجاگر کر دیا تھا۔ کالے سلک کے سوٹ میں وہ جھلملاتا ہوا ستارہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ آج اپنے پیا سے ملنے جا رہی تھی۔ دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ سب سے خوش کُن بات یہ تھی کہ نہ وہ اپنوں کو دھوکا دے رہی تھی، نہ کسی جھوٹ کا سہارا لے کر اپنے ضمیر کو داغ دار کر رہی تھی۔ وہ میس کے سامنے اُتری ہی تھی کہ جلال خان سامنے نمودار ہوا۔ خوش بخت کو روبرو دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

کمرے کے اندر گھستے ہی خوش بخت کو وحشت سی محسوس ہوئی۔ در و دیوار اُداس اور غمگین تھے۔ کمرے کا بن باس تنہائی کی غمازی کر رہا تھا۔ دل اندر ہی اندر ڈوبنے لگا۔" آنکھوں میں حسرت و یاس کے بادل اُمڈ آئے۔ اُس کا پیا اس اکیلے پن میں کیسے زندگی گزار رہا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آواز پر چونکی۔

"خوش آمدید! مجھے تمہارے آنے کی اُمید نہیں تھی۔ وہ ابھی بھی حیران تھا۔ یہ سب کیسے ہوا؟" خوش بخت نے بے نیازی کا اظہار کیا تو وہ بے حد لگاوٹ سے بولا۔

"بے نیازی حد سے گزری، بندۂ پرور
کب تلک ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماویں گے، کیا"

وہ صوفے پر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ چہرے پر خوشی براجمان تھی۔ قسمت یوں یاوری کرے گی، کبھی سوچا نہ تھا۔ خوش بخت اُس کی موجودگی کے افسوں میں کھو گئی۔

"آج ہم فلسفیانہ باتیں نہیں کریں گے۔ گونگوں اور بہروں کی زبان نہیں بولیں گے۔ خوش بخت! آج دن ہے دو دلوں کے اقرار کا۔" جلال خان نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اُس نے مزاحمت نہ کی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



جلال خان ہمیشہ کی طرح گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ خوش بخت نے اُس کی اُداس آنکھوں میں جھانکا جہاں مایوسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جزبز کے عالم میں بولی۔

''میں آج تک یہ بات سمجھنے سے قاصر رہی ہوں کہ آپ بات کرتے کرتے کہاں کھو جاتے ہیں۔ خوشی دُکھوں کے گھروندوں کی نظر کیوں ہو جاتی ہے؟ میری آمد نے آپ کو حیران بھی کیا، خوش بھی کیا۔ مگر ساتھ ہی آنکھوں میں اُداسی و مایوسی کے بادل کیوں گھِر آئے ہیں؟ اس کی وجہ میں بھی جاننا چاہوں گی۔'' اُس کی مترنم نسوانی آواز میں حیرت تھی۔

''تم نے بالکل درست محسوس کیا ہے۔ بے شک میں نے اپنی محبتیں اور چاہتیں، نکھری اُجلی سحر کے نغمے، چوری چھپے کی بے ضرر ملاقاتیں، تنہائیوں کے پُر کیف لمحے، تمہاری قربت کی لطافت و شیرینی سب تمہارے نام کر دیا ہے۔ میری ہنسی، میری شادابی اور کامیابی سب تم ہی تو ہو۔ لیکن افسردہ کیوں ہو جاتا ہوں؟ دل برداشتہ ہوکر تم سے دُور ہونے کی کوشش کیوں کرنے لگ جاتا ہوں؟ کیونکہ میں تم سے وقت گزاری نہیں کر رہا۔ میرا تم سے ملنا محض کھیل تماشا نہیں۔ میں تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا تہیہ کر چکا ہوں۔ مجھے اپنی خواہش کے ردّ ہونے کا اندیشہ کھائے جا رہا ہے۔ میرے اعمال و کردار اور نیت کو تم نے اپنی سمجھ داری اور دُور اندیشی سے پرکھ تو لیا ہوگا۔ تمہارے دل میں میری کہیں نہ کہیں ضرور جگہ تو بن گئی ہوگی۔ وہ خوشی اور بے چینی کے حسین امتزاج میں گھرا ہوا تھا۔ وہ بے حد سلجھی اور مستحکم لگ رہی تھی۔ نوعمری اور بھولا پن ہونے کے ساتھ چہرے پر شستگی، متانت اور بردباری بھی نمایاں تھی، جو زندگی کے حالات اور تجربات نے اُس کے چہرے پر چسپاں کر دی تھی۔ طبیعت میں بچپنا اور چھچھورا پن نام کو نہ تھا۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں؟'' وہ بے حد ملائمت سے بولی۔ ''میرا آپ سے کوئی تعلق اور واسطہ ہے تو آپ پر بھروسہ کر کے آ گئی ہوں نا۔''

''فیروز لالہ سے بات کرنے سے پہلے میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے پیار میں صداقت اور دیانت کا دخل بے حد اہم ہے۔ تمہاری اس چھوٹی اور مختصر سی زندگی کے لمحوں میں کبھی ایسا انقلاب برپا نہ ہوا ہوگا۔ نہ ہی پیچیدہ کہانیاں پوشیدہ ہوں گی، جن کی حقیقت مجھ تک پہنچنی ضروری ہو۔ مگر میری اڑتیس سالہ زندگی عروج



وزوال سے وابستہ رہی ہے۔ بے شمار تلخ حقیقتیں، ترش سچائیاں میری زندگی کا حصہ رہی ہیں۔ میرا ساتھی بننے کا مطلب واضح رہے کہ تم بھی حصے دار ہو ان تمام تلخیوں کی۔'' جلال خان نے اُس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے بھینچ لیا۔'' خوش بخت میں نگاہیں ملانے کی ہمت ہی نہ تھی۔ وہ شرم سے لال ہو گئی۔

''خوش بخت! میں تمہاری معصومیت اور کم عمری کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتا جس سے تمہاری دل آزاری ہو اور بعد میں باہمی نااتفاقی اور غلط فہمیوں کا باعث بنے۔ میرے دل و دماغ نے تمہیں اپنا مان لیا ہے۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔ تمہاری ملاقاتوں، تمہاری یادوں کے جو دیے میں نے روشن کئے ہیں، انہیں حالات کے تند و تیز جھونکوں سے گُل نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ اُس کے چاند سے چہرے میں کھویا بولے جا رہا تھا۔ خوش بخت نے حیرت و تجسس سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا اور بے اختیار بول اُٹھی۔

''آپ کو کس بات کا خدشہ ہے؟ ایسی کون سی حقیقت ہے جس سے پردہ کشائی کرنا چاہتے ہیں؟''

''بتاؤں گا۔'' وہ زبردستی مسکرایا۔ ''آج میں نے تمہیں ان باتوں کے لئے یہاں نہیں بلایا۔ یہ باتیں تو حویلی میں آ کر بھی ہو سکتی ہیں۔ تمہاری کامیابی کی خوشی میں ہم فلم دیکھنے جائیں گے، کھانا کھائیں گے، ہنسیں گے، گائیں گے اور واپس آ جائیں گے۔ ثریا اور صفیہ بھابی آ کر آرام کریں گی۔ بیرا اُنہیں کھانا کھلا دے گا۔ تب تک ہم بھی واپس آ جائیں گے۔''

''یعنی رات کے نو بجے۔ بہت دیر ہو جائے گی۔ بی بی پریشان ہو جائیں گی۔'' وہ فکرمند ہو گئی۔

''ہم پہلے فلم کے لئے چلتے ہیں۔ چھ بجے فارغ ہو کر کھانے کے لئے چل پڑیں گے۔ بلکہ صفیہ بھابی اور ثریا کو بھی کھانے کے لئے ساتھ لے چلیں گے۔ دیری کی پریشانی چوری چھپے ملنے میں درپیش آتی ہے۔ آج تو ہم سرعام مل رہے ہیں۔ پھر کاہے کا ڈر؟''

جلال خان نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔

''سرعام ملنے کا مطلب، حدیں عبور کرنا ہرگز نہیں۔'' وہ برا مان گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"چھوٹی سی منی سی جان ڈر گئی۔" وہ ہنسنے لگا۔ "میں صفیہ بھابی کے اعتماد کو ہرگز ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ مگر دل کا کیا کروں؟ زمانہ گزر گیا، عمر بیت گئی۔ کبھی تمہارے جیسی ہستی کی قربت نصیب ہوئی نہ توجہ۔ نہ پیار کی حدت، نہ چاہ کی لگن محسوس ہوئی۔" جلال خان نے اُسے بانہوں میں بھر لیا۔ وہ نظریں جھکائے سر اُس کے سینے سے ٹکائے اُس کی دل کی تیز دھڑکن میں اپنے نام کا وِرد سننے لگی۔

❖❖○❖❖



"یہ کیسے ممکن ہے صفیہ بیگم؟...... خوش بخت بہت چھوٹی ہے۔ جلال خان کے بچوں کی ہم عمر ہو گی۔" فیروز خان نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ویسے بیوی ہمیشہ چھوٹی ہی بہتر رہتی ہے۔ بہت جلد ہر طرح کے ماحول میں کھپ کر ازدواجی زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بنا دیتی ہے۔ بچے پیدا کرنا اور اُن کو پروان چڑھانا، خاندان بھر کی اونچ نیچ اور جوار بھاٹا کے ساتھ گزر اوقات کرنا، خاوند کے مزاج اور تیوَر کو دیکھ کر اسی سانچے میں ڈھل جانا۔ یہ تمام دباؤ اسے بہت جلد بڑھاپے کی طرف لے جاتے ہیں۔ بے چاری وقت سے پہلے ہی ڈھل جاتی ہے۔ ہے تو عورت پر سراسر زیادتی۔"

"شخص بہت لاجواب ہے۔ خوبرو اور خوش اخلاق۔ کہیں سے عمر میں زیادہ بڑا معلوم نہیں ہوتا۔ ہماری خوش بخت کے ساتھ سجتا ہے۔" صفیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "آپ بھی تو مجھ سے بارہ سال بڑے ہیں۔ اچھی ہی نبھ گئی ہے نا۔ بڑی عمر کا شوہر بہت پیار اور توجہ سے رکھتا ہے بیوی کو۔ سونے پہ سہاگہ کہ ہو بھی دوسری بیوی۔"

"ہوں...... میں تمہارے دل کی بات بتاؤں، میں نے اُسے اپنے خاندان کا فرد بنانے کا پکا ارادہ کر لیا تھا، مگر مجھے اُس کے خاندانی مسائل اور حالات کا علم ہوا تو میں خاموش رہ گیا۔ بے شک جلال خان، آرمی افسر سہی۔ بہترین حسب و نسب سے تعلق رکھنے والا ہی سہی، کردار کا مکمل شاہکار اور وجیہہ سہی۔ ہے تو اڑتیس سالہ شادی شدہ دو بچوں کا باپ۔ اُس کا خاندانی ڈھانچہ پرکھنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پرانی طرز کے ایسے خاندانوں میں باہر سے دوسری بیوی کے آجانے پر گھر میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ وہ ہماری بچی کو کسی صورت قبول نہیں کریں گے۔ اُس کے بگڑے ہوئے بیٹے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"نہ جانے ہمارے ساتھ کیسا سلوک کریں؟ آگے ہماری بچیوں پر اس کے کیسے اثرات پڑیں؟ کچھ دل کو بھا نہیں رہا۔" فیروز خان بہت گہرائی میں سوچ رہا تھا۔

"آپ کی تمام باتیں درست ہیں۔ مگر یہ بھی تو سوچیں، ہم پہلے ہی لٹ چکے ہیں۔ نہ اپنا خاندان رہا، نہ گھر نہ بار رہا۔ نہ اتہ نہ پتہ۔ گم نامی کی اس زندگی میں ہماری بیٹیوں کو کون بیاہنے آئے گا؟ کسی ایرے غیرے انجان لوگوں کو رشتے دے کر ہم اپنے لئے نئے مسائل کی کتاب کھول دیں گے۔ جلال خان کا ظاہر اور باطن ایک سا ہے۔ آپ نے خود لوگوں کو چڑھتے سورج کی پوجا کرتے اور پستیوں میں بوسیدہ ہوتے دیکھا ہے۔ سچے، کھرے اور دیانت داری کا دعویٰ کرنے والے لوگوں کو بے انصافی اور زیادتی سے دوسروں کے حقوق کو پامال کرتے اور مال و دولت، عزت و حرمت پر ڈاکہ ڈالتے دیکھا ہے۔ آپ مردم شناس اور دُور اندیش انسان ہیں۔ جس نے ہماری بچی کی حفاظت کی، دوسری کو زندہ سلامت ڈھونڈ نکالا، وہ ہماری عزت کو ہماری بے بسی اور مجبوری کی بھینٹ چڑھا سکتا تھا۔ اُس کو اختیار حاصل تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اُس میں خوفِ خدا اور انسانیت سے پیار اور خدمتِ خلق کا جذبہ ہے۔ اُس نے اس گاؤں کو کس محنت سے آباد کیا۔ بڑے بڑے بنگلے اور حویلیاں اُس نے حق داروں کو سونپ کر کارِ عظیم کیا ہے۔ میں تعریف کرتی ہوں اُس ماں کی، جس نے جلال خان جیسے بیٹے کو جنم دیا۔ اس کے دس بچے اور تین بیویاں بھی ہوں، تب بھی چوتھی بیوی میری بیٹی ہونے پر مجھے فخر ہوگا۔ اور ہمارے خاندان کی عزت افزائی بھی ہوگی۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اُس کی شادی اور بچوں کا ڈھنڈورا پٹواتے پھریں۔ اس مسئلے کو صیغۂ راز میں رکھا جا سکتا ہے۔ کہاں سرحد اور کہاں پنجاب۔ بہت فاصلہ ہے بھید اور انکشاف میں۔ اماں گل بھی اس رشتے کے فوائد فوراً بھانپ جائیں گی۔" صفیہ نے جیسے آخری حتمی فیصلہ سنا دیا۔

"اور کیا کیا فوائد ہیں؟ ذرا میں بھی سنوں۔" فیروز خان کے لہجے میں تجسس تھا۔

"خان صاحب! آپ یہاں بالکل تنہا ہیں۔ تمام خونی رشتے، دوست احباب ختم ہو گئے۔ اس انسان نما فرشتے کی قربت اور مدد میں آپ کی زندگی تنہائیوں اور پریشانیوں کے گھروندوں سے نکل آئے گی۔ یہ آپ کا داہنا بازو بن کر ہمارے تمام نجی مسائل کو حل کرنے میں بہترین کردار ادا کر سکتا ہے۔" صفیہ بے حد سنجیدہ تھی۔



"مجھے تمہاری باتوں میں طمع و لالچ اور خود غرضی کی بُو آ رہی ہے۔" فیروز خان تھوڑا سا گھبرا گیا کہ سچ مچ کہیں ہم اپنے مفاد کی خاطر اپنی ہی اولاد کو قربان تو نہیں کر رہے۔

"ایسا ہرگز نہیں۔ میں ماں ہوں، میرے لئے اپنی اولاد کی بہتری اوّلین درجہ رکھتی ہے۔ مجھے خوش بخت کی زندگی مہارانیوں جیسی نظر آ رہی ہے۔ آرمی آفیسر کی بیوی ہونا معمولی بات نہیں۔ بڑے ٹھسکے کی اور بڑی پُرسکون اور آرام دہ زندگی ہوگی میری بچی کی۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ فوج کی شان و شوکت کا تو جواب نہیں۔" لہجے میں خوشی کا عنصر نمایاں تھا۔

"تمہاری ہر دلیل سے میں اتفاق کرتا ہوں۔ مگر یہ بات ذہن نشین کر لو کہ کوئی مرد اپنے خاندان سے کنارہ کشی اختیار کرنا پسند نہیں کرتا۔ خاندان اس کی جڑیں ہیں۔ یہی جڑیں اُسے مضبوط و مستحکم بناتی ہیں۔ جڑوں کو کاٹ دیا جائے تو پژمردگی اور مردنی چھا جاتی ہے۔ ماحول میں خزاں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ کیا ہم یہ چاہیں گے کہ ہمارا محسن اور ہمدرد ہماری طرف سے نئی آزمائش اور نئی اُلجھنوں سے دوچار ہو جائے؟" فیروز خان کو خدشات نے گھیر رکھا تھا۔

"ہر رشتے کا اپنا مقام اور تقدس ہوتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ وہ اپنے خاندان اور بچوں سے قطع تعلق کر کے صرف ہمارا ہو کر رہ جائے۔ رشتوں کے اس ناپ تول میں اُس کا ترازو پورا انصاف کرے گا۔ مجھے اس پر اعتماد ہے۔ وہ کل کا بچہ تو ہے نہیں۔" صفیہ سمجھانے پر اُتری ہوئی تھی۔ "میں خوش بخت سے بھی مشورہ لے لیتی ہوں۔"

"مشورہ ان بچیوں سے لیا جاتا ہے جو پڑھ لکھ کر زندگی کی تمام تلخ و ترش اور میٹھی و نمکین حقیقتوں سے روشناس ہو جاتی ہیں۔ وہ نہ تو جلال خان کو جانتی ہے نہ ہی دنیا کے کسی ہیر پھیر سے آشنا ہے۔ بدقسمتی سے ہم نے انہیں زندگی کے فیصلے کرنے کے قابل بنایا ہی نہیں۔ ہم نے انسانوں کی فہرست میں ان کا نام لکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ہم پڑھے لکھے لوگ بھی معاشرے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے بے بس، ناتواں اور لاغر بیٹیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر آنکھیں اور کان بند کر لینے میں ہی بہتری سمجھتے ہیں۔ چشم پوشی کو عقلمندی کا نام دے کر خود کو بے وقوف بنانے میں کتنے ماہر ہیں ہم۔ بیٹی کی ذمہ داری سے جلد از جلد فارغ ہونے والے والدین کو ہمارا معاشرہ کس قدر سراہتا ہے۔ پھر

www.iqbalkalmati.blogspot.com



فرائض سے سبکدوش ہو کر اسے مُڑ کر نہیں دیکھتے۔ تمام زیادتیوں اور بے انصافیوں کی روح فرسا داستان یہاں سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں قصور وار کون ٹھہرا؟ تم اور میں۔ بتاؤ کہ کیا تم نے ماں ہونے کے ناطے اپنی بچی کی ایسی تربیت کی ہے کہ آج وہ اپنے لئے بہترین فیصلہ کر سکے؟'' فیروز خان جذباتی ہو گیا تھا۔

''میری بچیوں نے چھوٹی عمر میں دنیا کے بے شمار رنگ روپ دیکھے ہیں۔ وہ اپنے لئے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کے قابل ہیں۔ ان کے دماغ میں اماں گل نے اپنا تجربہ اور میں نے اپنا صبر گھول کر ڈال دیا ہے۔ میں آپ سے سوال کرتی ہوں کہ کیا آپ نے انہیں اس معاشرے سے ٹکر لینے اور سر اٹھا کر زندگی گزارنے کی صلاحیت سونپی ہے؟ زندگی کے ان تاریک اور خاردار راستوں پر چلنے کے لئے انہیں تیار کیا ہے؟ وہ اس اسیری میں کیا پڑھیں گی؟ کیا سیکھیں گی؟ ڈر کر زندگی گزارنا خانوں کی فطرت میں نہیں۔'' صفیہ نہ چاہتے ہوئے طعنہ مار گئی۔

''تم سچ کہتی ہو صفیہ! مجھے جوان بھائیوں، جوان بہن اور خان صاحب کی شہادتوں نے بزدل اور ڈرپوک بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں بیٹی کے نصیب کا فیصلہ کرنے میں ہچکچا رہا ہوں۔''

کافی دیر سوچ بچار ہوتی رہی۔ آخر فیروز خان نے صفیہ کو خوش بخت کا مشورہ لینے کی اجازت دے دی۔ صفیہ کے لئے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔

''آپ مطمئن رہیں۔ ہم اپنی بیٹی کو کسی حرص و لالچ کا نشانہ نہیں بنا رہے۔ رشتوں کی بنیاد دونوں طرفین سے مفاد پرستی اور خودغرضی پر رکھی جاتی ہے۔ صرف پیمانے کا حجم اپنی اپنی حیثیت اور ضرورت کے مطابق ہوتا ہے۔ میں نے اس رشتے کو ہر زاویے سے پرکھا ہے۔ آپ اماں گل سے بات کریں۔ میں خوش بخت کے خیالات جاننے کی کوشش کرتی ہوں'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ خوش بخت کی سوچ تو وہ پہلے ہی پڑھ چکی تھی۔ کیا پوچھتی؟ اماں گل نے بھی بال دھوپ میں سفید نہیں کئے تھے۔ بیٹے کی دُور اندیشی کو سراہنے لگی۔ جلال کی پہلی شادی اور بچے دُور کہیں بہت دُور پسِ منظر میں جا چھپے۔

''جلال خان! شادی کرنے کا فیصلہ کافی تسلی بخش ہے۔ لیکن مجھے یہ علم نہ تھا کہ تمہارے فیصلے کے بعد میرا کیا کردار ہوگا۔'' فیروز خان کافی سنجیدہ تھا۔



''فیروز لالہ! آپ کا کردار ایک بڑے بھائی سے منسلک ہو سکتا ہے۔ آپ کا ہر فیصلہ سر آنکھوں پر۔'' وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''جلال خان! تمہاری خواہش کا اظہار ہی میرا فیصلہ ہے۔ تم نے آج تک میرے لئے بہترین ہی سوچا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آج کے فیصلے میں بھی میرے لئے بہتری ہی ہوگی۔ اس کا مجھے پورا بھروسہ ہے۔'' فیروز خان نے بااعتماد لہجے میں کہا۔

''آپ کو کبھی پچھتاوا نہ ہوگا'' اُس نے نظریں جھکائے ہوئے جواب دیا۔ فیروز خان اُسے لے کر اماں گل کے کمرے میں آ گیا۔ وہاں صفیہ بھی براجمان تھی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں، خدشات ظاہر کرنے کے بعد آپس میں وعدے وعید ہوئے اور سب نے صدقِ دل سے ہاتھ بلند کر کے خوش بخت اور جلال خان کی کامیاب اور خوشگوار زندگی کے لئے دعا مانگی۔ آنکھیں خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات سے اشکبار تھیں۔ بس اتنی سی بات تھی کہ ایک لفظ کی دائیگی نے بیٹی پرائی کر دی۔ اور آج سے وہ جلال خان کی امانت ٹھہرائی گئی۔ جلال خان نے گاڑی سے مٹھائی نکلوائی، جو حویلی میں تقسیم ہو گئی۔ اور یہ خبر چھیڑ خانیوں سمیت خوش بخت کے کانوں میں میٹھا رس گھول گئی۔ گاؤں کے اولوالالباب نے فیروز کو بہت دُور اندیش اور جہاندیدہ گردانا اور جلال خان کی شخصیت کو خوب سراہا جانے لگا۔ اس کے برعکس جوان لڑکیوں کی ماؤں میں حسد و جلن اور بغض و عناد کی لہر دوڑ گئی۔ کسی نے عشق و محبت کی کہانی گھڑی، کسی نے باپ کی چالاکی اور ہوشیاری کا ڈھنڈورا پٹوایا۔ بھانت بھانت کے لوگوں کی کڑوی کسیلی باتیں حویلی کی فضا کو آلودہ نہ کر سکیں۔ ماحول میں یک دم تبدیلی رونما ہوئی۔ چارسُو خوشی اور چھیڑ خانیوں نے بسیرا کر لیا۔ شہر کے چکر لگنے لگے۔ بچوں کے کپڑے بننے لگے۔

خواتین اور لڑکیوں میں اپنی جگہ مقابلہ بازی چل رہی تھی۔ خردہ فروش ہر وقت گیٹ کے سامنے منڈلاتے رہتے۔ سنار سونے چاندی کے زیورات لئے مردان خانہ میں گھنٹوں گزارتے۔ کنجیاں رنگ برنگی کانچ کی چوڑیوں کے ٹوکرے سر پر رکھے صبح سویرے برآمدے میں آ کر بیٹھ جاتیں۔ اُن کے آس پاس گھنٹوں شغل لگا رہتا۔ اماں گل مسکراہٹوں اور قہقہوں سے لبریز حویلی کو نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کے ٹونے ٹوٹکے کرتیں اور چار قُل پڑھ کر سب پر دم کر کے مطمئن ہو جاتیں۔ اسکول تعطیلات کی وجہ سے بند ہو چکے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



سب بے فکری کے عالم میں شادی کی تیاری میں لطف اندوز ہو رہے تھے۔

جلال خان کو اپنی قسمت پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ خوش بخت کے بارے میں سوچ کر جھوم اُٹھتا۔ لیکن کئی دفعہ بیوی کی صورت میں عورت کا گھناؤنا اور پیچیدہ رُوپ اُسے بے کل کر دیتا۔ وہ بیس سالہ بے وقوف اور ناسمجھ لڑکا تو نہیں تھا کہ صرف خوش بخت کے حُسن پر فریفتہ ہو جاتا۔ وہ اڑتیس سالہ تجربہ کار مرد تھا۔ اُس نے خوش بخت کی شخصیت میں بے پناہ خوبیوں کو اپنی نظر سے پرکھا تھا۔ یہ گڈے گڈی کا کھیل تو تھا نہیں۔ دو زندگیوں کے یکجا ہونے کا نام، دو جسموں کے ایک ہو جانے کا نام، سوچوں اور خیالوں کی مطابقت کا نام تھا۔ دو روحوں کی خوشیوں، مسرتوں، غموں اور دُکھوں کے محسوس کرنے اور بانٹنے کا نام تھا۔ مناسبت اور رفاقت کا یہ رشتہ کتنا پوتر اور کتنا ہی مستحکم تھا۔ وہ اس کی اہمیت کو ہمیشہ سے اوّلیت دیتا تھا۔ وہ خوش بخت سے اپنی بیتی ہوئی زندگی کے ہر لمحے سے بہرہ ور کر کے اس رشتے کو سچائی کی بنیاد پر پرکھنے کا قائل تھا۔ وہ خوش بخت سے ملنے کے حیلے بہانے ڈھونڈتا رہتا۔ آخر ایک دن تمام رسموں اور رواجوں کو بالائے طاق رکھ کے اُس نے اپنی خواہش کا اظہار صفیہ سے کر دیا تو وہ فوراً مان گئی۔ اُسے اس میں رتی بھر قباحت کا احساس نہ ہوا۔ شہر کے چکر روزانہ تو لگ ہی رہے تھے۔ سردیوں کی خوب صورت دوپہر میں صفیہ، خوش بخت کو میس چھوڑ کر بازار چلی گئی۔

جلال خان اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کس قدر معصوم اور مطمئن لگ رہی تھی۔ جس سے اُس کا دودھیا حُسن، ٹھاٹھیں مارتا جوبن بے حد نکھرا نکھرا اور اُجلا لگ رہا تھا۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں پر دلفریب مسکان اور جھیل جیسی گہری شربتی آنکھوں میں شرم و حیا کی جان لیوا چمک نمایاں تھی۔

اُس کی گہری پیار بھری نظروں کی تپش سے وہ گھبرا کر بے اختیار ہو کر بول اُٹھی۔

"آج بلانے کا مقصد؟" چہرہ سوالیہ نشان بن چکا تھا۔

"دلِ بے چین کو تم سے کچھ کہنا ہے
گزارش ہے کہ کہنے کی اجازت دے دو
تیرا کاجل بن کر تیری آنکھوں میں رہنا ہے
گزارش ہے کہ اپنی رفاقت دے دو"



وہ اُس کے اتنے قریب تھا کہ وہ اُس کے وجود کی خوشبو کو محسوس کر رہی تھی۔

"فوجی کو شعر و شاعری سے کیا لگے؟" نسوانی ہنسی کے جلترنگ اُس کے کمرے میں پھیل گئے۔ اِس مسحور کُن ساز میں وہ کھو سا گیا۔

"آپ کو تو ٹینک چلانے آتے ہیں، بندوق اُٹھانی آتی ہے۔ یہ پیار محبت، عشق معاشقہ اور ہجر و وصال آپ کے بس کا روگ نہیں۔" وہ ابھی بھی ازراہِ مذاق ہنسے جا رہی تھی۔

"کیوں بھئی، میرے سینے میں دل کی جگہ ٹینک اور بندوقیں تو فٹ نہیں ہیں، دل ہے۔ گوشت پوست اور خون کا لوتھڑا۔ جس میں تمہیں دیکھ کر جذبات بھی اُبھرے ہیں اور پا لینے کی تمناؤں نے بھی بسیرا کیا تھا۔ اور اب فتح مندی پر نازاں بھی ہے۔ تم اپنی بتاؤ جاناں! تمہارا دل تو حرم ہونا چاہئے میری یادوں کا۔ کیونکہ تم تو فوجی نہیں ہونا۔" وہ اُسے چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

"فوجی کی رفیق تو ہوں نا۔" وہ شرما کر بولی۔ جلال خان کے چہرے پر ایک دم سیاہ بادل سے چھائے اور وہ خاموشی سے اس کو دیکھنے لگا کہ اسے کیا بتاؤں کہ میری زندگی میں تم سے پہلے بھی ایک ساتھی آیا تھا۔

"آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ آپ کی ہنسی میں مرجھائے ہوئے زرد پھولوں کی اُداسی، قہقہوں میں بہتے ہوئے جھرنوں کے رکاؤ کی شوریدگی مجھے تجسس میں ڈال دیتی ہے۔ مجھے کئی دفعہ آپ کی آنکھوں میں کالے بادلوں کی سیاہی سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ میں آپ کی بیتی ہوئی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ اُس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"اتنی سی عمر میں تم نے یہ جہاندیدگی کہاں سے سیکھ لی ہے خوش بخت؟ میں تم سے ملنے کے بعد ہر دفعہ اپنی قسمت پر تفاخر سے مسرور ہو جاتا ہوں۔" اس نے اس کے لمبے سیاہ بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے ستائش بھرے لہجے میں کہا۔

وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹ گئی اور ہنستے ہوئے بولی۔ "آپ کی سادگی میں بے پناہ ٹیڑھا پن ہے۔"

"کیوں نہ ہو۔ قصور تمہارا ہے۔ میرا نہیں۔ تمہاری انہی اداؤں نے میرے وجود میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com



محبت کا بیج بویا ہے۔ زمین جتنی زرخیز ہو، کاشت اُتنی ہی لاجواب ہوتی ہے۔ آؤ تناور اور مضبوط درخت کے سائے میں جوانی کی کڑکتی دوپہر میں چند لمحے ستا لو۔ خوش بخت! تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ یقین کرنا مجھ پر۔'' وہ چھیڑتے ہوئے سوچ میں گم ہو گیا۔

وہ اُس کی چھیڑ خانیوں سے محظوظ ہونے کے ساتھ بہت محتاط بھی تھی۔ اُس کے کانوں میں ماں کی نصیحت گونج رہی تھی۔

''خوش بخت! یہ وقت ہے تمہیں جلال خان کے دل میں جگہ بنانے اور اپنی ذات کی حرمت و تکریم کرانے کا۔ کمزور عورت کبھی سر اُٹھا کر، سینہ تان کر نہیں چل سکتی۔ پچھتاوے اور کم مائیگی کی نحوست اُسے جینے نہیں دیتی۔ اپنا خیال رکھنا۔''

''آپ پھر کس سوچ میں کھو گئے ہیں؟ ایسی کون سی بات ہے جس نے آپ کو مضطرب کر رکھا ہے؟'' وہ قریب ہو کر بولی۔

''کیا سننے کی ہمت رکھتی ہو؟'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''سننا پڑے گا۔ جو بوجھ آپ اپنے ضمیر پر لئے پھر رہے ہیں، ہو سکتا ہے کم ہو جائے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

جلال خان نے رائٹنگ ٹیبل سے ایک لفافہ اُٹھایا اور اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں کسی دھوکے یا فریب میں رکھ کر اپنی نئی زندگی کی شروعات نہیں کرنا چاہتا۔''

خوش بخت نے بے چینی سے خط کھولا اور پڑھنے لگی۔

''جلال خان! تم کیوں نہیں سمجھتے کہ ہم ایک ندی کے دو کنارے ہیں۔ ہم فاصلے میں چل سکتے ہیں، اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ میں نے ہمیشہ شادی کا مشورہ دیا ہے۔ اپنے جیسی کسی گوری کو لے آؤ جو تمہاری ضروریات پوری کر سکے۔ میں نے اولاد کو تمہاری غیر موجودگی میں پال کر جوان کر لیا ہے، جو تمہاری خبر لینے کو کافی ہیں۔ میرا کچھ نہیں بگڑا جلال خان! کاش کہ تم میری سن لیتے۔ تمہاری یہاں ضرورت تھی، نہ کہ میری وہاں۔ تمہیں کتنی دفعہ بتاؤں کہ مجھے نفرت ہے اِک فرنگی سپاہی سے اور اس کے قانون اور اصولوں سے۔ میں تمہارے ساتھ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ آج کے بعد مجھے خط لکھنے کی ہمت مت کرنا۔ مجھے اپنی زندگی میں خوش اور مطمئن رہنے دو۔'' (کلثوم)



اُسے یوں لگا جیسے آکاش کی رفعتوں سے منہ کے بل زمین پر آ گری ہو۔ خط ہاتھ سے چھوٹ کر قدم بوسی کرنے لگا۔ وہ غم و غصہ کے ملے جلے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

جلال خان نے آگے بڑھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ رم جھم کرتے آنسوؤں نے اُس کے دامن کو بھگو دیا۔ دل سینے سے نکلنے کو بے تاب اور روح وجود کی اسیری سے آزاد ہونے کو بے چین ہو گئی۔ اُس نے بے بسی سے جلال خان کو دیکھا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور مردنی آواز میں شکایت کی۔

''آپ نے عرشِ بریں کی وسعتوں اور بلندیوں کا ذائقہ مجھ سے چھین لیا ہے خان صاحب! کس گناہ کی پاداش میں مجھے یہ سزا دی ہے؟ میرے خاندان کی عزت کا ہی بھرم رکھ لیا ہوتا۔ میری کم عمری کی لاج ہی رکھ لی ہوتی۔''

''خوش بخت! میں نے بتانے میں دیر کر دی۔ مجھے معاف کر دینا۔ فیصلہ کرنے میں تم حق بجانب ہو میری جان! بے شک میں تمہیں کھو کر خوشی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اپنے ضمیر کی لعنت و ملامت کے ساتھ میں زندگی نہیں گزار سکتا۔ میں مطمئن ضرور رہوں گا کہ کم از کم میں نے تمہیں نا اہل اور بے وقوف سمجھ کر تمہاری انا و خودداری کی توہین نہیں کی۔'' وہ گہرے تاسف سے بولا۔ اور پھر اُس نے اپنی بیتی ہوئی زندگی کا ہر لمحہ اُس کے گوش گزار دیا۔

''خوش بخت! تمہارے سوچنے کی اور فیصلہ کرنے کی تمام راہیں کھلی ہیں۔ فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بات ذہن نشین کر لینا کہ میری عمر میں مرد بہت مستقل مزاج اور ارادوں میں مستحکم ہو جاتے ہیں۔ میرے دل میں جینے کی اُمنگ نے جو انگڑائی لی ہے، سوچ میں خواہشات نے ڈیرے جمائے ہیں، میری اس خزاں رسیدہ زندگی کے دروازے پر شادمانیاں اور کامرانیاں دستک دینے کو تیار تھیں۔ کیا میں یہ سب منوں مٹی تلے دبا کر اسی مضبوط قلعے کے حصار میں مقید ہو کر کس آس کو سینے سے لگا کر زندہ رہنے کی تمنا کروں گا؟ وہ قید جس میں، میں نے اپنی عمر کے بہترین سال گھٹ گھٹ کر گزارے ہیں، اُس سے رہائی حاصل کرنے کے بعد پھر سے قیدِ بامشقت کی سزا کو قبول کر لینا میرے لئے جان لیوا ثابت ہو گا۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com



لہجے میں افسردگی اور نااُمیدی عود کر آئی تھی۔ وہ خاموشی سے اُس کی باتیں سن رہی تھی۔ آنکھیں واویلا کر رہی تھیں۔ اُس کی درد بھری لمبی سرگزشت نے دل پر کچوکے بھی تو لگا دیئے تھے۔ لیکن جلال کی بے پناہ محبت اور لگن کا مطلب بھی سمجھ آ چکا تھا۔ ایسی اہمیت جو مہارانیوں کے نصیب کا حصہ ہوتی ہے، اس کا اصل سامنے آ کر اس کے خوابوں کو چکنا چُور کر گیا تھا۔ والدین پر ناراضگی اور غصے کے ساتھ حیرت و تجسس اس حد تک غلبہ پا چکا تھا کہ وہ چیخیں مار کر زمانے کو اکٹھا کرے اور اس ناانصافی اور زیادتی پر پوری کائنات کو ماتم کدہ بنا کر تمام تر ہمدردیاں آغوش میں بھر کر مطمئن ہو جائے اور ثابت کر دے کہ وہ جانوروں کے مانند بے حس اور بے زبان ہرگز نہیں۔

''سوتن اور سوتیلی ماں...... دونوں رشتے زہر آلود، قابلِ حقارت اور قابلِ ندامت۔'' اُس نے خود کلامی پر اکتفا کیا۔

''خوش بخت! میری طرف دیکھو۔'' جلال خان نے اُس کا جھکا سر اوپر کیا۔ بے بسی اور لاچارگی سے بھرپور نظریں جلال خان کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ کس قدر بے ضرر اور بے عذر لگ رہی تھی۔

اُس کی پھوپھی کا بیٹا رحیم خان اس سے تین سال بڑا تھا۔ اُس کے کھو جانے کا صدمہ کم نہ تھا، اب قسمت نے پھر سے جھٹکا دے کر اُسے بکھیر دیا تھا۔

جلال خان کو یوں لگا جیسے آج خوش بخت اُسے الوداع کہہ کر ہمیشہ کے لئے اُس سے دُور چلی جائے گی۔ مگر ذہنی طور پر وہ پُرسکون تھا۔ خوش بخت کا عورت ہونا کوئی جرم تو نہیں تھا۔ وہ بھی ہر طرح کے احساسات و جذبات کا پیکر تھی۔ اُسے اپنی زندگی کو اپنے خیالات کے مطابق ڈھالنے کا پورا حق تھا۔ بے شک وہ کم عمر تھی مگر سمجھ داری اور دُور اندیشی میں کہیں بھی کمی نہ تھی۔ وہ سر جھکائے مجرم کی طرح اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔

''خوش بخت! کچھ تو کہو۔'' جلال خان اُس کی خاموشی پر تڑپ اُٹھا۔

''کیا کہوں؟ محبتیں اور چاہتیں ایثار کی طلب گار ہیں۔'' وہ اُس کے درد کو محسوس کر کے زبردستی مسکرا دی۔

''تم کس قدر عظیم ہو خوش بخت! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ جس محبت میں سوچ ہو، جس عشق میں اندھاپن ہو، وہ سراب ہے۔ سراسر دھوکا ہے۔'' اُس کا انداز کسی پرستار



سے کم نہ تھا۔

''کاش آپ کا کرب آڑے نہ آ جاتا۔'' وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''پھر بھی، مجھے سوچنے کا موقع تو دیں۔''

''اگر تمہیں میری سچائی پر یقین ہے تو فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔'' وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ ''اگر اقرار کے بجائے انکار ہے تو پھر اس رشتے کا شروعات میں ہی ختم ہو جانا بہتر ہے۔ کیونکہ میاں بیوی کے رشتے میں اعتماد اور صداقت ہی تو اِک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اگر تمہارے اور میرے درمیان بھروسے کی کمی ہے تو کامیابی کا تصور ہی نادانی ہے۔''

خوش بخت نے کوئی جواب نہ دیا۔ کسی عہد و پیمان کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اُس نے اپنا معاملہ وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

''وقت بہت بڑا منصف ہے۔ مجھے ان حیران کن حالات سے باہر آنے کا وقت تو دیں۔'' اُس نے ایک ثانیے کو جلال خان کی طرف سر اُٹھا کر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں کا فسوں تھا کہ وہ اُسے دیکھتی رہ گئی۔

❖❖○❖❖

رات تینوں پر کس قدر بھاری تھی۔ خوش بخت نے کروٹیں بدلتے، کمرے میں ٹہلتے، آنسو بہاتے کبھی اعتراض کیا، کبھی راضی بہ رضا کا سہارا لیا۔ صفیہ، بیٹی کو دی گئی تربیت پر مطمئن ہوتی، کبھی اس کی طرف سے دھاکے کے خدشے میں مبتلا ہو کر بے بس ہو جاتی۔

جلال خان ہر آہٹ پر انکار کے سندیسے کے خوف سے چونک اُٹھتا۔ فیروز خان کو اندرونی حالات سے باخبر کر کے مزید پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔

گزرے لمحوں کے ساتھ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ جلال خان کو تو دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اُسے اپنی انا اور خودداری کے مجروح ہونے کی فکر کم، خوش بخت کی تسلی و تشفی کا غم زیادہ تھا۔

نئی نسل کی پہلی شادی اپنی تمام تر اہمیت لئے براجمان تھی۔ سب خوشی کے سرور میں جھوم رہے تھے۔ حویلی کو چونا پالش کیا گیا۔ پرانے اور خراب فرنیچر کی جگہ سادہ اور نفیس فرنیچر نے لے لی۔ مردان خانہ کے باہر وسیع و عریض لان بنا کر گلاب، موتیا اور نرگس

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کے پھولوں کی کیاریاں تشکیل دی گئیں۔ سن صفر کے ماڈل کی گاڑی کی جگہ بہترین گاڑی نے لے لی۔ جس کے لئے چھپر کی جگہ گیراج بنوایا گیا۔ چوکیدار کی کوٹھری پکے کمرے میں تبدیل ہوئی۔ اُس کی دعائیں ہر آتے جاتے کو سننے میں آتیں۔

''دم قدم دی خیر ہووے۔ خاناں دا گھر گلزار ہووے۔''

سب اُس کے پاس سے مسکرا کر گزر جاتے۔

صحن کے وسط میں پرانے جامن کے دو درخت اپنی مضبوطی اور گزرے ہوئے سالوں کی داستان پیش کر رہے تھے۔ پرانی بیری اور بکھین تمام نوکرانیوں کے سائے کا وسیلہ بنی کھڑی تھیں۔ اماں گل کے حکم پر ان درختوں پر پینگیں باندھ دی گئیں۔ حویلی میں خوشیوں کا سماں تو اب بنا تھا۔ بچے اپنی اپنی باری تو لیتے مگر ناگواری اور بے صبری میں لڑنے سے باز نہ آتے۔ اماں گل سب کو صبر اور استقلال کی تلقین کرتیں۔ ایک دوسرے کی خواہش کا احترام، زیادتی پر جبر اور ضبط کا سبق دیتیں۔ عورتیں اور بچیاں ایک دوسرے کے مشورے سے کپڑوں پر گوٹے کناریاں، دوپٹوں پر کروشیے کی بیل اور پھول بوٹے بنانے میں مصروف تھے۔ ووکیشنل سنٹر کی تمام شاگرد صبح سویرے حویلی پہنچ جاتیں اور شام کو اپنی اُجرت لے کر خوشی سے پھولی نہ سماتیں۔ چھیڑ خانیاں، گپ شپ اور پروگراموں پر طویل بحثیں اور مباحثے ماحول کو خوشگوار اور پُر رونق بنائے ہوئے تھے۔

مایوں کی رسم کی شام اپنی تمام تر رونق کے ساتھ آ چکی تھی۔ گانے، لڈیاں، ڈانس زوروں پر تھے۔ ڈومنیاں اپنی کرخت آواز کا جادو جگانے اور پیسہ بٹورنے کی اداؤں میں مگن تھیں۔ حویلی کے مکینوں کی آہوں اور سسکیوں کی جگہ ہنسی اور قہقہوں نے لے لی تھی۔ خوش بخت اپنی جگہ خوشی کے ساتھ رنجیدہ بھی تھی۔

❖❖❖○❖❖❖

مایوں کی چوکی کو پیلے پھولوں سے خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ جلال خان غیر متوقع حویلی پہنچ گیا۔ وہ خوش بخت سے ملنے اور اس کے چہرے کے اثرات سے نتیجہ اخذ کرنے کو آیا تھا کہ وہ کتنی مطمئن اور کتنی خوف زدہ ہے۔ مایوں کے پیلے جوڑے میں ملبوس وہ چودھویں کے چاند کی طرح چارسُو ضوفشانی کرتی ہوئی حویلی کی زینت اور توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔



''ماشاء اللہ!'' وہ تحسین بھری نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔ ''رسم و رواج کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مجھے یہاں نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن میں تمہیں اس روپ میں دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن یہ پردہ داری تو اور ظلم ڈھا گئی۔ تجسس بڑھ سا گیا ہے۔''

وہ گھونگھٹ نکالے کھڑی اندر ہی اندر مسکرا رہی تھی۔

''خوش بخت! اس فیصلے میں تمہاری رضامندی شاملِ حال ہے نا؟ گھونگھٹ اُلٹ کر مجھے اشارتاً ہی سمجھا دو نا۔'' لہجے میں انتہا کی بے قراری تھی۔ مگر دوسری طرف خاموشی کا پہرہ تھا۔

''میں کسی زیادتی وظلم اور تمہاری کسی بھی مجبوری اور بے بسی کا فائدہ اُٹھانے کے حق میں ہرگز نہیں۔ مجھے اپنا غمگسار اور رازدار سمجھ کر بتا دو۔ بے شک تمہیں پا کر یوں کھو جانے کا احساس میری باقی ماندہ زندگی کو دُکھوں اور غموں کی گہری کھائیوں میں دھکیل دے گا۔ میرے دل میں جو تمہاری تصویر چسپاں ہو گئی ہے، وہ حالات اور وقت سے بھی دُھندلی نہیں پڑے گی۔ تمہارے ساتھ بیتے ہوئے چند لمحے میری متاعِ حیات ہوں گے۔ وہ معصوم اور پاکیزہ لمحے مجھے ہر وقت تمہارے قریب رکھیں گے۔'' وہ اُس کا صاف شفاف خوب صورت ہاتھ پکڑ کر بول رہا تھا۔ مگر خاموشی اپنی جگہ قائم تھی۔

''خوش بخت! کچھ تو بولو۔ کوئی تو اعتراض کرو میری حرکتوں پر۔ مجھے لعن طعن اور گالیوں سے نوازو۔ مجھے کوسو اور بد دعائیں میری جھولی میں ڈال دو۔ کچھ تو کہو۔'' وہ تڑپ اُٹھا تھا۔ ''یا پھر میری سچائی کا اقرار کر لو، میری خواہشوں اور تمناؤں کی لاج ہی رکھ لو۔ میری محبتوں کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے یقین ہی کر لو۔''

''مجھے آپ کی ذات پر پورا پورا بھروسہ ہے۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''تو پھر یہ چپ کی مار کیوں؟ لاتعلقی اور خفگی کا اظہار کس لئے؟ تم والدین کی ظاہرانہ خوشی کے پسِ پردہ احساسات سے باخبر ہو کیا؟'' لہجے میں حیرت تھی۔

''میری خاموشی سوچی سمجھی سکیم کے تحت تو نہیں ہوئی۔ ایسا غیر اراری طور پر ہوا ہے۔ شادی لڑکی کے لئے بہت بڑا انقلاب ہے۔ اس کے نتائج کی غیر یقینی اور لاعلمی کی وجہ سے دل میں کچھ خدشات، کچھ خوف دم بدم اُبھرتے رہتے ہیں۔ کچھ لڑکیاں چیخ چلا کر ان کا ذکر یا اظہار کرنے میں اطمینان حاصل کرتی ہیں۔ کچھ طبعی طور پر خاموشی سے اپنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



اندر اُٹھنے والے مدوجزر پر قابو پانے میں کوشاں رہتی ہیں۔ والدین کا فیصلہ میرے سر آنکھوں پر۔ اور میں آپ کی دیانت داری اور سچائی کی بھی قدر کرتی ہوں۔ بابا جان جیسا خلیق، خوش مزاج اور کھرا انسان اپنی اولاد کی قسمت کا فیصلہ بہترین ہی کرے گا۔ اُن کے تعلقات نوکروں کے ساتھ ایسے دوستانہ اور برادرانہ ہوتے ہیں کہ حاکمیت کا گمان تک نہیں ہوتا۔ نئے لوگوں کے ساتھ ایسا نفیس اور دلنشیں رویّہ کہ جنم جنم کی شناخت اور قربت کا احساس ہونے لگے۔ پھر میرے لئے غلط کیسے ہو سکتے ہیں۔ اور آپ کو بھی ہم سالوں سے جانتے ہیں۔ کس کس خوبی کی تعریف ہو۔'' وہ ذرا سا شرمائی اور وہاں سے بھاگ گئی۔ اُس کی باتوں کا سحر ابھی فضا میں موجود تھا۔ وہ اپنی عقل مندانہ سوچ سے اُسے ستّر سالہ بزرگ خاتون کی پرچھائیں لگی تھی۔

''جلال خان! تمہاری شامت آنے والی ہے۔ ایک بیوی انتہا کی نادان۔ دوسری بیوی بے پناہ دانش مند۔'' وہ تفاخر سے خودکلامی کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

دن رونقوں اور مسرتوں میں بیت گئے۔ ایک دن جلال خان اس سجی سجائی حویلی سے خوش بخت کو اپنے دوستوں اور اُن کی بیگمات کے ہمراہ بیاہ کر اپنے فوجی بنگلے میں لے گیا جہاں کی ہر چیز دُلہن کے مانند نئی تھی۔ لان پھولوں سے لبریز اُسے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ گھر کے ماحول میں مغربی طرز کی آرائش و زیبائش نمایاں تھی جو اُس کی شخصیت اور تربیت کی منہ بولتی تصویر تھی۔ حویلی مشرقی قدروں کا نمونہ تھی۔ جلال خان نے اپنی دوستوں کی بیگمات کی مدد سے اس کی خواب گاہ کو مشرقی رنگ ڈھنگ دینے کی لاجواب محنت کی تھی۔ وہ بھاری بھرکم لال غرارے میں اِک بھڑکتا ہوا شعلہ لگ رہی تھی، جس کی حدت نے ماحول کو اور حسین و جاذبِ نظر بنا دیا تھا۔ وہ نہال ہوئے جا رہا تھا۔ آج باری تعالیٰ کا انسان سے کیا ہوا عہد کس قدر سچائی لئے ہوئے تھا کہ میں صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوں۔

ولیمے کی تقریب موسمی پھولوں سے آراستہ وسیع لان میں منعقد ہوئی۔ اس کی یونٹ کے تمام افسران، حویلی کے مکین اور خوش بخت کے گاؤں کے معزز حضرات نے ولیمے کی دعوت میں شرکت کی۔ جلال خان کے تین جگری یار بھی اس محفل کی رونق کو دوبالا کرنے کو موجود تھے۔ میجر بختیار جو ڈیرہ دون اکیڈمی سے اس کا ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا، آج کل



سیالکوٹ کے بارڈر پر اپنے فرائض ادا کر رہا تھا۔ جو گھریلو مسائل کی وجہ سے ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ دوسرا یوسف آفریدی نوشہرہ میں مقیم تھا جو پہلی جماعت سے اس کا ہم جماعت اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ڈگری لے کر برن ہال میں نوکری پر فائز تھا۔ بے اولاد ہونے کی وجہ سے اُس کی شادی ٹوٹے مدت بیت گئی تھی۔ تیسرا دوست غازی میر، کشمیر سے تھا۔ وہاں اس کا قالین سازی کا کاروبار تھا۔ جلال خان نوکری کے اوائل دنوں میں کشمیر میں متعین کیا گیا تھا۔ وہاں اُس کی دوستی ایسی مستحکم ہوئی جو آج تک نبھ رہی تھی۔ اس کا خاندان بمعہ بیوی اور بچوں کے جلال خان کی سرپرستی میں سیالکوٹ آ کر آباد ہوا تھا۔ یہ تینوں دوست میس میں ٹھہرے ہوئے اس کی شادی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ولیمے کی دعوت میں فیروز خان کی چھوٹی دو بھابیاں لالہ رُخ اور ریحانہ ان کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ بیوگی کا روگ اور کرب ان کے حُسن اور شادابی کو ماند نہ کر سکا تھا۔ دونوں بہنوں نے دہلی سے ڈگری حاصل کی تھی، جس کی چھاپ ان کی شخصیت پر نمایاں تھی۔ غازی میر کی بیوی کافی سمجھ دار خاتون تھی۔ اُس نے اپنے شوہر کے دماغ میں بختیار اور یوسف کی شادی لالہ اور ریحانہ سے کرنے کا خیال ڈال دیا۔ اور یہ خوب صورت خیال ایک حسین خواب کی صورت میں دونوں کے ذہن میں اُنڈیل دیا گیا۔ دونوں سنجیدگی سے اس پہلو کے فوائد کے بارے میں سوچنے لگے۔ یوسف اولاد کا ترسا ہوا شخص، ریحانہ کو دو بچوں کے ساتھ قبول کرنے کو تیار ہو گیا۔ اور بختیار، لالہ کو ایک بیٹے کے ہمراہ اپنی سرپرستی میں لینے پر رضامند نظر آیا۔

گھر بسانے کے سنہری موقع نے دن رات کی نیندیں اُڑا کر رکھ دیں۔ فیروز خان تک رسائی حاصل کرنے کے لئے جلال خان کو سیڑھی کے طور پر استعمال کرنے میں کوئی قباحت نظر نہ آئی۔ جلال خان نے ان کے نیک اور پاکیزہ خیالات کو سراہتے ہوئے فیروز خان سے بات کی۔ وہ اپنی ناک اونچی رکھنے اور خاندانی جھوٹی شان و شوکت کی خاطر جوان عورت پر ظلم کرنے کے سخت خلاف تھا۔ وہ ان تمام فرسودہ رسومات سے آزادی کا خواہاں تھا۔ اُس نے اپنی خودمختاری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اماں گُل کی رضا بھی وصول کر لی۔ راجپوت خاندان کے سپوت بختیار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، نہ شرائط نہ ہی اپنی خواہشات کا اظہار کیا۔ فوراً حامی بھر لی اور لالہ سے نکاح کر کے اُسے سیالکوٹ میں لے آیا۔ بیٹا

www.iqbalkalmati.blogspot.com



عارضی طور پر صفیہ کے پاس ہی رُک گیا۔

جونہی بختیار کو گھر ملا، فرقان کا کمرہ سیٹ کرنے پر توجہ مبذول ہو گئی۔ لالہ نے کھلونے، بچوں کی کتابیں، رنگ برنگی پنسلیں، پینٹ اور جو کچھ بازار میں اُس کے لئے مہیا تھا، سب کچھ خریدا اور دونوں اپنے فرقان کو لے کر اپنے گھر آ گئے۔ فرقان کو باپ کا سایہ اور شفقت مل چکی تھی۔ اُس کی خود اعتمادی کو لحظہ بہ لحظہ بڑھتے ہوئے دیکھ کر لالہ کو اپنے اس فیصلے پر فخر ہونے لگا۔

یوسف خان آفریدی گھٹا گھٹا جسم، فربہی کی طرف مائل، دراز قد و قامت کے ساتھ بہت بارُعب لگتا تھا۔ علی گڑھ کی تعلیم نے اُس کے نظریات کو وسیع و بلیغ بنا دیا تھا۔ وہ مستقبل میں غریب بچوں کے لئے ایک بہت بڑا خیراتی سکول کھولنا چاہتا تھا۔ وہ شانہ بشانہ چلنے والے جیون ساتھی کی کھوج میں تھا۔ اُس کی نیک نیتی نے تمام راہوں کو اس کے لئے کھول دیا تھا۔ اس رشتے کے آخری نتائج تک پہنچ کر اس نے بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس نے جلال خان سے ریحانہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

لالہ کے رخصت ہونے کے بعد ریحانہ خود کو بہت تنہا اور ناکارہ محسوس کرنے لگی تھی۔ لالہ کی زندگی کو بڑی رشک بھری نظروں سے دیکھ کر اپنی زندگی کی اُداسیوں اور مایوسیوں کے بارے میں سوچتی رہتی۔ اپنے بچوں کی محرومی کا احساس اُسے گھائل کئے ہوئے تھا۔ مگر وہ اس کا اظہار اپنی بہن لالہ سے کرنے میں بھی ہچکچا رہی تھی۔ اس کا ایک بیٹا اسی کے ساتھ سکول جاتا تھا، دوسرا ابھی چھوٹا تھا۔ وہ دن بھر اماں گُل کی نگرانی میں نوکرانیوں کے ہاتھوں میں پل رہا تھا۔ یہ بچہ پاکستان بننے کے سات مہینے بعد پیدائشی طور پر ہی کمزور پیدا ہوا تھا۔ صفیہ کی چھوٹی بہن خدیجہ جو اُس کی دیورانی بھی تھی، وہ ریحانہ کو خفیہ کچوکے لگانے سے باز نہ آتی تھی۔ بات بات پر بچے کو ٹوکتی۔ تھپڑ رسید کر جانا اُس کے لئے بڑی عام سی بات تھی۔ وہ صفیہ کی چھوٹی اور لاڈلی بہن ہونے کے ناطے ہر ایک کے سر چڑھی ہوئی تھی۔ کسی میں گلہ وشکوہ کرنے کی جرأت نہ تھی۔ کیونکہ ان سب کا کرتا دھرتا صفیہ کا خاوند ہی تو تھا۔ سب خدیجہ کی خوشامد میں لگی رہتیں۔ ریحانہ خود ایک مکمل اور بھرپور شخصیت کی حامل ہونے کی وجہ سے اُسے کسی کھاتے میں نہ لاتی۔ لیکن ہر قسم کے جھگڑے یا بحث مباحثہ سے بھی پرہیز رکھتی۔ معاملہ بگڑنے کے اندیشے سے وہ ہر وقت اندر ہی اندر



کڑھتی رہتی۔ ایسا دکھ درد سننے والا تو بہت دُور جا چکا تھا۔ یہ خاوند ہی ہوتا ہے جو بیوی پر ہونے والی زیادتیوں پر سیخ پا ہو کر اپنی ماں بہنوں تک کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے پاس ایسا ہمدرد نہیں تھا۔ وہ جیٹھ کی محتاجی میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔ ماں باپ کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ وہ حالات ناساز کر کے کہاں جاتی؟ اِک گھٹن کے احساس نے اُسے کافی حد تک رنجیدہ کر دیا تھا۔ ان تمام حالات سے اماں گُل باخبر تھیں۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں خدیجہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی رہتیں۔ مگر اُس کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ وہ اپنی ڈگر پر گامزن تھی۔ دوسروں کے درد کا احساس اور پروا کئے بغیر۔

جلال خان نے فیروز خان سے مشورہ کر کے ریحانہ سے بات کرنا مناسب سمجھا۔ وہ تمام معاملہ ریحانہ پر چھوڑنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ پڑھی لکھی خاتون ہونے کے ساتھ ایک تعلیم یافتہ مرد کی بیوی رہ چکی تھی۔ دنیا کے نشیب و فراز اور اچھے برے میں تمیز کرنے کی قوت رکھتی تھی۔ ایسی خواتین کے فیصلے خود ساختہ کرنا سراسر زیادتی ہے۔ بے شک فیروز خان ہر صورت اور ہر زاویے سے ان سب کے لئے والدِ محترم کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کی ہمدردی اور پیار پر ہر ایک کو اپنی ذات سے زیادہ بھروسہ تھا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا۔ مسئلہ ریحانہ کی اپنی پسند اور سوچ کا تھا۔ جلال خان نے یوسف کی شخصیت کے روشن اور تاریک پہلوؤں سے پردہ کشائی کرنے میں عار نہ سمجھی۔ کیونکہ وہ اس رشتے کے تقدس کا احترام کرتے ہوئے کسی قسم کی دھوکا بازی یا غلط بیانی سے کام لینے کے حق میں ہرگز نہ تھا۔ ریحانہ کے ذہن میں یوسف کا کردار مستحکم اور پائیدار بن کر سامنے اُبھر چکا تھا، جس سے اُس کی شخصیت کے بے شمار در کھلنے سے وہ اِک کھلی کتاب کے مانند اُس کے حواس پر چھا گیا تھا۔ جس کا ہر لفظ وہ آسانی سے پڑھنے اور سمجھنے میں اُسے کسی اُلجھن یا دقت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اُس نے جلال خان کی موجودگی میں اُس سے ملنے کی حامی بھر لی۔ حویلی میں فیروز خان کے سامنے ملنا باعثِ ندامت ہوتا۔ ایسی بے لحاظی اور دیدہ دلیری کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اماں گُل سے مشورہ اور رضامندی لینا اُس کے لئے بہت اہم تھا۔ وہ ریحانہ کی پھوپھی تھی۔ اپنی بھتیجی کے لئے بہترین ہی فیصلہ کرتی۔

آخر اماں گُل نے تڑپتے دل اور اشک بار آنکھوں سے اُسے شادی کرنے کا اجازت نامہ دے دیا۔ دیر تک دونوں گلے لگی بیتے وقت کی یاد میں واویلا کرتی رہیں۔ عثمان نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



اپنی سمجھ کے مطابق نتیجہ اخذ کرلیا۔ وہ معصوم بار بار ماں کو بوسہ دیتے ایک ہی بات بولے جارہا تھا۔

''ہم بابا کو ملنے جنت جارہے ہیں۔ نہ روئیں۔'' اُس کے منے منے ہاتھ ماں کے بھیگے رخساروں کو صاف کررہے تھے۔ چھوٹا بیٹا کچھ نہ سمجھ کر روتی ہوئی ماں کے گلے لگ کر سسک پڑا تھا۔

عثمان نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، وہ باپ کے پیار اور اُس کی بہادری کی بے شمار کہانیاں ہر رات سونے سے پہلے ماں سے سنا کرتا تھا۔ وہ باپ کو دیکھنے اور ملنے کے لئے بے چین ہو کر ضد پر اُتر آتا۔ وہ ہمیشہ یہ کہہ کر اُسے مطمئن کر دیتی کہ بابا نے اپنے لئے ایک خوبصورت محل جنت میں تعمیر کر لیا ہے۔ بلاوا آنے پر ہم بھی وہاں چلے جائیں گے۔ پھر مل کر رہیں گے۔ آج خوشی کے اس مقام پر عثمان کو ماں کا رونا بہت برا لگ رہا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور اُچھل اُچھل کر ہر ایک کو یہ خوشخبری سنائے جارہا تھا کہ ہم بابا سے ملنے جنت جارہے ہیں۔ سب حیران نظروں سے اُسے دیکھتے رہ گئے مگر معمہ حل نہ کر سکے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

خوش بخت نے تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ریحانہ کو اپنے گھر بلا لیا۔ اماں گل بھی اس کو مضبوطی اور تسلی دینے کو ساتھ ہی موجود تھیں۔ کیونکہ اس آڑے وقت میں اُسے قابلِ اعتماد سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ یوسف کی خوشی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ آج ریحانہ کی رضامندی سے اسے اچھے خاندان کی بیوی کے ساتھ وہ دولت مل رہی تھی، جس کی تلاش میں اس نے دنیا کھنگال دی تھی۔ اُسے بچے بہت پسند تھے۔

عثمان نے یوسف آفریدی کو دیکھتے ہی اپنی نشست سنبھالی اور یوسف کی نظروں میں پیار اور لگاوٹ کی چاشنی دیکھ کر اس کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا اور ہمایوں اُسے شرما کر دیکھتا اور چہرہ ماں کے آنچل میں چھپا لیتا۔

سب حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایسے تو نہیں کہتے کہ بچے فرشتے ہوتے ہیں۔ انسانی روّیے کو پہچاننے میں اُنہیں دیر نہیں لگتی۔ ریحانہ کے لئے فیصلہ کرنا کتنا آسان ہو گیا تھا۔ ایک نامحرم، نامانوس شخص کو بچوں نے کس خوبصورتی سے قبول کر کے سب کی مشکل کو حل کر دیا تھا۔ ماں کو کیونکہ اعتراض ہوتا۔ لمحوں میں ہی گھر کے ان



افراد نے آشیرباد کے لئے ہاتھ اٹھا لئے۔ ریحانہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اُس کی آنکھوں میں چند سال پہلے آنے والی خوشیوں کے حسین لمحے گھوم گئے اور وہ اپنے شہید خاوند سے جس کے ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیمان کیئے ہوئے تھے، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگی۔ اسی اثنا میں عثمان بھاگتا ہوا آیا اور اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''بی بی! اماں گل کہتی ہیں، تمہارے بابا جنت سے تمہیں ملنے آئے ہیں۔ آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

''ہاں......اماں گل ٹھیک کہتی ہیں۔ میں عثمان اور ہمایوں کا بابا ہوں نا۔'' عقب سے مردانہ بھاری آواز اُبھری۔

ریحانہ نے چونک کر مڑ کر دیکھا۔ یوسف کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ریحانہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ یوسف نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ریحانہ نے یخ بستہ ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''ریحانہ! میرا وعدہ ہے تم سے۔'' یوسف نے چھوٹے سے آفت کے پرکالے کو غور سے دیکھا اور ہنس کر ٹال دیا۔ مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ریحانہ بھی غیر ارادی طور پر مسکرا دی۔

چند ہفتوں میں فیروز خان نے اُن کی شادی کی تمام تیاریاں مکمل کر لیں اور ایک مبارک دن کی حسین شب کو اُسے بیاہ کر نوشہرہ سے اپنے آبائی گھر لے گیا۔ آج اُس کی اولاد کو اپنا الگ گھر مل گیا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر خوشی سے مسرور ہو رہی تھی۔ یوسف نے بھی انہیں باپ جیسی شفقت اور توجہ سے نوازا تھا۔ وہ معصوم جو باپ کی جنت میں جانا چاہتے تھے، سچ مچ باپ کی جنت میں وہ کس قدر شاداں تھے۔ کچھ دن اپنے عزیز و اقارب میں رہنے کے بعد یہ ایبٹ آباد پہنچ گئے۔ یوسف ہر دن اُن کے قریب ہوتا چلا گیا۔ زندگی کے بدلے ہوئے اس رنگ اور ڈھنگ نے سب کے چہروں پر تسکین اور اطمینان کی روشنی بکھیر دی۔

❖❖○❖❖

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"خوش بخت! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمیں کہیں جانا ہے۔" جلال خان نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے حکم صادر کر دیا۔

خوش بخت سوال کئے بغیر تیار ہونے لگی۔ چند ہی منٹوں میں وہ جانے کے لئے باہر کھڑی تھی۔ وہ جلال خان کے چہرے کے خوشی بھرے تاثرات سے مطمئن تھی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"آپ کے چہرے کی چمک و دمک بھلے پیغام کی غمازی کر رہی ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"یعنی ہماری راحتِ جان ہمیں اچھی طرح سمجھ گئی ہے۔" لہجے میں بے پناہ پیار تھا۔

وہ اسٹیرنگ وہیل گھماتے ہوئے سوچ کی گہری وادیوں میں کھو گیا۔ خوش بخت بھی تو ایک مشرقی بیوی ہوے۔ کلثوم سے رتی بھر مطابقت نہیں۔ بیٹ مین کی موجودگی کے باوجود میرے لئے کھانا خود بنانا، یونیفارم سے لے کر رومال اور جوتوں تک کا خود خیال رکھنا، پھولوں کے گلدستوں سے گھر کی فضا کو معطر رکھنا اور سلیقے و قرینے سے گھر داری چلانا سب کس خوب صورتی سے نبھا رہی ہے۔ مجھے تو اس نے جیت لیا ہے۔ اور نوکر چاکر بھی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ اگر بیوی ایسی ہوتی ہے تو یہ سچ ہے کہ یہ مرد کے لئے بہترین اور خوبصورت انعام ہے۔ وہ اپنی قسمت پر رشک کرتے ہوئے لبوں پر پُرسکون مسکان سجائے گاڑی چلا رہا تھا۔ گھر میں دوستوں کو ضیافت پر مدعو کیا تو بہترین خوش آمدید اور کیا خوش ذائقہ کھانا۔ اور پھر خوش بخت کی کیا دلنشین باتیں، اخلاق اور تمدن اُس کے انگ انگ سے پھوٹ رہا تھا۔ جبلت کو ضابطے اور قانون میں لانا کوئی اس خاندان سے سیکھے اس کا درس ماں کی آغوش سے شروع ہو کر یونیورسٹی کی سرحدوں کو پار کر لیتا ہے۔



"آپ مسکرا رہے ہیں، مگر بات نہیں کر رہے۔ ہمیں بھی تو بتائیے سرتاج! ہم مسکرانے میں آپ کا ساتھ دے سکتے ہیں۔" وہ چھیڑنے کے انداز میں بولی تو چونک کر اس کے اس کے ہاتھ کو دبا دیا۔

"یہ ہاتھ دبانا، ہاتھ پکڑنا تکیہ کلام کی طرح آپ کے ساتھ ہے۔" وہ پھر ہنسنے لگی۔

"بھئی کنواری تنہائیوں میں اور بھری محفلوں میں ہاتھ دبا کر ہی تو دل میں اُبھرنے والے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ بھی سمجھ جاؤ گی۔" وہ ہنسے جا رہا تھا۔ اتنی دیر میں گاڑی ایک پرانے اور سال خوردہ بنگلے کے سامنے جا رُکی۔ جلال خان تیزی سے باہر نکلا۔ گیٹ کا تالا کھولا۔ وسیع و عریض ویران لان عبور کر کے وہ بنگلے کے کشادہ برآمدے میں پہنچ گئے، جہاں برآمدے کے ستونوں کے ساتھ بیلیں بھی سوکھ چکی تھیں۔ گملے بھی پودوں سے عاری تھے۔ بنگلے کا بڑا دروازہ کھول کر یہ اندر طویل راہداری میں پہنچ گئے۔

خوش بخت حیرت سے دیکھے جا رہی تھی۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ماجرا کیا ہے؟

"یہ ماڈل ٹاؤن کا علاقہ ہے۔ فیروز لالہ کو یہ گھر الاٹ ہوا ہے۔ انگریز کے طرز اور نقشے پر بنا ہوا یہ بنگلہ کافی آرام دہ معلوم ہوتا ہے۔" اونچی چھتوں والے بڑے بڑے کمرے، کھلے باتھ روم، کشادہ برآمدے، طویل راہداریاں دیکھ کر جلال خان نے طنزیہ کہا۔ "بے چارہ انگریز جب یہاں آیا تو یہ ملک اُسے سونے کی چڑیا معلوم ہوئی۔ اپنی کم مائیگی اور تنگ دستی کو اُنہوں نے ہماری ہی دولت سے پردہ پوشی کی اور ہمیں اپنی تہذیب کا غلام بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ کہاں گئی اُن کی یہ جھوٹی شان و شوکت۔ یس سر، سوری اور تھینک یُو کرتے کرتے انہوں نے اپنی نسلیں سنوار لیں۔"

"جی۔" خوش بخت نے گھر کا جائزہ لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گھر پسند آیا کہ نہیں؟" جلال خان نے خوشی سے سوال کیا۔

"پسند کیسے نہیں آئے گا؟" وہ مسکرا پڑی۔ "اماں گُل اور بی بی کا ہاتھ لگنے دیں ذرا۔ پھر دیکھئے گا کہ یہ پرانا گھر کسی محل سے کم نہ ہو گا۔"

"ہاں بھئی۔ اس کی تو ہم بھی گواہی دیتے ہوئے داد دیتے ہیں۔ اچھا تو بتاؤ، اس بنگلے میں ہمارا کمرہ کون سا ہو گا؟ ابھی سے فیصلہ ہو جانا چاہئے۔" جلال خان چہک رہا تھا۔ بنگلے کے عقبی احاطے کی طرف کھلنے والی کھڑکی کو کھولا، جہاں آموں کے پیڑوں کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



جھنڈ کے جھنڈ تھے۔ ان کو غذا نہ ملنے کی وجہ سے درختوں کے نیچے بور کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ درخت بیمار اور آزردہ لگ رہے تھے۔

"اوہو...... یہ بھی اپنی جانداری اور محسوسیات کا اظہار کرنے کی کوشش میں ہیں۔ بے چارے سوکھنے کو کھڑے ہیں۔" خوش بخت نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں...... در و دیوار، پھول، پودے، درخت سب ہی تو رنجیدہ ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ اب انہیں آباد کرنے والا خاندان خراماں خراماں پہنچ رہا ہے نا۔ چلو، سیدھے حویلی چلتے ہیں۔ فیروز لالہ کو چابی دینے میں دیری نہیں ہونی چاہئے۔" دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، ہنستے مسکراتے باہر نکل گئے۔

ایک مہینہ بنگلے کی صفائی ستھرائی کرواتے گزر گیا۔ اماں گُل تمام پوتے، پوتیوں اور بہوؤں سمیت نیا گھر آباد کرنے کو پہنچ گئیں۔ صفیہ اور فیروز خان گاؤں میں اکیلے سکولوں کی نگہداشت کے لئے رہ گئے اور دوسرا اس مٹی میں ان کی روزی اور رزق جو لکھ دیا گیا تھا۔ اس کا حصول بھی تو لازم تھا۔

سکولوں میں تمام بچوں کے داخلے ہو گئے۔ ماؤں نے بھی نوکری کے لئے مختلف سکولوں میں درخواستیں دے دیں۔ فاطمہ اور زینب کو آرمی پبلک سکول میں بے حد باعزت نوکری مل گئی۔ ہاجرہ نے اپنے بچوں کے سکول میں نوکری پکڑنا مناسب سمجھا۔ خدیجہ نوکری کے سخت خلاف تھی۔ وہ اماں گُل کے ساتھ گھر پر نوکرانیوں پر حکمرانی کرنے میں خوش تھی۔

ضرورت اور مجبوری نے اُن کے خاندانی ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ مگر نوکری ضرورت بن کر سامنے نہ آئی تھی۔ طلاق اور لڑکی کی دوسری شادی سرے سے ہی ممنوع تھی۔ اس میں بھی تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ یہ اس خاندان کی دُور اندیشی تھی کہ ہوا کی سمت دیکھ کر اپنے سفر کو جاری رکھا۔ یہ اماں گُل تھیں جنہوں نے سب کو ایک دھاگے میں پرو کر رکھا تھا ورنہ اس بے یار و مددگار، منہ کے بل گرے ہوئے خاندان کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہوتا۔ کٹھن آزمائشوں اور بھوک پیاس کے عالم میں لوٹ کھسوٹ، حریصانہ حرکات اور کلفت آمیزی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خدمتِ خلق کے جذبے کو اُجاگر رکھا۔ اُن کی راست بازی، دیانت داری اور صبر و



تحمل کے عوض جلال خان اُن کے سر کا سایہ بن گیا۔ آج اُس کی وساطت سے نئی زندگی ایسی ڈگر پر چل نکلی تھی، جہاں کامیابیاں، خوشیاں اور راحتیں اُن کے انتظار میں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھیں۔ اُن کی عقل مندی کی داستانیں گھر گھر بیان ہونے لگی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی نوازشات پر اُن کا اڑوس پڑوس مارے بغض و عناد کے ہر وقت پراپیگنڈے میں مگن رہتا جس کو فیروز خان ہنس کر ٹال جاتا۔ بڑائی اسی میں تھی۔ خوش بخت پہلے ہی سب کی آپا گُل تھی، اب تو اُس کا درجہ اور رُتبہ بہت بلند و بالا ہو چکا تھا۔ خوش بخت اس خاندان کے لئے سچ مچ خوش بخت ہی نکلی۔ جس کی بابرکت اور پاکیزہ روح نے اپنے اردگرد کے ماحول کو بھی جلا بخش دی۔ جہاں قدم رکھا، وہاں شادمانیاں اور کامرانیاں رقص کرنے لگیں۔

حویلی خاموش اور اُداس نظر آنے لگی۔ پرانے مکینوں کے فراق سے ابھی نکلی ہی تھی کہ نئے مکین بھی دھوکا دے گئے۔ بچوں کے جھگڑے، معصوم لڑائیاں، لڑکیوں کی مقابلے بازیاں، خواتین کی گھریلو سیاستیں سب تو دم توڑ گئیں۔ نہ وہ رونقیں، نہ گہما گہمی، نہ وہ پینگیں اور جھولے، نہ کڑھائیاں نہ سلائیاں۔ غرضیکہ سب کچھ ہی سکوت کی نذر ہو گیا۔ حویلی کے بھائیں بھائیں کرتے کمرے بند رہنے لگے۔ کبھی کبھار صفائی کے لئے کھلتے۔ لیکن ایک جگہ ابھی بھی آباد تھی۔ وہ تھا مردان خانہ۔ جہاں ابھی بھی رات گپ شپ، مسائل کے حل، اخبار کی تازہ خبروں پر بحث مباحثے، سیاست پر اظہارِ خیالات قائم و دائم تھا۔ باتوں باتوں میں فیروز خان کا جلال سے رشتے میں منسلک ہونا اور اُس کی کایا پلٹ جانے کی یاد دہانی بھی کرائی جاتی تھی۔ فیروز خان، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے بات کا رخ موڑ دیتا۔

ماڈل ٹاؤن سے تمام افراد بقرعید منانے حویلی پہنچ چکے تھے۔ خوش بخت، لالہ اور ریحانہ بھی اپنے شوہروں اور بچوں سمیت پہلی عید میکے گزارنے آئی ہوئی تھیں۔ یہ گھر خوش بخت کا میکہ تو تھا ہی، ریحانہ اور لالہ کے لئے بھی درجہ میکے کا ہی تھا۔ وہ اس گھر سے رخصت ہوئی تھیں اور ان کی آغوش میں اس حویلی کی نسل پروان چڑھ رہی تھی۔ یہاں کی جائیداد کے یہ بچے حق دار تھے۔ دونوں فریقین اس بات کو تسلیم کرتے تھے۔

رات کو گھر کے تمام مرد حضرات کوئلوں کی انگیٹھیوں کے پاس اپنی محفل جمائے بیٹھے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



تھے۔ ماحول میں سکون و اطمینان کا اپنا ہی سحر زدہ حُسن و جمال براجمان تھا۔ قربتوں کا نشہ چارسُو بکھرا ہوا تھا کہ یک دم مردان خانے کا دروازہ کھلا اور پڑوس سے دلاور اور جہانگیر وارد ہوئے۔ مصافحہ کے بعد وہ بھی ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ ہم نے سوچا محفل خوب گرم ہے۔ ہم بھی اس گرما گرمی سے لطف اندوز ہونے پہنچ گئے ہیں۔ دلاور کے لہجے میں اندرونی کرب اور بغض کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں۔

''زہے نصیب۔'' فیروز خان نے اُن کے لہجے کو محسوس تو کر لیا تھا، مگر نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوا۔

اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد دلاور نے جل کر کہا۔

''میجر صاحب! آپ بڑے دعوے کرتے تھے ہمیں انصاف دلانے کے۔ وہ سب کیا ہوئے؟ نہ ہمیں اپنی گمشدہ اولادیں ملیں، نہ جائیداد کے بٹوارے میں انصاف ہوا۔ کئی اثر ورسوخ کی وجہ سے زمین سے اُٹھے اور آسمان کو جا لگے۔'' اشارہ فیروز خان کی طرف تھا۔ ''کیا ہم نے یہ ملک وجود میں لانے کے لئے قربانیاں نہیں دیں؟ پھر ہم سے بے انصافی کیوں؟ خردہ فروش محلوں میں اور زمیندار کچے کوٹھوں میں جا بسے۔ کیا ہمارے نصیب میں یہی کسمپرسی لکھی تھی؟ ہماری معصوم بچیاں سکھوں اور ہندوؤں کے ہتھے چڑھ کر کوئی رکھیل بنی تو کوئی مجرے کا نشانہ بن کر رہ گئی۔ کسی نے نوکرانی کی جگہ دی تو کسی نے بیوی بنا کر رکھ لیا۔ ہمارے گبھرو جوان چارے کی طرح ٹوکے میں ڈالے گئے۔ ہمارے بزرگ گلی کوچوں میں گھسیٹے گئے۔ مائیں دُہائی کرتی بے پردہ ہو گئیں۔ ہمیں کیا ملا۔ دو کمروں کا گھر اور کھانے کو دال روٹی۔ میجر صاحب! آپ کو کیا معلوم، اولاد کا درد کیا ہوتا ہے؟ اور اپنے گھر بار چھوٹنے کا کرب کسے کہتے ہیں۔ آپ بنگلوں میں رہنے والے لوگ، کاروں میں گھومنے والے افسران ہمارے دُکھوں سے بالکل نابلد ہیں۔'' وہ جذباتی ہو گیا تھا۔

''ایسا ہرگز نہیں۔ اس گاؤں کے لوگوں کو اُن کی حیثیت کے مطابق زرعی زمین اور گھر الاٹ کرانے والا میں خود ہوں۔ فساد زدہ شہروں اور گاؤں کی جائیداد کے کلیم کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ کسی سے بے انصافی نہ ہوگی۔'' جلال خان سنجیدہ ہو گیا۔ ''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ سے زیادتی ہوئی ہے تو اس کے خلاف آواز اُٹھائیں۔ حکومت آپ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com



کی کیوں نہیں سنے گی۔ یہ ملک آپ کا ہے۔ اس پر آپ کا اتنا ہی حق ہے، جتنا ایک مالدار اور بڑے زمیندار کا ہے۔''

''میجر صاحب! آپ نے درست فرمایا۔'' جہانگیر گویا ہوا۔ ''میں ایک بات سے متفق ضرور ہوں۔ یہ پاکستان، جس کی بنیاد ہی سچائی اور اسلام کے جذبے پر رکھی گئی ہے، پھر یہاں قتل و غارت، ظلم وستم، بے انصافیوں اور دھاندلیوں نے جنم کیوں لیا؟ اس کی بنیادوں کو غریب، معصوم اور قربانی سے سرشار لوگوں کے خون نے مضبوط بنایا ہے۔ ہماری ماں بہنوں کی عصمت دری کی دلخراش چیخیں اس فضا میں گونج رہی ہیں۔ تو پھر یہ وڈیروں کی جاگیر کیونکر ہوئی؟ رشوت خوروں، جھوٹی آن اور بان کے ٹھیکیداروں اور بدمعاشوں کا اڈا کیونکر تھا۔ ہماری بچیاں جو کہ پاکستان کی مقدس سرزمین سے اُٹھا لی گئیں، وہ کہاں ہیں اور ان وارداتوں کو کرنے والے کون ہیں؟ آج تک یہ معمہ حل نہیں ہوسکا۔ یہ ملک تو ہماری جان و مال اور عزت کے تحفظ کی آغوش ہونی چاہئے تھی۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

فیروز خان نے اُسے پیتل کے کٹورے میں پانی پلا کر ٹھنڈا کیا۔ جلال خان افسردگی سے زمین پر نظریں گاڑے اُس کے درد کو محسوس کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ دردِزہ کا اندازہ فقط اُسے ہی ہوسکتا ہے، جو اس سے گزر رہا ہو۔ اور یہ درد ہے بے حد بے بسی اور لاچارگی کا۔ جس سے چھٹکارا کچھ پا لینے کے بعد ہی ملتا ہے۔

''ہماری بے سروسامانی کو چھوڑیں۔ ہمیں ہماری بچیاں چاہئیں۔'' دلاور تڑپ کر بولا۔

''آپ کا کیا خیال ہے کہ حکومت اس بارے میں کچھ نہیں کر رہی؟'' جلال خان نے تسلی کے انداز میں کہا۔

''لگتا تو یہی ہے۔'' دلاور یقین سے بولا۔

''آپ ایسی غلط فہمیوں سے باہر نکل آئیں۔ ابھی تک مشکوک اڈوں پر چھاپوں کا سلسلہ جاری ہے اور بے شمار بچیوں کو منزلِ مقصود تک پہنچانے میں حکومت پورا پورا تعاون کر رہی ہے۔ ابھی کل ہی بیسیوں بچیاں برآمد ہوئی ہیں۔ آپ اپنی بچیوں کا نام وغیرہ لکھوائیں۔ ہوسکتا ہے، یہ عید آپ کے لئے خوشیوں کا پیغام لے کر آئی ہو۔'' جلال کے لہجے میں بے پناہ ہمدردی تھی۔ ''دلاور! یہ مت بھولو کہ ہماری دشمنی، دینی دنیاوی آزادی

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کے مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر یہ ملک بنایا گیا۔ اس سرزمین پر بھی گھناؤنے کردار قدم قدم پر ملیں گے۔ درندہ صفت لوگوں کی یہاں بھی بہتات ہے۔ میں یہ دعویٰ کرنے سے پرہیز کروں گا کہ یہاں کے مقامی اور نقل مکانی کرنے والے تمام لوگ بے حد پارسا اور رحم دل ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ ہر مقام اور ہر جگہ کا انسان ہمیشہ ایک سا ہی ہوتا ہے۔ حالات بڑے بڑے پختہ کردار اور نیک اعمال والے لوگوں کو بھی یوں بدل ڈالتے ہیں جیسے گرگٹ اپنا رنگ بدلنے میں دیر نہیں لگاتا۔ اللہ کی ذات ہمارے وجود میں شاہ رگ سے بھی نزدیک ہے۔ مگر دوسری طرف شیطانیت بھی رگوں میں ساتھ ساتھ رواں دواں ہے۔ فیصلہ انسان کا ہے کہ وہ اپنی شخصیت میں اہمیت کس کو دیتا ہے۔ اس وقت یہاں ایسی زیادتیاں کرنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ بدقسمتی سے جو لوگ اس بدامنی اور انتشار کا شکار ہو چکے ہیں، ان کے خیالات کو بدلنا خاصا مشکل ہے۔ لیکن میں خود اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اپنوں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر وافر مقدار میں آنے والوں کی مدد کی ہے۔ ہم طبعاً بہت جذباتی اور دل پھینک لوگ ہیں۔ ہمارے اندر دوسروں کا درد محسوس کرنے کی قوت بے پناہ ہے۔ اور پھر اپنی ہمدردیاں بھی نچھاور کرنے میں کنجوسی ہرگز نہیں کرتے۔ پاکستانی قوم دنیا میں اِک مقام حاصل کر لے گی۔ بس اچھے وقت کا انتظار کریں۔ اس ملک پر رحمتوں کی بارش ہوگی۔‘‘

جلال خان اُنہیں سمجھا رہا تھا۔ سب ہمہ تن گوش تھے۔

’’میں ایک سوال پوچھنا چاہوں گا۔ کیا اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی آپ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو قبول کرنا پسند کریں گے؟ کیا آپ اس ذلت و خواری اور زبوں حالی پر سرِ تسلیم خم کرنے میں عار تو نہیں سمجھیں گے؟‘‘ جلال خان نے اپنے تجربات کی رو سے سوال کیا۔

’’اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ ہمارا اپنا خون ہیں وہ۔ اور ہیں بھی بے گناہ اور معصوم۔‘‘ دلاور نے تیزی سے کہا۔

’’بس خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ آپ کے دلوں کو سکون نصیب ہو۔‘‘ جلال خان نے کہا اور دوسری طرف باتوں میں مصروف ہو گیا۔ دونوں سر جھکائے اپنا موازنہ کرنے لگے کہ کیا ہم ایسی بہنوں اور بیٹیوں کو، جو ہندوؤں اور سکھوں یا یہاں کے غنڈوں



کے ساتھ رہ کر لوٹی ہوں، اُن کے وجود کو قبول کر لیں گے؟ غیرت اور عزت کے مجروح ہونے کے خوف سے الم ناک، ہولناک اور دہشت بھری صدائیں اُن کے کانوں میں گونجنے لگیں اور چہرے پر مردنی اور سیاہی طاری ہو گئی۔ جلال خان دوسروں سے باتیں کرتے ہوئے انہیں کنکھیوں سے دیکھ کر تہہ کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے والدین کے بے حد بھیانک چہرے دیکھے تھے اور متزلزل ہو کر سوچا تھا کہ کیا والدین بھی زمانہ شناس اور چالو ہو سکتے ہیں؟ تو پھر قابلِ اعتبار اور بے لوث رشتہ اور کون سا ہو سکتا ہے؟ اگر جسم کا ایک حصہ بیماری کا شکار ہو جاتا ہے تو اُسے کاٹ کر پھینکنے سے درد کی اذیت ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ طبیب یا ڈاکٹر کے علاج معالجے کے باوجود بیماری میں عارضی افاقہ تو ہو جاتا ہے، مگر ابدی چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا۔ یہ بیماری ہماری زندگی کی آخری سانس تک ہماری ہمجولی رہتی ہے۔ قبر میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔ پھر اس سے بھاگنا کیا؟ کیوں نہ اس کا ہمت سے مقابلہ کیا جائے۔

دونوں نام لکھوانے میں حیل و حجت کا سہارا لینے لگے۔ مگر اب تو مجبوری آڑے آ چکی تھی۔ ورنہ اُن کی خفگی، رنجش اور نا اُمیدی اور افسردگی کا ڈھونگ رچانے کا بھانڈا اسی وقت پھوٹ گیا ہوتا۔ آنکھوں میں احسان مندی اور شکر گزاری کی روشنی بھر کر دونوں نے غلط نام لکھوا دیئے۔ یہ تھی اُن کی اصلیت اور حقیقت۔

دوسروں کی نیت اور اعمال سے کیڑے نکالنے والے بذاتِ خود جراثیموں سے لبریز تھے۔

میجر جلال خان کو ناموں کی فہرست مل چکی تھی۔ لکھوائے ہوئے ناموں کی کوئی لڑکی اس میں موجود نہ تھی۔ ایک بچی کا تمام حدود اربعہ، دلاور کی نشان دہی کر رہا تھا۔ دوسری بچی اپنے بھائی کا نام جہانگیر بتا رہی تھی۔ تمام حلیہ ان دونوں کا ہی لگ رہا تھا۔ مگر پھر بھی تفتیش کے بغیر فیصلہ کرنا عقل مندی ہرگز نہ تھی۔ معمہ جلال خان کے تجربات نے حل تو کر دیا تھا۔ غم و غصے میں وہ بچیوں کو جیپ میں بٹھا کر دو سپاہیوں کے ہمراہ حویلی پہنچ گیا۔ طولانی، الم ناک تمہید باندھنے والے لوگ کس قدر کم ہمت اور منافق لگ رہے تھے۔ وہ سوچ جا رہا تھا۔ ایسے ڈرامے تو اس نے ہزاروں کی تعداد میں دیکھے تھے۔ مگر دلاور اور جہانگیر سے یہ اُمید ہرگز نہ تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



مردان خانے میں فیروز خان، مخملیں تخت پوش پر نیم دراز تھا۔ حقے کی خوب صورت نال منہ میں دبائے وہ لمبے لمبے کش لئے نہ جانے کن سوچوں اور تفکرات میں ڈوبا ہوا تھا۔ خاموشی میں حقے کی گُڑگُڑ بہت نمایاں تھی۔ نظریں ایک ہی نقطے پر اٹک کر رہ گئی تھیں۔ لٹھے کا کڑکڑاتا پاجامہ اور کھادی کا براؤن کُرتہ پہنے وہ بہت معتبر لگ رہا تھا۔ اُس کی اُٹھان اُس کے ماضی کی غمازی کر رہی تھی۔ آخر لودھی خاندان کا خون اُس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ ناک نقشہ بھی اُسی وضع کا تھا۔ حالات سازگار اور خوشگوار ہونے کی وجہ سے اُس کی بھرپور شخصیت میں وقار، کروفر اور تسکین کا نکھار آچکا تھا۔ جلال خان کتنی دیر کھڑا اُس کے رُعب و دبدبے پر غور کرتا رہا۔ فیروز خان نے اُس کے وارد ہونے پر پلک تک نہ جھپکی تھی۔ مگر حقے کی گُڑگُڑ جاری تھی۔ وہ جب بھی کسی مسئلے میں اُلجھا ہوتا تو اسی طرح اکیلے مردان خانے میں تنہائی اور حقے کو اپنا غمگسار بنا لیتا تھا۔ جلال خان نے دونوں بچیوں کو مونڈھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو فیروز خان چونک کر سیدھا بیٹھ گیا۔

''ضرور شکار کا پروگرام بنا رہے ہوں گے۔ مرغابی کا موسم ہے۔ خیال درست ہے۔'' جلال خان نے سرگوشی کی۔

''ہاں، ہاں۔ بالکل درست۔ یہ بچیاں......'' وہ بے اختیار بول اُٹھا۔ ''ابھی ابھی دلاور اور جہانگیر اُٹھ کر گئے ہیں۔'' وہیں بیٹھے بیٹھے اُس نے نوکر کو آواز دی اور دونوں کو مردان خانے بلالیا۔

وہ ہچکچاتے ہوئے چہرے پر منافقت کا رنگ چڑھائے پہنچ گئے۔

رضیہ سلطانہ جس کی عمر سترہ سال تھی اور اختر بانو اٹھارہ سال کی تھیں۔ میلے کچیلے پرانے کپڑوں میں ملبوس یہ بچیاں اپنی تباہی و بربادی کی کہانی پیش کر رہی تھیں۔ آنکھیں خوف و ہراس سے پوری کھلی ہوئی تھیں۔

اختر بانو، بھائی کو دیکھ کر چیختی ہوئی اُس سے لپٹ گئی۔ جس کی یاد میں اُس نے شب بھر واویلا کیا تھا۔ خود کو مظلوم اور باقی سب کو قصوروار ٹھہراتا تھا۔ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔

''میں اس لڑکی کو نہیں جانتا۔'' اُس نے سر سے پاؤں تک اُس کا جائزہ لیا۔ اختر بانو کا بیضوی شکل کا باہر کو نکلا ہوا پیٹ، ظلم کی داستان پیش کر رہا تھا۔ بھائی کس منہ سے اس کو



گلے لگا کر سب کے سامنے اس مقدس رشتے کا اقرار کرتا۔

''بھائی جان! میں آپ کی لاڈلی، اختر بانو ہوں۔ آپ نے پہچانا نہیں؟ باقی سب کہاں ہیں؟ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان جائیں گے۔'' کرب اور بے بسی کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک پڑا تھا۔

''خوامخواہ میرے گلے مت پڑو۔ ہمیں پہلے ہی اَن گنت پریشانیوں نے گھیر رکھا ہے۔ میجر صاحب! اس گناہوں اور غلاظت کی گٹھری کو جہاں سے اُٹھایا ہے، وہیں پھینک دیں۔ میرا اس سے کوئی رشتہ ناطہ نہیں۔ یہ بکواس کر رہی ہے۔ بھائی جان۔ منہ توڑ کر رکھ دوں گا۔'' وہ غصے سے چیختا اور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

اختر بانو چکرا کر گرنے ہی والی تھی کہ فیروز خان نے اُسے سہارا دے کر تخت پوش پر بٹھا دیا۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ آنکھیں اس سفاکی پر خشک اور لبوں پر خاموشی کی چھاپ تھی۔ فیروز خان نے اُسے پانی پلایا تو وہ ذرا سا بہتر محسوس کرنے لگی اور بے بسی سے بولی۔

''میں نے ایسی کہانیاں سنی تھیں۔ میں نے یقین ہی نہ کیا۔ میجر صاحب! میں آٹھ دفعہ بھاگنے کی کوشش میں ناکام ہو کر ظلم و تشدد کا نشانہ بنتی رہی، اپنوں کو پانے کے لئے۔ کاش! میرا بھائی، میرے زخموں پر مرہم ہی رکھ دیتا تو بھی میں ان کی زندگی سے نکل جاتی۔ آہ! یہ خون کی کشش بھی کچھ کام نہ آئی۔ سفید خون کے ان رشتوں کو اپنانے کا فائدہ؟ ......میجر صاحب! مجھے اُسی سکھ گھرانے میں واپس بھیج دیں، میں جس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میری قسمت میں اسلام اور اپنے خون سے سبکدوش ہونا ہی لکھا ہے۔ اور ایسا اسلام، جو میرے بھائی کا ہے اور ایسا خون جو میرے بھائی کی رگوں میں دوڑ رہا ہے، مجھے قطعاً منظور نہیں۔'' وہ آندھی کی طرح باہر نکلی اور جیپ میں بیٹھ گئی۔

کافی دیر سکوت رہا۔

''اب یہ نامراد آپ میرے سر تھوپیں گے۔'' دلاور نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ میری بچی کیسے ہو سکتی ہے میجر صاحب! مجھے میری اپنی اولاد چاہئے۔''

رضیہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ بے بسی سے باپ کو دیکھا۔ خاموش تھی۔ کیا کہتی؟ کیسے منواتی کہ اس نے اسی باپ کے کندھوں پر سواری کر کے بچپن گزارا تھا۔ اس نے اسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com



باپ کی اُنگلی پکڑ کر اس دنیا میں چلنا سیکھا تھا۔ مگر مکرے کا آج تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا تھا۔ دلاور کو بھی ایسی ہی لاعلاج بیماری لاحق ہو چکی تھی۔

"کیوں بیٹا! کیا یہ تمہارے والد صاحب نہیں ہیں؟" جلال خان نے شفقت بھرا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا۔ "مشابہت تو دلاور پر پڑتی ہے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس شخص کو نہیں جانتی۔" اُس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اُس نے ہمت کر کے باپ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ہر جذبے سے عاری آنکھیں کتنی بیگانہ اور پرائی لگ رہی تھیں۔ رضیہ کی آنکھوں میں ان گنت شکایتیں اور گلے شکوے، آنسوؤں کی صورت میں اُبل پڑے۔ دلاور تاب نہ لا سکا۔ بوجھل دل اور لعنت و ملامت کرتے ہوئے ضمیر کے ساتھ باہر نکل گیا۔

"میجر صاحب! اس ملک میں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ آپ مجھے آزاد کر دیں۔ میں اپنے لئے ذریعۂ معاش کا انتظام کرنے کی ہمت رکھتی ہوں۔ بیتے ہوئے دنوں نے میرے اندر کی عورت کو جھنجوڑ کر بیدار کر دیا ہے۔ میں موم کی گڑیا بن کر زندگی گزارنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میرا درجنوں درندہ صفت لوگوں سے واسطہ رہا ہے۔ ہر ایک نے مجھے موم کی گڑیا سمجھ کر اپنے مطابق ڈھال لیا۔ مگر بدقسمتی سے آج میں ایک مرد کو بیٹی ہونے کے رشتے میں اپنے مطابق نہ ڈھال سکی۔ اسی کو دنیا کہتے ہیں۔" اس کی آواز میں دکھ کے ساتھ پکا پن بھی تھا۔ زبان بے حد ملائم اور شستہ تھی۔

"جلال خان! اگر تم مناسب سمجھو تو یہ بچی مجھے بخش کر مجھے خدا تعالیٰ کے سامنے سرخرو ہونے کا موقع دو۔ ویسے بھی صفیہ اکیلی ہے۔ اسے بیٹی مل جائے گی۔" فیروز خان کی آواز میں کرب تھا۔

"بچی سے رضامندی ضروری ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ نیکی کے کاموں میں ہمیشہ آپ کے دم قدم رہا ہوں۔" میجر جلال نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھ پر ترس یا رحم کھانے کی ضرورت نہیں۔ اب میں آپ کے ڈیزائن کئے ہوئے سانچے میں ڈھلنے والی رضیہ نہیں رہی۔" رضیہ نے خفگی سے کہا اور باہر نکل گئی۔ وہ جیپ میں بیٹھنے کے بجائے کسی منزل کا تعین کئے بغیر ایک انجانی اور نئی ڈگر پر بھاگتی جا رہی تھی۔ سپاہی اُسے پکڑنے میں ناکام ہو گئے۔ وہ اُن کی دسترس سے بہت دُور نہ جانے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com



کہاں چھپ گئی تھی۔

اختر بانو بزدل تھی۔ پیٹ میں سکھ کا نطفہ پال کے وہ کسی مقابلے کے لئے تیار نہ تھی۔ جب سے وہ سردار جی کا گھر چھوڑ کر بھاگی تھی، کئی جگہوں پر زیادتی کا نشانہ بن چکی تھی۔ اُسے سردار جی کا پیار اور تحفظ بہت سچا اور کھرا نظر آنے لگا تھا، جسے چھوڑ کر اس نے اپنوں کی محبت، پاک ملک کی چاہت اور اپنے مذہب کی سلامتی کو اولیت کا درجہ دیا تھا۔ نہ اپنوں نے سینے سے لگایا، نہ آزاد ملک نے پناہ دی۔ آخر وہ واپس سکھوں کی نفری بڑھانے اُن کے در کی باندی بن گئی۔

رضیہ جب اپنے والدین کے ساتھ اسٹیشن پر اُتری تو شور شرابے اور بھیڑ میں اپنوں سے بچھڑ گئی۔ چند رضاکار اُسے اپنوں تک پہنچانے کے لئے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ پھر وہ درجنوں درندوں کا شکار بن گئی۔ وہ کسی ایک کی ملکیت تو نہیں تھی۔ کس سے پناہ کی التجا کرتی؟ کس پر اپنا حق جتاتی۔ جب ماں نے ہی غیریت اور انجانے پن کا اظہار کیا تھا تو کس سے تعلق جوڑتی؟ وہ ایک لمحے کو بجھ گئی تھی۔ اور پھر چنگاری کی طرح ایسی بھڑکی کہ کسی کے ہاتھ نہ آئی۔

اونچے گھرانوں کی دو بیٹیاں جن کے وارثوں نے بھی انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا، سلمیٰ اور سجدہ جن کو فیروز خان اپنی حویلی میں لے آیا اور وہ بیٹیوں کی طرح ان کے ساتھ رہنے تو لگی تھیں، مگر ذہنی طور پر مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ رات کی تاریکی اور تنہائی میں چیخ و پکار کرتی ہوئی ان بچیوں کو زندگی میں واپس لانے کی تگ و دو صفیہ کے لئے ایسا امتحان تھا، جس کی کامیابی اُس کی زندگی کا نصب العین بن گئی۔

آزاد ملک کی بقر عیدیں اپنی تمام تر رونقوں کے ساتھ گزشتہ سالوں کی سراسیمہ اور پراگندہ عیدوں کی یاد ضرور دلاتیں۔ وہاں بقر عید ہمیشہ انسانی قربانی کی خواہش مند ہوا کرتی تھی۔ مسلمانوں کے گنجان علاقوں میں جانوروں کے ساتھ مسلمانوں کا ذبح ہونا معمول بن چکا تھا۔ عید ہمیشہ خوف و ہراس لے کر نمودار ہوتی۔ ہندو کس قدر تنگ نظر اور تشدد پسند واقع ہوا تھا کہ ہر بقر عید پر قتل و غارت اور ستم گری کا لامتناہی سلسلہ جو شروع ہوتا تو کتنے ہی بے گناہ مسلمان گھرانے اس کی زد میں آ جاتے۔ جوانوں کے خون کی ندیاں بہہ نکلتیں۔ صاف ظاہر ہے کہ جس کی ہندو پوجا پاٹ کرتا تھا، ہم اس کی جان کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com



قربانی کو عبادت اور کارِ ثواب کا نام دیتے ہیں۔ یہ بنیادی اختلاف جس میں مذہب ہمیشہ سرِ فہرست رہا تھا، ہمیں کیسے یکجا ہو کر رہنے کی اجازت دیتا؟ یہاں ملک بھر میں بکروں کی قربانی کے ساتھ بے شمار گائیوں کی بلا خوف و خطر قربانی دی جاتی۔ آزادی بھی کیا خوبصورت ترین نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بخشا ہوا انمول تحفہ ہے۔ جب تک قومیں اس کا ذائقہ نہ چکھ لیں، مزے کا احساس ناممکن ہے۔ سب خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے تھے۔ اب پاکستانی مسلمان بھی خوف اور اندیشوں کے گرد و غبار سے نکل کر سجل اور پُرسکون قوم بن کر اُبھرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ دھول میں اٹے ہوئے پژمردہ چہروں پر آزادی کے تاثرات ثبت ہو چکے تھے۔ آزادی کی اس بارش نے ہر طرح کے ہول اور وحشت کے کہر اور دُھند کو یکسر ختم تو کر دیا تھا۔ مگر جو لوگ ابھی تک مظلومیت اور درندگی کے اثرات میں مقید تھے، وہ آزادی کے مطلب کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ دلوں میں کدورت اور کینہ بھی تھا، گلے شکوے اور شکایتیں بھی تھیں۔

اس دفعہ کی عید حویلی والوں کو ایک نیا سبق سکھا گئی۔ بلکہ اس حویلی پر دو معصوم اور بے گناہ بچیاں رحمتِ باراں بن کر چھا گئیں۔ جبکہ اسی رات دلاور، بیٹی کا دُکھ سینے میں چھپائے منوں مٹی تلے دفن ہو گیا۔

◆◆○◆◆



چھاؤنی پہنچنے تک خوش بخت کی طبیعت ایسی مضمحل ہوئی کہ اُسے فوراً فوجی ہسپتال لے جانا پڑا۔ شاید دن بھر کی تھکان کے اثرات تھے یا حویلی کے ماحول کی گھبراہٹ تھی کہ اس کا دل بوجھل اور سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ بوجہ متلی اور نقاہت کے غنودگی طاری تھی۔ ڈیوٹی میڈیکل آفیسر نے خوش بخت کا چیک اپ کیا اور کچھ ٹیسٹ لکھ کر دے دیئے۔ رات سونے کے لئے عارضی دوا کا سہارا لیا۔ گھر پہنچنے تک طبیعت میں قدرے افاقہ بھی ہوا اور گہری نیند بھی اُس پر غالب آ گئی۔ جلال خان بھی تھکن سے چُور تھا۔ مگر فکرمندی نے اُسے سونے سے کوسوں دُور رکھا۔ ہلکی سی خوابیدہ روشنی میں وہ کسی پاکیزہ حور سے کم نہ لگ رہی تھی۔ چہرے پر بلا کی معصومیت اور سکون تھا۔ وہ اُسے دیکھتے ہوئے اپنی قسمت پر نازاں ہو رہا تھا۔ وہ اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے یک دم خوف زدہ ہو گیا کہ کہیں خوش بخت کو مجھ سے یہ ظالم سماج چھین تو نہیں لے گا؟ گاؤں میں یہ خبر ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ ورنہ قیامت برپا ہو چکی ہوتی۔

دوسرے دن ہسپتال سے واپسی پر پورچ میں والد صاحب کی کھڑی گاڑی دیکھ کر جلال خان چونک اٹھا۔

کال بیل پر بیرے نے دروازہ کھولا تو جلال خان سامنے والد اور بھائی کو بیٹھے دیکھ کر سراسیمگی کے عالم میں ڈوب گیا۔ خوش بخت نے مہمانوں کا حیرت سے جائزہ لیا۔ شلوار قمیض اور جیکٹ میں ملبوس، سر پر بھاری بھرکم شملہ باندھے، ہاتھ میں بندوق تھامے، دراز قد و قامت اور فربہ جسم والا مرد خاصا رُعب و داب والا لگ رہا تھا۔ پٹھان وضع چہرے پر غصہ و ناراضگی میں شعلہ برساتی آنکھیں اور تکبر و غرور سے تنی ہوئی بھنوئیں دیکھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کر وہ لرز اُٹھی۔ بغل میں ایسی ہی شکل و شباہت والا دوسرا مرد جو عمر میں زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہ دونوں رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ خوش بخت ڈر کے مارے کانپتی ہوئی اپنے کمرے میں جا گھسی اور دروازے کو اندر سے بند کر کے محفوظ ہوگئی۔ تمام ماجرا اُس کی سمجھ میں آنا کوئی امرِ دُشوار تو نہیں تھا۔ پُراسرار اور اجنبی مردوں کے چہروں پر رعونت کی نحوست نے اُسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ متلی سے دل منہ کو آنے لگا تھا۔ وہ بے بسی کے عالم میں آڑی ترچھی بستر پر گر گئی۔

یک دم اِک گرج دار آواز نے جیسے چھاؤنی کو ہلا کر رکھ دیا ہو۔ اُسے ایسے لگا جیسے اُس کا گھر زمین بوس ہو جائے گا اور وہ اس کے نیچے ہی دفن ہو جائے گی اور کوئی اس کا پُرسانِ حال نہ ہوگا۔

''اس لونڈیا کی خاطر تم نے اپنا خاندان چھوڑ دیا۔ جلال خان! ہم سے کس غلطی کا بدلہ لیا ہے؟'' باپ چیخ رہا تھا۔

جلال خان نے آگے بڑھ کر باہر کے دروازے کو قفل لگا دیا اور قریب آ کر مؤدبانہ انداز میں بولا۔

''آغا جی! آپ تشریف رکھیں۔ لمبے سفر نے آپ کو تھکا دیا ہوگا۔ آپ رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں، ناشتہ کر کے آرام کریں۔ پھر اس موضوع پر گفت و شنید کر لیں گے۔''

''جلال خان! تمہاری دیدہ دلیری اور بے لحاظی نے ہمیں زندہ درگور کر دیا ہے۔ کلثوم کی فریادیں اور بین، ماں کی گالیاں اور بددُعائیں تمہیں سُکھ کا سانس نہ لینے دیں گی۔'' بہار خان نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ہم تمہارے گھر آرام کرنے نہیں آئے۔ ذرا مہاجروں کی اولاد کو ہمارے سامنے تو لاؤ۔ جس کی یہ مجال کہ میری بچی کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے اتنا نہ سوچا کہ وہ ٹکر کس خاندان سے لے رہی ہے۔ اسے ہماری پشت در پشت کی بربریت اور اصلیت کی خبر نہیں۔ ہمارے خاندانی اصولوں اور قانون کا اندازہ نہیں۔ میں خود اُسے گولی مار کر گندے کیڑے کو اسی گھر میں دفن کر دوں گا۔ اس گھر میں تم نے اپنی آبادی کے نہیں، تباہی و بربادی کے جھنڈے گاڑے ہیں۔'' باپ نے زہر خند سے کہا۔

''آغا جی! آپ غصہ ٹھنڈا کریں گے تو بات ہو سکے گی۔ لالہ جان! آپ ہی انہیں



کچھ سمجھائیں۔'' جلال نے آہستگی سے کہا۔

''جلال خان! بڑے آغا جی کو ہمیشہ تمہاری طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ آخر تم نے وہ کر ہی دکھایا، جس کا اندیشہ تھا۔ یہ سب تمہاری غلامانہ ذہنیت اور گستاخ سوچ کے نتائج ہیں۔ بڑے آغا جی کا حکم ہے کہ ہم نے اس بے پردہ اور بے حیا عورت کو تمہاری زندگی سے نکالنا ہے۔'' لہجہ تحکمانہ تھا۔ بہار خان نے دھمکی کے انداز میں کہا۔ ''اگر تمہیں اس کی زندگی عزیز ہے تو یہ کرنا پڑے گا۔ سوچ لو۔ کیونکہ ایسی بھاگی ہوئی عورتوں کو ہمارا خاندان قبول کرنے میں کبھی بھی رضامند نہیں ہوا۔ اور پھر ہمارے خاندان کا سپوت ہمیں چھوڑ کر اس داشتہ کی آغوش میں زندگی گزار دے، ہماری شان اور عزت کو یہ بھی گوارا نہیں۔ اس میں جھگڑے کی یا مباحثے کی رتی بھر گنجائش نہیں۔''

''لالہ جان! یہ ناممکن ہے۔ مجھے اپنا خاندان، اپنے گاؤں کا ذرّہ ذرّہ قابلِ احترام ہے۔ لیکن میں آپ کے اصول اپنانے سے انکار کرتا ہوں۔ مجھے اعتراض ہے آپ کی جاہلانہ سوچ اور بے جا حاکمیت پر۔'' لہجہ خفت گیر تھا۔ ''پہلے ہی آپ کی خودداری اور انا نے دو معصوم زندگیوں کو جہنم کی آگ میں دھکیل کر ان کے مستقبل کو داغ دار کر دیا۔ کیا یہ میرا قصور تھا؟''

''قابلِ عزت خاندانوں کی روایات میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ اور آئندہ بھی ایسا ہی ہونے کے امکان ہیں۔ باہر کی غیر دنیا نے تمہارا خون سفید کر کے تم پر مغربی تہذیب کی مہر لگا دی ہے۔ اب رشتوں کی عظمت اور قدر و منزلت کی بے قدری، خاندان کی بدنامی اور رُسوائی کا رُوپ دھار چکی ہے۔ ہم گاؤں میں کس منہ سے دوسروں کے معاملات و مسائل کے فیصلے کریں گے؟ ہمارے اپنے گریبان میں سوائے غلاظت اور ندامت کے کچھ نہیں رہا۔'' بہار خان سمجھانے کی کوشش میں تھا۔

''تمہاری ماں کا خون تو بہت اعلیٰ اور عمدہ تھا۔ نہ جانے تم میں یہ ملاوٹ کہاں سے آئی ہے۔'' باپ نے زہر اُگلا۔ جلال خان خاموش رہا۔

''اب بولنے کے لئے تمہارے پاس کچھ نہیں رہا، جلال خان! کم بخت ایسی نامراد عورتیں ہمارے سامنے مجرا کر کے ہمارا دل بہلایا کرتی ہیں۔ تم نے اسے اس خاندان کی عزت کیسے بنا لیا؟ تمہاری تو عقل ہی ماری گئی۔'' بہار خان نے طنزیہ کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"خاندان، خاندان...... یہ لفظ بچپن سے سن سن کر میں اُکتا گیا ہوں۔ آپ کی نظر میں جابر، حرام خور، بڑے بڑے محلوں میں گوشہ نشین، رشوت اور کالے دھندے سے کمائی ہوئی دولت پر پہرہ دینے والے لوگ خاندانی کہلانے کے قابل ہوتے ہیں۔ میری سوچ میں میرا بیرہ، میرا ڈرائیور اپنے اخلاقیات کی وجہ سے قابلِ احترام اور قابلِ فخر خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں۔ میں اُن کی دل و جان سے عزت کرتا ہوں۔ جن میں تمیز اور بات کرنے کا سلیقہ نہ ہو، جہالت اور کم مائیگی کوٹ کوٹ کر بھری ہو، وہ خاندانی کیسے کہلا سکتے ہیں؟ لالہ جان! زمانہ بدل چکا ہے۔ آپ اپنے خاندان کی جھوٹی شان و شوکت کی دُھندلی اور غبار آلود پرچھائیوں سے باہر نکل کر دیکھیں کہ دنیا کتنی حسین ہے۔ اس حُسنِ جہاں کو آپ نے بے وجہ اپنے اصولوں کی بھینٹ چڑھا رکھا ہے۔" جلال خان نے ہمت کر کے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"کلثوم سچ کہتی ہے کہ تمہیں پاگل پن کی بیماری ہے۔ میرے ساتھ بات کرو۔" باپ نے خشم ناک آنکھوں سے گھورا۔

"آغا جی! آپ کے غصے کے سامنے بات کرنا فضول ہے۔ آپ نہیں سمجھیں گے۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"غصہ غیرت کی علامت اور مرد کی شان ہے۔ لیکن تم نے یہ سب کچھ بھُلا کر خود کو پستی میں گرا لیا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ میری بات غور سے سنو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ ورنہ زیاں تمہارا ہے، ہمارا نہیں۔" باپ نے اُس پر یاس انگیز نگاہ ڈالی۔

"آپ میرے فیصلے سے سمجھوتہ کر لیں تو بہتر ہوگا۔ دوسری شادی ایسی انہونی بات تو ہرگز نہیں۔ ہمارے خاندان کے مردوں نے ایسا سب کچھ کیا ہوا ہے۔ اسے گناہ یا ذلت آمیز حرکت کہنا بجا نہیں ہوگا۔ کلثوم کو میرا پیغام دے دیجئے گا کہ اُس نے بہت دیر کر دی ہے۔ وقت کسی کا منتظر ہوئے بغیر ہی صدیوں کو پھلانگتا ہوا گزر جاتا ہے اور اپنے پیچھے لاتعداد تلخ و ترش یادیں اور پچھتاوے چھوڑ جاتا ہے۔ خوش آئند وقت وہ ہے، جس پر آپ کا غلبہ ہو۔ اس کی پہچان اور شناسائی سے فیض یابی حاصل کرنا ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگر رُک جائے تو یہ زندگی، یہ دنیا ساکت و جامد ہو کر ختم ہو جائے۔ آج وقت میرے قبضے میں ہے، اس سے فائدہ اُٹھانے میں، میں حق بجانب ہوں۔ تم نے اپنے



وقت کو دھتکارا، اس کی قدر نہیں کی۔ یہ بے وفا کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ اس کے بے شمار روپ اور ہر طرح کے چہرے ہیں۔ یہ میرا قصور نہیں، اس وقت کا ہے جس نے میری زندگی کے ساتھ وفا اور انصاف کا رشتہ قائم کر کے خود کو قصوروار ٹھہرا لیا ہے۔ جس کا چہرہ کلثوم کے لئے اس سے بالکل برعکس ہے۔" وہ گلوخلاصی کرنا چاہ رہا تھا۔

"جلال خان! میں سمجھ گیا ہوں، تم ہماری نسل خراب کرنے پر تُل گئے ہو۔ یاد رکھو! یہ بازاری اور پیسے کی پُتری جب تمہیں کنگلا کر کے آسمان میں تھگلی لگا لے گی تو پھر تمہیں اپنی پاک دامن بیوی کی قدر ضرور آئے گی۔ مگر دیر ہو چکی ہوگی۔" باپ کے لہجے میں بے پناہ کرب تھا۔

"آغا جی! خدا کا خوف کریں۔ خوش بخت میری منکوحہ ہے۔ میری اور آپ کی عزت کی پاسبان بن کر ہمارے ساتھ رہنے کو تیار ہے۔ آپ اپنی انا اور غرور کو بالائے طاق رکھ کر اسے اپنے سینے سے لگا کر بیٹی تسلیم کر لیں۔ ہمیں آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے، نہ کہ ناراضگی کی۔" لہجہ خوشامدانہ تھا۔

"ناممکن۔ میں تمہیں گولی سے اُڑا دوں گا جلال خان! تم مجھے ہار ماننے کی ترغیب دے رہے ہو۔" باپ نے بندوق تان لی۔

"میری زندگی بندوقوں کے سائے تلے گزری ہے آغا جی! اس کو نیچے ہی رکھیں۔ آپ کی اولاد ہوں۔ کیا خیال ہے، بندوق مجھے بزدل اور ڈرپوک بنا دے گی اور میں خوش بخت سے جڑے ہوئے اس بندھن کو توڑ دوں گا؟ خوش فہمی ہے آپ کی۔" وہ ان کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "مجھے معاف کر دیں آغا جی! اور خوش بخت کو اپنا پیار اور دعا بخش دیں۔ اس کا تعلق بے حد شریف اور تعلیم یافتہ خاندان سے ہے۔ آپ اس سے مل کر تو دیکھیں۔"

"جلال خانؔ! مجھے دوسروں کی غلاظت ہضم کرنے کو مت بولو۔ دُور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ یہ سارا بگاڑ، آغا جی کے بے جا لاڈ و پیار کا نتیجہ ہے۔"

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

جلال خان کی باپ اور بھائی سے کبھی گستاخی، کبھی نرمی اور خوشامد نے کوئی کام نہ کیا۔ وہ اپنی ضد پر ڈٹے ہوئے تھے۔ جلال خان، خوشِ بخت کے خلاف ایک لفظ سننے کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com



تیار نہ تھا۔ خوش بخت کمرے میں بیٹھی تمام گفتگو سن کر اندازہ لگا چکی تھی۔ اس کا ڈھانچہ سمجھ آنے میں اسے کوئی دقت پیش نہ آئی تھی۔

جلال خان نے دروازہ کھٹکھٹایا اور زوردار لہجے میں بولا۔

”خوش بخت! باہر آؤ اور سامنا کرو ان سماج و رواج میں مقید میرے رشتے داروں کا۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا، نہ ہی کسی پر ظلم کیا ہے۔ تمہاری شادی میں تمہارے والدین کی پسند اور رضامندی شامل تھی۔ اور تم نے فرمانبردار بیٹی کا ثبوت دیتے ہوئے اس پر آمادگی کا اظہار کیا تھا۔ میرے خاندان کا بڑا پن تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ اب ڈر کس بات کا؟ عظیم تم ہو۔ سر اونچا کر کے چلو ان سب کے سامنے۔“

وہ سر کو دوپٹے سے ڈھانپ کر ان کے سامنے آئی اور سلام پیش کیا۔ وہ حُسن و تقدس کے اس مجسمے کو چند لمحے سر سے لے کر پاؤں تک تکتے رہے۔ ناقدانہ انداز میں جائزہ لیتے سوچ میں ڈوب گئے۔ ہمارے گورے سپاہی کو ایسی بیوی چاہئے تھی، جو خوب صورت ہونے کے ساتھ پڑھی لکھی اور انگریزی تہذیب میں ڈھلی ہوئی ہو۔ کہاں کلثوم بے چاری اور کہاں یہ جوان دوشیزہ۔ اب انہیں یقین ہو چلا تھا کہ جلال خان پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ وہ غیظ و غضب میں پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئے۔ انہیں ٹھوس جواز مہیا ہو چکنے کے بعد ان پر یقین بھی ہو چکا تھا۔ سب کچھ بہت برا ہوا۔ خوشی، شرمندگی اور تاسف نمایاں تھا۔

”ان کو واپس لے کر آئیں خان صاحب! ان کی انہی قدموں پر واپسی ہمارے لئے قابلِ ندامت اور قابلِ ذلالت ہے۔“ وہ نرمی سے بولی تو لال خان تیزی سے باہر نکلا اور انہیں زبردستی گیسٹ روم تک لے آیا۔

خوش بخت نے سامنے جانے سے پرہیز ہی کیا۔ لیکن ان کی وہ خاطر و مدارات کی کہ مارے حیرت کے وہ پھر ایک لفظ نہ بول سکے۔ اُس کی مہمان نوازی اُس کے خاندانی پن کی کھلم کھلا غمازی کر رہی تھی۔

خوش بخت اپنی جگہ سوتن کے رشتے کا سوچ کر اپنی ہی نظروں سے گر گئی۔ اُن کا جلالی پن، اُن کے غیر مہذب القابات سب کچھ ہی فطری عمل کا نتیجہ تھا۔ وہ اُسے گلے لگا کر اس کے سہاگ کو تسلیم کرنے نہ آئے تھے بلکہ اس کو اپنے بیٹے کی زندگی سے دُور کرنے کے منصوبے کے تحت تشریف لائے تھے۔ صفائے قلب، عفو و درگزر کی توقع رکھنا اور اس



ربط و ضبط کو نبھاتے چلے جانا ان کے لئے آسان کام نہ تھا۔ وہ مارے ندامت کے جلال خان کا سامنا کرنے سے بھی کترا رہی تھی۔ عزتِ نفس کو لگے ہوئے اس دھچکے نے لامحالہ اُسے بے ثبات اور غیر محفوظ کر دیا تھا۔ اپنی ذہنی و اعصابی جنگ میں ملوث وہ اپنے مراق سے باہر آ چکی تھی۔ کانوں میں زہر گھولتی ہوئی آوازیں دماغ پر آسیب کی طرح مسلط ہو کر رہ گئی تھیں۔ آہ! یہ اتنی لمبی زندگی کیسے گزرے گی؟...... اُس نے کروٹ بدلتے ہوئے خود کلامی کی۔ پچھتاوا انگ انگ سے اُبل رہا تھا۔

ایک دم سے اُسے اُبکائی آئی اور وہ غسل خانے میں بھاگ گئی۔ شاید ذہنی انتشار تھا یا دل پر چھایا ہوا غبار تھا کہ وہ قے کرتی چلی گئی۔ واپس پلنگ پر نیم بے ہوش ہو کر گر گئی۔

دوپہر تین بجے جلال خان نے دروازے سے ہی خوشی کے نام کی مخصوص سیٹی بجائی جسے سن کر خوش بخت گھر کے کسی بھی کونے میں ہو، ہمیشہ سب کچھ چھوڑ کر اس کی طرف بھاگ پڑا کرتی تھی۔ مگر آج گھر میں ہُو کا عالم تھا اور حسرت و یاس کی پرچھائیوں نے اُسے چونکا دیا۔ وہ بے کلی اور بے قراری سے کمرے کی طرف لپکا۔ خوش بخت کو بے سُدھ دیکھ کر گھبرا گیا۔

”خوشی! کیا ہوا؟“ وہ اُسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”تم نے مجھے فون کر دیا ہوتا۔“

خوش بخت نے پُرنم آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

”تیار ہو جاؤ۔ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ تم ایسے تو کبھی نہ تھیں۔“ وہ فکرمند ہو گیا۔

”تمہاری رپورٹیں تو کل ملیں گی۔“

”تو پھر کل ہی چلے چلتے ہیں۔“ اُس نے بمشکل کہا اور اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”ارے طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟“ وہ مزید پریشان ہو گیا۔ ”چلو اُٹھو۔ ابھی اور اسی وقت جانا ضروری ہے۔ تمہاری آنکھوں میں اتنے ڈھیر سارے آنسو۔ کوئی اور وجہ تو نہیں؟“ وہ سوچ میں پڑ گیا اور خوش بخت اشک بہاتی رہی۔

کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے اُس کی دُکھتی رگ پر بڑی ملائمت سے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو پیوست کرتے ہوئے کہا۔

”آئی ایم سوری خوش بخت! مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے مجروح احساسات و

www.iqbalkalmati.blogspot.com



جذبات کو محسوس کر سکتا ہوں۔ جب میں نے اپنی خوشیاں، اپنی تمام تر محبتیں اور چاہتیں، اپنے دل کی ہر دھڑکن تمہارے نام کر دی ہے تو پھر پچھتاوا اور خدشہ کیوں؟ کیا میں اپنی تنہائیوں اور تاریکیوں کو دُور کرنے میں حق بجانب نہیں تھا؟ میں نے بے انصافی نہیں کی۔ تمہاری قربت اور رفاقت میرے آنے والے دنوں کا شاندار پیغام ہے خوش بخت! تمہاری پریشانی اور مایوسی مجھے احساسِ جرم کی جانب دھکیل دے گی۔ مجھ پر یہ ظلم نہ ڈھانا۔ خاندان والے تمہیں قبول کرتے ہیں یا نہیں، تمہارا ان سے کوئی سروکار، کوئی واسطہ تعلق نہیں۔ یہ سب کچھ اچانک ہونے کی مجھے بھی پریشانی لاحق ہوئی ہے۔ بعض اوقات انسان حالات کے دھارے میں نہ چاہتے ہوئے بھی بہتا چلا جاتا ہے۔

"اسی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے آپ کی سچائی اور وفا پر پورا بھروسہ ہے۔ دوسری عورت کے شوہر پر قابض ہو کر اُسے ذلالت کی دلدل میں پھنسا دینے والی عورت قابلِ تکریم کیسے ہوتی ہے؟ میری اس نئی زندگی کے سفر میں سب کچھ ہی نیا ہے۔ ایک نیا پن اور سہی۔"

"ہم نے جو محبت کی شمعیں جلائی ہیں، ہم نے انہیں تند و تیز طوفانوں اور آندھیوں سے بچانا ہے۔ تمہاری وفا اور عطا کی مضبوطی مجھے زمانے سے ٹکر لینے کی قوت اور حوصلہ بخشے گی۔ اب گھبرانے اور خود کو لعن طعن کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم دونوں نے سمندر کی اَن دیکھی گہرائیوں میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چھلانگ لگا دی ہے۔ شارک اور بڑی مچھلیوں کی غذا بننے سے پہلے ہی ہمیں سمندر کی گہرائیوں سے نکل کر دوسرے کنارے تک خیر و عافیت سے پہنچنا ہے۔ یہی ہماری زندگی ہے۔" لہجے میں بے پناہ ہمت تھی۔

"بس میری ایک بات یاد رکھیے گا۔ آپ کی شرافت اور دھیما پن ہماری خوشگوار زندگی کو آہوں اور مایوسیوں سے بچا سکتا ہے۔ آپ نے ثابت قدم اور چٹانوں کی طرح مضبوط رہ کر اپنے فیصلے کو منوا کر مجھے اس خاندان میں بہو کا مقام دلوانا ہے۔ ورنہ آپ کا خاندان مجھے با آسانی تلوار کے زور پر طلاق دلوانے میں کامیاب ہو جائے گا۔" وہ سہمی ہوئی تھی۔

"اب پتہ چلا۔ جاناں کے دل میں شک کی گرہ پڑ گئی ہے، اسی لئے پریشانی حد کو چھونے لگی ہے۔ ہے نا اسی طرح؟" اس کے لہجے میں ناگواری کی ہلکی سی رمق نہ تھی۔ وہ



مسکرا رہا تھا۔ "جانِ من! ابھی تو تم نے سیڑھی پر پہلا قدم رکھا ہے، بس گھبرا گئی۔ طوفانوں سے مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں ایک دوسرے کا سہارا لے کر چلنا ہے۔"

"نہ جانے اپنی جگہ بنانے کے لئے مجھے کتنی سیڑھیاں اور طے کرنا ہوں گی۔ میرے لئے آنے والا کل پُراسرار بھید اور تجسس لئے کھڑا ہے۔ خدا تعالیٰ میرے دل کو چٹانوں جیسی سختی اور زمین جیسی فراخی نصیب کر دے۔ میں جس آغوش کی حدت میں پل کر جوان ہوئی ہوں، وہاں مایوسی اور آہ و بکا کا سبق نہیں دیا جاتا۔ گرد و پیش کے ہر طرح کے حالات میں حوصلے بلند رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اپنے حقوق کے حاصل کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ مجھے صرف آپ کا مضبوط سہارا چاہئے۔" وہ سنجیدگی سے بول رہی تھی۔ لہجے میں ہمت عود کر آئی تھی۔

"زندہ باد۔" جلال خان نے نعرہ لگایا۔ "یعنی چھینا آتا ہے۔ تمہاری شخصیت و کردار کا یہ انوکھا اور نرالا پوشیدہ روپ پسند آیا۔" اُس نے اسے سینے سے بھینچ کر اس پر بوسوں کی بارش کر دی۔ اس کی حوصلہ مند باتوں پر وہ لٹو ہو چکا تھا۔ دل میں اُمڈنے والی اُمنگیں، من میں پھوٹنے والی چاہتیں، اپنا کامل ایمان، اپنی متاعِ حیات، اپنے ہوش و حواس، اپنی تعلیم کے بیش بہا خزانے اور تجربات، بس جو کچھ اس کے پاس اس وقت موجود تھا، سب کچھ اس پر نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ اور وہ آنکھیں موندے طلسماتی دنیا میں کھو گئی۔

❖❖○❖❖

وہ طبیعت کی ناسازی کے باوجود اپنے بستر پر بی اے کی کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ اُس نے چھاؤنی کے کالج میں داخلہ لے کر سب کے سامنے ایسی مثال قائم کر دی تھی کہ شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔ کئی افسران کی بیگمات بھی اس کے ساتھ شامل ہو چکی تھیں۔ حالانکہ ان پر بچوں کی نگہداشت کی ذمہ داریاں بھی عائد تھیں۔ خوش بخت کا اپنا نام، اپنی ذات کی پہچان جلال خان کے لئے بہت اہم تھی۔ کئی رشک و حسد کرنے والے افسران نے یہاں تک کہہ دیا کہ جلال خان اپنی حسین و جوان بیوی کو اپنی ترقی و مرتبے اور اپنے شاندار مستقبل کا پُل بنا کر کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com



اُڑتی ہوئی افواہوں کو وہ شیرِ مادر کی طرح پی جاتا۔ اُس کے مزاج میں رتی بھر تبدیلی رونما نہ ہوتی تھی۔ اُس نے اپنے روّیے اور وطیرے سے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ جہاں مرد کی کامیابی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، وہاں ایک کامیاب اور اپنا نام برقرار رکھنے والی عورت کے پیچھے اس کے شوہر کا بھی ہاتھ ہوسکتا ہے۔

آج جلال خان کے لبوں پر سیٹی کے بجائے شیرینی سے لبریز اِک نام گونج رہا تھا۔

''خوشی!.......خوشی! کہاں ہو؟...... یہ دیکھو، میں کیا خبر لایا ہوں؟''

وہ پلنگ سے اُتر بھی نہ پائی تھی کہ جلال خان جھومتا لہراتا کمرے میں پہنچ گیا۔ ''یہ تمہاری ٹیسٹ رپورٹ۔ مبارک ہو۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ابھی کیسا محسوس کر رہی ہو؟'' وہ اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔ بھوک تو جیسے مر ہی گئی ہو۔ ہر وقت کی غنودگی نے زندگی کو بے کار اور بے مصرف بنا کر رکھ دیا ہے۔ تشنگی ایسی کہ بجھائے نہ بجھے۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے خان صاحب!'' وہ خفقان زدہ آواز میں بولی۔

''تم ماں بننے والی ہو۔'' جلال خان نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اس انکشاف پر وہ مارے حیا کے لال ہوگئی۔ نگاہیں جھک گئیں۔

''اب خوش وخرم رہ کر اپنی کوکھ میں اس کی پرورش کرو۔ اس بچے کی شخصیت تمہارے مزاج کے مرہونِ منت ہے۔ خوش بخت! ڈاکٹروں نے ریسرچ کی ہے کہ ماں اپنی اولاد کو جیسا دیکھنے کی خواہش مند ہو، ویسے ہی سانچے میں خود کو ڈھال لے۔ ہمیں خوش مزاج، تندرست وتوانا بچہ چاہیئے۔ خوش بخت جیسا باحوصلہ اور میرے جیسا جان نچھاور کرنے والا۔'' وہ خوشی میں بولے جا رہا تھا۔ ''اور ہاں...... ہم اس کو ڈاکٹر بنائیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟''

وہ شرمائی لجائی صرف اتنا کہہ پائی۔ ''آپ نے شیخ چلی کا نام تو سنا ہوگا نا۔'' من میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ حسین ومقدس اور عظمت سے بھرپور رشتے میں منسلک ہونے کے احساس سے اس کے اندر فخر کی لہر دوڑ گئی۔

چند دن پہلے رونما ہونے والے واقعات کے خدشات یک دم کاملِ یقین اور خود اعتمادی میں بدل گئے۔ بچوں کا میاں بیوی کی زندگی میں شامل ہونا اِک اٹوٹ بندھن



سمجھا جاتا ہے۔ اماں گُل عموماً یہ بات کہا کرتی تھیں کہ عورت ماں بن کر میاں کے گھر میں اپنے مضبوط قدم جما سکتی ہے۔ ورنہ رشتہ کچے دھاگے کے مانند ہے۔ جس کے ٹوٹنے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔ سوچتے ہوئے ہلکی سی مسکان اس کے لبوں پر پھیلی ہوئی تھی اور جلال خان نہال ہوئے جا رہا تھا۔

❖❖○❖❖

وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا۔

جلال خان کا گاؤں سے رابطہ ٹوٹنا فطری امر تھا۔ دونوں طرف نہ ٹوٹنے والی خاموشی چھا چکی تھی۔ خوش بخت اپنی زندگی میں لحظہ بہ لحظہ مطمئن اور پُرسکون ہوتی گئی۔ رضا خان کی آمد نے اس کے من میں اُٹھنے والے تمام اندیشوں کو ختم کر دیا تھا۔

جلال خان نے ماں کو خط لکھ کر یہ خبر سنانا ضروری سمجھا۔ مگر جواب موصول نہ ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب اس کا خاندان اپنی خفگی اور لاتعلقی سے اسے تنہا اور کمزور بنانے پر تُلا ہوا ہے۔ بہن بھائی اور والدین کا خون بھی پیار کی حرارت میں جوش نہ مار سکا۔ وہ جانتے تھے کہ کوئی غیرت مند مرد اپنی جورو کی خاطر اپنے خونی رشتوں، اپنے گاؤں، اپنے علاقے اور اپنے آبائی گھر کو خیرباد نہیں کہتا۔ کیونکہ یہ عمل اُس کی مردانگی اور انا کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ نئی جوان خوب صورت بیوی کا نشہ، مستی اور خمار کے ٹوٹنے کے انتظار میں وہ خود کو جھوٹی سچی تسلیاں دے کر بہلاتے رہتے تھے۔ آج کی خبر اُن پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ مبارک کے بجائے افسوس کرنے والے ہمدردوں کا تانتا بندھ گیا۔ تمام دعائیں کلثوم کے حصے میں اور ہر طرح کی بددعا، خوش بخت کے لئے منسوب کر دی گئی۔ کلثوم مکھی کی طرح ہاتھ ملتی سوچے جا رہی تھی۔ شوہر کو دوبارہ پالینے کی آس بھی گئی، بچوں کا باپ بھی گیا۔ اُس کے خالی دامن میں سوائے آنسوؤں کے کچھ نہ رہا تھا۔

❖❖○❖❖

بیرے نے گھنٹی بجتے ہی دروازہ کھولا اور سیدھا جلال خان کی طرف چلا گیا، جو کتاب پڑھنے میں منہمک تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

''صاحب جی! گاؤں سے منشی جی آئے ہیں۔'' بیرے نے ایپرن کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''خدا خیر کرے۔ اُنہیں بٹھاؤ۔ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ میں آتا ہوں۔'' جلال خان کتاب بند کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دل ایک دم مضمحل سا ہو گیا تھا۔ منشی جی کا آنا کوئی عام سی بات نہ تھی۔ گاؤں میں جب بھی کوئی پریشان کن حادثہ پیش آتا تو منشی جی ہی پیغام رسانی کا فرض ادا کیا کرتے تھے۔ ٹیلی گرام یا فون سے رابطہ تو ناممکن تھا۔ فوری طور پر اطلاع کا یہ طریقہ آغا جی کو بہتر لگتا تھا۔

جلال خان برآمدے میں انتظار کرتے ہوئے منشی جی کے پاس مصافحہ کے بعد بیٹھ گیا۔

''منشی جی! خیریت تو ہے؟'' لہجے میں فکرمندی تھی۔

''اللہ خیر کرے گا۔'' وہ اپنی پشاوری ٹوپی ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔ ''معمولی سی پریشانی ہے۔ بچے بڑے ناسمجھ اور کمسن ہیں۔ خوامخواہ بات بڑھا دی انہوں نے۔''

''منشی جی! آپ کھل کر بات کریں۔ یہ گول مول، اشاروں کی زبان کو سمجھنا ذرا مشکل ہے۔'' وہ جھنجلا گیا۔

''خان جی! شیر خان اور دلیر خان کی چند دن ہوئے، بازو والے گاؤں کے نمبردار کے بیٹوں سے کھیل کود میں ہی توں توں، میں میں ہو گئی۔ بات بڑھتے بڑھتے ہاتھا پائی تک آ گئی۔ اور لڑائی، لسی کی طرح بڑھتی چلی گئی۔ دونوں طرف کے بزرگ بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ سارا معاملہ ایسا گمبھیر ہو گیا ہے کہ اب دونوں لڑکوں کو گھر میں قید کر کے اُن کی جان کی حفاظت کی جا رہی ہے۔ حتی الامکان کوشش کے باوجود شیر خان اور دلیر خان اپنے مخالف پارٹی کے لوگوں کو قتل کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ خان جی! ایسی وارداتوں کی ایک عمر اور وقت ہوتا ہے۔ ابھی تو انہوں نے ہوش بھی نہیں سنبھالا۔'' منشی جی کا لہجہ فکرمندانہ تھا۔ یہ مژدہ خاصا تکلیف دہ تھا۔

''آغا جی کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟ کیا کروں کہ بچوں کی حماقتوں اور نالائقیوں کے اثرات سے ہمارا خاندان محفوظ رہے؟ ان کا خط پڑھ کر اندازہ ہو جائے گا کہ میرے لئے کیا حکم ہے۔'' جلال خان نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''میرے یہاں آنے کی خبر آغا جی کو بالکل نہیں۔ کیونکہ آغا جی خود وہاں کے حالات و واقعات کو اپنے قبضے میں لے کر باہمی اتفاق سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ خان جی! میرے باپ دادا نے آپ کے گھر کا نمک کھایا ہے۔ میں اس گھر میں کھیل کود کر جوان ہوا ہوں۔ یہ بچے میرے ہاتھوں میں پلے ہیں۔ میرے کانوں تک پہنچنے والی قیاس آرائیاں قابلِ تسکین نہیں۔ مجھے دشمنوں کے تیور اور اُڑتی افواہوں سے بہت بڑے فساد کی بُو آ رہی ہے۔ آپ کے ساتھ میری وفاداری اور نمک حلالی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میرا آپ کو تمام حالات سے باخبر رکھنا بہت ضروری محسوس ہوا۔ آخر وہ آپ کی اولاد ہے۔ کل کلاں ان پر کوئی وار ہو جاتا ہے تو سب سے زیادہ دکھ آپ کو ہی پہنچے گا۔ مختصر کو زیادہ سمجھیں کہ شیر خان اور دلیر خان کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں۔ سب سے پہلے دونوں گاؤں کے چھوٹے بڑے بچے ایک دوسرے سے لڑنے مرنے کو پہنچ گئے۔ جو بندوق اور پستول حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے، انہوں نے کدالیں اور پھاوڑے اُٹھا رکھے تھے۔ اس لئے کافی بچے زخمی ہوئے ہیں۔ شیر خان اور دلیر خان کو بھی معمولی چوٹیں آئی ہیں۔ دونوں طرف کے بزرگوں کی دخل اندازی سے بیچ بچاؤ تو ہو گیا، مگر اب وہ لوگ شیر خان اور دلیر خان کو اغوا کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ ہمارے گاؤں کا یا اُن کے گاؤں کا کوئی فرد ایک دوسرے کے گاؤں کی حد کو پار کرتا ہے تو اُسے پکڑ کر زدوکوب کرنے کے بعد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ناچاقیاں اور دشمنیاں روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ دوسرے قبائلی دُور سے تماشا دیکھ کر طرفین کو جھگڑے پر اُکسا رہے ہیں۔ ان کو غیرت اور خودداری کی شہ دے کر غصے کو بھڑکانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔'' وہ فکرمند تھا۔

''منشی چاچا! تم نے مجھے بروقت تمام حالات سے باخبر کر کے میرے خاندان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔'' اس کا لہجہ تشکرانہ تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم تو آپ کے جوتوں کے بھی غلام ہیں۔ آپ کے خاندانی تمام حالات میری قلم کے نیچے ہیں۔ اس دفعہ میری گویائی، فرائض کے زمرے میں آ گئی خان جی! بی بی جی بھی بہت پریشان ہیں۔ انہوں نے مجھے دو دفعہ بلا کر التجا کی کہ سب کو بتائے بغیر بچوں کے باپ کو اطلاع دی جائے۔ مگر میری ہمت نہ ہوئی کہ آغا جی کی حکم

www.iqbalkalmati.blogspot.com



عدولی کروں۔ کسی سے مشورہ کیے بغیر ہی میں آپ تک پہنچ گیا ہوں۔ اب آپ نے ہی میرا دھیان رکھنا ہے۔'' وہ قدرے خوف زدہ لگ رہا تھا۔

''اس کی فکر مت کرو منشی چاچا! تم اتنی دیر میں کھانا کھاؤ۔ میں جانے کی تیاری کرتا ہوں۔''

''خان جی! مجھے لگتا ہے کہ اب بی بی جی، بچوں سمیت آپ کے ساتھ رہنے کو تیار ہو جائیں گی۔'' وہ رازداری سے بولا۔

''اب بہت دیر ہو گئی ہے کلثوم بیگم! وقت تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔'' جلال خان منہ میں بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔

رات کے دو بجے جلال خان اپنے دو سپاہیوں کے ہمراہ گاؤں پہنچ گیا۔ اس کے قلعہ نما گھر کے آس پاس کئی افراد بندوقیں اُٹھائے پہرہ دے رہے تھے۔ کچھ موٹے ڈنڈوں کا سہارا لئے ہوئے تھے۔ گھر کے اندر داخل ہونے کے بعد علم میں آیا کہ بیٹھک میں آغا جی اپنے بیٹوں کے ساتھ بیٹھے حفاظتی تدابیر کے طریقے ان کے گوش گزار کر رہے ہیں۔

پریشانی، ماحول میں رچی بسی ہوئی تھی۔ جلال خان کو دیکھ کر انہوں نے سکون کی لمبی سانس لی۔ تمام گلے شکوے اور شکایتوں کو بالائے طاق رکھ کر سب ایک دوسرے سے شیر وشکر ہو کر اس نئی دشمنی سے مقابلہ کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ جبکہ جلال خان کا طبعاً اس نئی دشمنی کو طول دینے کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔ راہ و رسم اور قرابت داری تعلق میں بچوں کی نا اہلی اور نادانی کو بے حد و بے کراں وسعت دے کر ذہنی اختراعات کو بڑھانا اور فتنہ گری اور قتل و غارت کی طرف مائل ہونا سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ کیونکہ قبائلی علاقوں کی دشمنیاں، آئے دن کا خون خرابہ، تھانوں میں معصوم بے گناہ اور عاقبت نااندیش لوگوں کی حاضری اور زدوکوب اِک مشغلہ بن جاتا۔ خان اور سردار پسِ پردہ اس گھناؤنے کھیل کا حصہ بن کر خود کو تو محفوظ کر لیتے مگر غریب اور مفلس اپنی مجبوریوں اور بے بسی کا شکار ہو کر ان کے جاہ و جلال کو مزید جلا بخش کر انعام وصول کرنے کو اپنی جان سے زیادہ اہمیت دیتے۔ صدیوں سے ایسے ہی ہوتا آیا تھا۔ جلال خان ان دستوروں اور ان کی ظالمانہ منطق کی ہمیشہ سے ہی مخالفت کرتا آیا تھا۔ وہ مستعدی اور ہوشیاری سے اس معاملے کو گفت وشنید اور صلح جو انداز میں حل کرنے کا خواہش مند تھا۔ اُس کے بیٹے کمسنی



اور کچے ذہن کی وجہ سے اس کے سخت خلاف تو تھے ہی، مگر ایک باپ کے رشتے کا اپنا دبدبہ برقرار تھا۔ اُس نے ڈرے سہمے بیٹوں کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ وہ باپ کے سینے سے آ لگے۔ اُس کی شفقت کی حدت اور رشتے کی لگاوٹ کے احساس نے اُنہیں موم بنا دیا تھا۔ اشکبار آنکھیں مارے ضبط کے لال ہو گئیں۔ چہرے پر ندامت اور مفلوج کیفیت بتدریج چسپاں تھی۔ اس کی قربت میں وہ بے انتہا بے عذر اور بے ضرر لگ رہے تھے۔ باپ نے اپنے تپاک اور ربط سے ان کو حوصلہ اور تسلی دینے کی کوشش کی۔ ان کے ساتھ چلنے کے وعدے کیے تو باپ کا وجود اور سایہ اور اس کی لگن کی حقیقت اور سچائی ان کے لئے تحفظ کا قلعہ بن گئی۔ باپ اور بیٹوں میں فاصلوں کی دیواریں معدوم اور کمزور ہوتی نظر آنے لگیں۔

گاؤں کے تمام لڑکوں کو جلال خان نے اپنے حجرے میں بلایا ہوا تھا۔ صبح ہوتے ہی سب پہنچ گئے۔ باتوں اور چھیڑ چھاڑ میں مگن تھے۔ ماحول میں کھی کھی اور ہی ہی کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ جلال خان کے دونوں باوردی سپاہیوں نے انہیں اپنی زبان اور وطیرے سے ان پر قابو پانے کے بعد جلال خان کو یہاں بلالیا۔

تیرہ سالہ شیر خان اور دلیر خان تو پہلے ہی سے باپ کی موجودگی میں مدبر بنے بیٹھے تھے۔ جلال خان نے ہر بچے سے خود جا کر مصافحہ کیا اور ہر ایک کا حال دریافت کیا۔ اس نئے تجربے نے تمام بچوں کو حیرت و اشتیاق میں ڈال دیا۔ فوجی وردی میں ملبوس جلال خان ان کو کسی اور سیارے کی مخلوق لگا۔ اُس کے رُعب و دبدبہ اور شان و شوکت کے ساتھ غریب پروری اور اخلاق و تمدن نے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ دیہاتی لوگوں کو سدھارنے کی کنجی ہی یہی تھی۔ ان سے ڈانٹ ڈپٹ کر گدھوں کی طرح کام تو لے سکتے ہیں مگر انہیں اخلاقیات کے اصولوں پر چلانے کے لئے رنگ ڈھنگ اور طریقہ اس کے بالکل برعکس ہونے کی ضرورت تھی۔ جلال خان نے اپنی خوش گفتاری اور نرم مزاجی سے ان سب کو اپنا پیغام سنانے کے لئے تیار کر لیا۔

''آپ سب کو یہاں اکٹھا کرنے کا ایک مقصد ہے۔ آج میں آپ کو ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ آپ میرے بچے ہیں؟'' جلال خان نے مسکراتے ہوئے سب کو مخاطب کیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"کہانی۔" مکھیوں کے بھنبھنانے جیسی ہلکی سی صدائیں ماحول میں پھیل گئیں۔

"ہاں، کہانی سناؤں گا۔ اپنی کہانی کہ میں فوجی کیوں بنا۔" لہجہ بہت خوشگوار تھا۔

"ہم کہانی سنیں گے۔" سب نے بلند آواز میں کہا تو جلال خان نے اپنی بیتی ہوئی زندگی کے ہر ورق کو ان کے سامنے کھول دیا اور آئندہ زندگی کا نصب العین بھی گوش گزار کر دیا۔

"کہانی پسند آئی کہ نہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"بہت پسند آئی۔" سب نے کھی کھی ہنستے ہوئے باآوازِ بلند کہا۔

"تو پھر اس سے سبق کیا سیکھا ہے میرے بہادر بچوں نے؟" وہ اُن کے حوصلے بلند کرنا چاہ رہا تھا۔

"مجھے بھی فوجی بننے کا شوق ہو گیا۔" ایک سولہ سالہ لڑکا کھسیانی سی ہنسی میں بولا۔

"یہ فوجی بنے گا۔ ہر سال فیل ہوتا ہے۔ دن بھر گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلتا ہے۔ باپ کی مار کھاتا ہے۔" کئی بچوں نے اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے بیک زبان ہو کر کہا۔

"گلی ڈنڈا کھیلنے والے بچے بھی فوجی بن سکتے ہیں۔" حوالدار نے اونچی آواز میں کہا۔ "میری مثال آپ سب کے سامنے ہے۔ میرا بچپن بھی ایسے ہی گزرا تھا۔ آخر گاؤں کے سردار نے مجھے فوج میں بھرتی کرا دیا۔ آج تک ان کو دعائیں دیتا ہوں۔ بیوی بچے میرے ساتھ ہی رہائش پذیر ہیں۔ سب فوجی سکولوں میں بہترین تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اپنے خاندان کی نوک پلک سنوار لینا ہی قومی و ملکی خدمت ہے۔"

تمام لڑکے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھنے لگے۔ کئی ایک دوسرے کو کہنیاں مار کر اس کی کہانی سے لطف اندوز ہونے کا اظہار کر رہے تھے۔

"تو پھر کون خوش نصیب فوج میں جانا چاہے گا؟ ذرا ہاتھ تو کھڑا کریں۔" جلال خان نے ملائمت بھرے لہجے میں کہا تو اس کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے اس کے اپنے بیٹوں نے رضامندی میں ہاتھ اُٹھا دیئے۔ اب ہر بچہ ہاتھ اُٹھائے ہوئے تھا۔

"سب اپنا نام حوالدار صاحب کو لکھوا دیں۔ جو فوج میں کسی وجہ سے نہ جا سکا، اس کے لئے کچھ اور کیا جائے گا۔ ہم نے ہر صورت اپنے گاؤں کی بھوک ننگ کو خوشحالی میں، جہالت کی تاریکی کو علم و تمدن کی روشنی میں اور تمام قبائلی دشمنیوں اور فسادات کو دلائل اور



منطقی طریقوں سے صلح جو بنانا ہے۔ اب میں کہانی سناتا ہوں، قبائلی لشکروں کی دلیری اور بہادری کی۔ اس میں تم لوگوں کے بزرگوں کی بہادری کی مثالیں بھی موجود ہیں، جنہوں نے قائداعظم کا ساتھ دے کر اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے دشمن کے چھکے چھڑا دیئے۔

یہ تو آپ سب کو علم ہو گا کہ ہمارا ملک اگست 1947ء میں وجود میں آیا۔ کشمیر کی تقسیم اس ضمن کے مطابق نہیں ہوئی تھی، جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ آخر ہمارے قبائلی جوانوں کا پانچ ہزار کا لشکر حکومتِ پاکستان کی رضامندی پر اپنے تن من دھن کی بازی لگاتا ہوا سری نگر کے ہوائی اڈے تک پہنچ گیا۔ اس لشکر میں دو سو جنگجو ہمارے اس گاؤں کے تھے، جس میں سے پچاس افراد غازی بن کر گھروں کو لوٹے۔ باقی شہادت کے رُتبے کی عظمتوں کو حاصل کر کے جنت الفردوس میں جا پہنچے۔ گاؤں میں کسمپرسی اور خوف و ہراس ہماری شخصیت کی کمزوریوں اور خامیوں کی وجہ سے دن بہ دن بڑھتا چلا گیا۔ آج ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنے قبیلے کو مستحکم اور زندہ جاوید بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ ہم متحد ہو کر نادیدہ اور غیر جانبدارانہ قوتوں کا سر کچلنے کے لئے تاحیات سرگرمِ عمل رہیں گے۔

میں بذاتِ خود اپنے لشکروں کے ساتھ اپنی پٹھان برادری کا خیر خواہ بن کر انہیں مشکلات سے نجات دلاتا رہا۔ ہر مقام پر اور ہر موڑ پر۔ اور آج نئی نسل کو یہی تو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ صرف جلال خان نہیں، اس گاؤں کا بچہ بچہ فوجی بن کر اپنے علاقے اور قبیلے کا محافظ بن کر کھڑا ہو جائے۔ ورنہ قبائلی آپ کا نام و نمود مٹا کر رکھ دیں گے۔ آپ کی زمینوں، آپ کے گھروں پر وہ قابض ہو کر تم سب پر حکمرانی کریں گے۔"

وہ پیار سے انہیں ڈرا رہا تھا اور لڑکے اپنے نام حوالدار کو لکھوا رہے تھے۔

"کثیر الواقع حادثات نے آپ سب کو اس قدر ڈرپوک بنا دیا ہے کہ گاؤں کی حد عبور کرنا اور دشمن کے حملے کا دلیری سے جواب دینے کی کسی میں ہمت ہی نہیں رہی۔ مشتعل اعصاب نے ہماری حمیت اور غیرت کو داغ دار کر کے رکھ دیا ہے۔ آپ سب یکجا ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ سب کچھ درست ہو جائے گا۔"

سب نے بڑے غور سے جلال خان کی باتیں سنیں جن کے والد ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے اطمینان سے تابناک ہو چکے تھے۔ اُمید کی کرنیں ہول اور وحشت

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کی تاریکی کو اپنے اندر سمو لینے کے لئے کوشاں تھیں۔ سب گہری سوچ میں ڈوبے، شیخ چلی کے خواب دیکھتے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔

ایسے سجل اور روشن رستے کا اتہ پتہ تو کبھی کسی نے بتایا ہی نہ تھا۔ آج سب بان کی کھردری چارپائیوں پر بکھین کے نیچے لیٹے وہ کھلی آنکھوں سے سہانے سپنے دیکھ رہے تھے۔

آج آغا جی، تفاخر سے سینہ تان کر سب کے سامنے جلال خان کی دانش مندی کو سراہنے پر مجبور ہو چکے تھے۔ بات تو سچ تھی کہ گاؤں کی عزت اور بقا کے لئے جوان نسل کا یہاں سے جانا ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ ان کے حلقے کا بچہ بچہ دشمنوں کی زد میں آ کر عمر بھر کے لئے ان کا غلام بن کر رہ جاتا۔

آغا جی نے بڑی سوچ بچار کے بعد حکم صادر کر دیا کہ شیر خان اور دلیر خان اپنے باپ کی سرکردگی اور رہنمائی میں رہ کر اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ کلثوم نے سنا تو اسے پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اپنے بچے جلال خان کی قیادت اور خوش بخت کی نگہداشت میں دینا اس کے لئے صبر آزما کام تھا۔ وہ سب کو شعلہ بار آنکھوں سے گھورتی بے بس اور بے چارگی کے عالم میں کھنچتی چلی گئی۔ اس کے اعتراضات اور انکار، حکم کے سامنے بالکل بے معنی اور ہیچ نظر آنے لگے۔ وہ سب کے سامنے بری طرح ہار چکی تھی۔ لیکن پھر بھی دماغ عرشِ معلی پر ہی تھا۔ اس کی ناقابلِ فہم گفتگو اور اندیشوں کی پروا کئے بغیر بچے باپ کے ساتھ جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ جلال خان نے کلثوم کی تمام ناقابلِ معافی باتوں کو ہنستے ہوئے درگزر کر دیا۔ اس کے چہرے پر غصے یا خفگی کی ہلکی سی رمق بھی نظر نہ آئی۔ یہ پُرمسرت و پُرراحت مژدہ کسی معجزے سے کم ہرگز نہ تھا۔ وہ خود حیرت و تجسس میں ڈوبا ہوا تھا۔ آج اللہ تعالیٰ نے اُسے ایسی دولت سے نوازا تھا جس کا وہ مدتوں سے متلاشی تھا۔ آج اس کے ہاتھ اور اس کا دامن قارون کے خزانے سے مالا مال تھا۔ اسے خوش بخت کے روّیے پر اتنا مان تھا کہ اُس نے اُس سے مشورہ لئے بغیر ہی اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خوش بخت جیسی عورتیں صحراؤں اور بیابانوں میں بھی اپنے گھر مسرتوں اور کامرانیوں سے بسا لیتی ہیں۔ اپنے گھر کی آبادی کے لئے ہر آزمائش کو قبول کرنا اور اسے فتح مندی کا روپ دینا ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ وہ اس کٹھن امتحان کو بھی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی زندگی میں شامل کر لے گی۔ اس حسین خواب کو



دلکش تعبیر دیئے بغیر اور کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ سچ مچ حقیقت تھی یا اُمید و بیم کا احساس تھا۔ مگر تھا وہ مطمئن۔

کلثوم کا ہر وقت انگاروں پر لوٹنا بھی بجا تھا۔ وہ اپنے لاڈلے بیٹوں کو سوتیلی ماں کے ناروا سلوک میں سوچنے کی روادار نہ تھی۔ مگر مجبوری کے آڑے آ جانے کی وجہ سے وہ جاءِ نماز پر بیٹھی وظیفے اور ان کی سلامتی کے لئے حفاظتی بند باندھ رہی تھی۔ اُس کی گریہ و زاری اور آزردگی نے گھر کے ماحول کو سوگوار بنا دیا تھا۔ جبکہ باقی گھر کے بزرگوں کو بچوں کی جان بخشی کے ساتھ ان کا مستقبل خاصا تابناک اور خوش آئند لگ رہا تھا۔

❖❖○❖❖

www.iqbalkalmati.blogspot.com



جلال خان کا پشاور سے پنڈی تک کا راستہ خوش بخت کی باتوں اور رضا کی نئی نئی حرکتوں پر ہنستے اور لطف اندوز ہوتے گزرا۔ بگڑے ہوئے بچے، باپ کی باتوں پر ایک دوسرے کو آنکھ مار کر اپنی ناگواری کا اظہار بھی کرتے۔ مگر منافقت میں بھلائی کو بھی سمجھتے تھے۔

پنڈی پہنچ کر جلال خان نے ان کو فلیش مین (فلیش مین پنڈی صدر میں انگریز کے زمانے کا بہت پرانا اور پوش ریسٹورنٹ آج بھی موجود ہے) میں دوپہر کا کھانا کھلایا۔ بہترین کھانے کے بعد یہ لوگ صدر کے بازاروں میں پہنچ گئے۔ کپڑے، جوتے، کتابیں، بچوں کے رسالے، کھلونے غرضیکہ اُن کی عیاشی اور ضرورت کی ہر چیز کی خریداری ہوئی۔ بچوں کے دل جیتنا اتنا امرِ دُشوار تو نہیں تھا۔ باپ کا خلوص و چاہت نمایاں تھی۔ اور خون کی حدت و تپش نے ایسا کام کر دکھایا کہ بچے جب تک لاہور پہنچے، ان کے خیالات میں بسیرا کرنے والی تمام شکایتوں اور غلط فہمیوں میں خاصی کمی واقع ہو چکی تھی۔

خوش بخت تھوڑی دیر کے لئے سکتے کے عالم میں تینوں کو گھورتی، خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ سب کیا ہو گیا۔ اُس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ایسے امتحان کا کبھی تصور تک نہ کیا تھا۔ ہر وقت اپنی قسمت پر نازاں رہنے والی خوش بخت پل بھر میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔ اس سے پہلے کہ فضاؤں اور ہواؤں میں تحلیل ہو کر اپنا وجود کھو دیتی، خود پر قابو پاتے ہوئے دونوں بچوں کے سر پر بوسہ دے کر مسکرا دی۔ جلال خان کو ایسے سلوک کی توقع تھی۔

''بچو! اس گھر کا جو کمرہ پسند ہے، آپ لینے کے حق دار ہیں۔ یہ گھر رضا خان کی



ذرا سا چونک کر اُسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ان کی ماں نے سوتیلی ماں کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہ تو اس سے بالکل برعکس نکلی تھی۔ جس کے چہرے پر غیریت نام کو نہ تھی۔ انہوں نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ گیسٹ روم میں بیٹھے حیرت سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

''کیوں یار! بہت مرعوب ہو گئے ہو؟'' شیر خان نے چھیڑنے کے انداز میں کہا۔

''ایسی بات تو نہیں'' دلیر خان سنجیدہ بھی تھا اور آنکھوں میں اُداسی کی پرچھائیاں بھی تھیں۔ دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شیر خان لا اُبالی، جذباتی اور دنگا فساد کرنے والا بچہ تھا۔ جبکہ دلیر خان کم گو، ٹھنڈے مزاج کا مگر اندر سے ہر لحاظ میں پورا تھا۔

''مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تمہیں نئی ماں، نیا بھائی، نیا گھر سب کچھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' اُس نے پھر چھیڑا۔

''ہاں شیر خان! مجھے اس عورت کے بات کرنے کا طریقہ بہت عجیب سا لگا ہے۔ ہماری عورتیں ہر بات شروع کرنے سے پہلے گالی بکتی ہیں۔ اس کے لہجے میں ایسی شیرینی اور ایسی مٹھاس ہے جو ہم نے اپنی ماں کی زبان میں بھی نہیں پائی۔ وہاں ہر پل ہر عورت ناراض اور خفا نظر آتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟'' دلیر خان نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تم تو بے وقوف گدھے ہی رہے۔ میں نے سنا ہے، یہ عورتیں بہت شیریں سخن ہوتی ہیں۔ اپنی زبان کا رزق کمانا انہیں نہیں آئے گا تو کیا ہمارے گاؤں کی عورتوں کو آئے گا؟'' شیر خان نے بڑی رازداری سے کہا۔

''تم بکواس کرتے ہو شیرو! یہ عورت ایسی ہرگز نہیں لگتی۔ اس کے چہرے پر شرافت اور شرم و حیا کی جھلک ہے۔ آئندہ ایسی قیاس آرائیاں کرنے سے پرہیز کرنا۔ آخر کو وہ ہمارے آغا جی کی بیوی ہے۔ ہمارے منے سے بھائی کی ماں ہے۔'' اُس کے لہجے میں خفگی تھی۔

''مت بھولو کہ یہ سوتیلی ماں ہے۔ وہ مزہ چکھائے گی کہ نانی یاد آ جائے گی۔'' شیر خان نے ڈرایا۔

''میں تمہاری باتوں سے ڈرنے والا نہیں۔ اس عورت کو ماں کا مقام بخشا اور عزت

www.iqbalkalmati.blogspot.com



دینا ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو کل ہی واپسی کی تیاری پکڑ لیں۔ بہتری اسی میں ہے۔'' دلیر خان نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

اسی اثناء میں خوش بخت، رضا کو اُٹھائے کمرے میں آ گئی۔ دونوں مؤدبانہ طریقے سے بیٹھ گئے۔

''کل آپ کے آغا جان، سکیم پر کشمیر جا رہے ہیں۔ اس لئے وہ تو سو چکے ہیں۔ آپ دونوں بھی تھکے ہوئے ہیں۔ آرام کریں۔ صبح گپ شپ لگائیں گے۔'' وہ بے حد لگاوٹ سے بولی۔ ''کسی بھی چیز کی ضرورت ہوئی تو سامنے میرا کمرہ ہے۔ تکلیف یا غیریت کی کوئی ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہے نا؟''

دونوں نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلا دیئے۔ وہ تو باہر نکل گئی مگر دونوں بھائی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے یک زبان ہو کر بولے۔ ''واہ بھئی واہ!''

''بی بی تو سوتیلی ماں کے بارے میں کچھ اور ہی کہتی تھیں۔ کس کی زبان پر یقین کیا جائے؟'' دلیر نے جز بز ہو کر کہا۔ ''معاملہ کچھ سمجھ سے بالاتر ہی ہے۔''

''ویسے یار! تم بڑے دل پھینک اور جلد باز انسان ہو۔ چند گھنٹوں میں کیا اخذ کرنا چاہتے ہو؟ وقت کے ساتھ تمام معاملات کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ چلو سونے کی کوشش کرتے ہیں۔'' شیر خان نے ناگواری سے کہا اور پلنگ پر سیدھا لیٹ کر سوچ میں ڈوب گیا۔

نیند دونوں سے کوسوں دُور تھی۔ اپنے گھر کی آزادی، اپنی ماں کا سچا پیار، اپنے دوستوں کی میٹھی باتیں اور مزے دار شرارتیں اور اپنے گاؤں کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سب کچھ ہی تو یادیں بن کر تڑپانے لگیں۔ باپ کی توجہ، خوشی اور بے پناہ لگاوٹ قابلِ تحسین تو تھی مگر یہاں کے ماحول کی گھٹن کے احساس نے طبیعت میں خفقان پیدا کر دیا۔ یہاں کی خاموشی میں الم ناک سکون کے سوا کچھ نہ پایا تھا۔ دن کیسے گزریں گے؟ ایک سوال ان کو ہراساں و پریشان کئے ہوئے تھا۔

ان کی خیر و عافیت اور جان کی حفاظت مجبوری کی گھنٹیاں بجاتی انہیں لاچاری اور بے بسی کے سپرد کر رہی تھیں۔ دونوں رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ صبح کہیں آنکھ لگی تو ایسی لگی کہ دوپہر کے دو بجے کھلی۔ تیزی سے بستر سے چھلانگ لگا کر نیچے اُترے، لمبی



جمائی اور پُرسکون انگڑائی لے کر شیر خان نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ لان موسمی پھولوں سے آراستہ تھا۔ خوش بخت، مالی کو ہدایات دے رہی تھی۔

''دلیرو! اُٹھ جاؤ سست کہیں کے۔'' شیر خان نے اُسے جھنجوڑ کر کہا تو اُس نے اپنے چہرے کو بازوؤں سے چھپانے کی کوشش کی۔

''دھت تیرے کی۔ تم رو رہے ہو۔'' شیر خان نے پُرملال لہجے میں کہا۔ ''مجھے بھی گھڑی دیکھ کر رونا آیا تھا۔ کسی نے ہمیں جگانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ بی بی کیسے جگاتی تھیں۔ میرا دلیرو، میرا شیرو! قربان جاؤں، اُٹھ جاؤ۔ بھوکے پیاسے سوئے پڑے ہیں۔ بدن میں کمزوری آ جائے گی۔ دیکھا، یہ فرق ہوتا ہے سوتیلی ماں میں۔''

''ہم نے اس رشتے کی بنیاد اس تفریق پر رکھی تو پھر ہماری خیر نہیں۔ یہاں سے نکالے گئے تو کہاں جائیں گے؟ اُس گاؤں میں، جہاں گھر ہمارے لئے جیل بن چکی ہے؟ اپنے ذہن کو آلودگی سے پاک کرو شیرو! ہماری تمام تر توجہ پڑھائی پر ہونی چاہیے۔ ہم دونوں آغا جان کی طرح فوجی بننے کا مقصد لے کر یہاں آئے ہیں۔'' دلیر خان نے من چلے شیر خان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یار! دراصل میرا گاؤں واپس جانے کو دل چاہ رہا ہے۔'' شیر خان کے لہجے میں لااُبالی پن تھا۔

''پھر بچپنے کی بے معنی باتیں کرنے لگے ہو۔ خدا کے لئے مجھے اب نئی آزمائش میں نہ ڈال دینا۔'' دلیر خان نے اُداسی و مایوسی سے نکلنے کی کوشش کی۔

''میرا واپس چلے جانا تمہارے لئے آزمائش کا باعث کیونکر بنے گا؟ کچھ سمجھ نہیں آیا۔'' شیر خان نے حیرت سے کہا۔

''دیکھو شیرو! میں تمہیں پرانی صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ تم نے بغیر سوچے سمجھے پڑھائی کو خیر باد کہہ دیا۔ میں تمہاری ہمدردی اور اُنس میں تمہارا ووٹ بن کر کھڑا ہو گیا۔ جبکہ مجھے اس کے بھیانک انجام کی خبر تھی۔ مگر میں کیا کرتا؟ از راہِ مجبوری مجھے تمہارا ساتھ دینا پڑا۔ تمہیں تنہا چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر تم نے ساتھ والے گاؤں میں خوامخواہ کی دشمنی لے کر مجھے بھی ساتھ ملا لیا۔ جس کے نتیجے میں آج ہم یہاں پہنچ چکے ہیں۔ اب یہاں سے جانا چاہو گے تو مجھے ہر حالت میں تمہارا ساتھ دینا ہو گا۔ یہ سوچ

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کر فیصلہ کرنے کا وقت ہے۔ وہاں ہم جلد یا بدیر قتل کر دیئے جائیں گے۔ کتے کی موت مرنا مجھے ہرگز پسند نہیں۔'' دلیر خان نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اُس کے لہجے میں پختگی تھی۔

''دلیرو! تمہارے جیسا بھائی میرے لئے فخر اور میری آن بان ہے۔'' اُس نے اُسے گلے لگا کر بھینچ لیا۔

''تم جذباتی اور جلد باز انسان ہونے کی وجہ سے میری ایک نہیں سنتے۔ ورنہ کب کا تمہیں راہِ راست پر لے آیا ہوتا۔ تمہاری پٹھان عادات مجھ پر حاوی ہو کر مطیع کر لیتی ہیں۔ میری حمیت بھی بیدار ہو جاتی ہے۔ میں اس لئے تو التجا کر رہا ہوں کہ اب کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھنا۔ میں تمہیں اپنے خیالات سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ چند گھنٹوں میں، میں نے یہاں کی خالص اور بے لوث محبتوں کو جانچ لیا ہے۔ آغا جان تو ہمارے والد ہیں۔ ہمیں بے حد پیار سے اپنے پاس لائے ہیں۔ دیدی ماں بھی بہترین ہی ہوں گی، مجھے اس کی اُمید ہے۔ اُداس تو میں اپنا گھر چھوڑنے کی وجہ سے ہو گیا تھا۔ ہم نے یہاں دل لگانے کی پوری کوشش کرنی ہے۔ کاش بی بی نے ہمارے مستقبل کا ہی سوچ لیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ بی بی کتنی اُداس ہو گئی ہوں گی۔'' وہ سنجیدہ تھا۔

''ہاں دلیرو! تمہاری سوچ مجھ سے بہت آگے تک جاتی ہے۔ میں نے بی بی کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ ہر بار تمہاری باتیں مجھے لاجواب کر دیتی ہیں۔ تم نے یہ سب کس سکول سے سیکھا ہے؟'' شیر خان جز بز ہو کر بولا۔

''جتنی جلدی اس دنیا کو سمجھ جاؤ گے، کامیاب رہو گے۔ ورنہ زندگی دھوکے اور فریب کی نذر ہو جائے گی۔ ابھی تو ہم دونوں کم عمر ہیں، ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ کل کو ذہنی ہم آہنگی اور مطابقت کا فقدان ہمارے درمیان ناقابلِ عبور دیواریں حائل کر سکتا ہے۔'' دلیر خان افسردگی سے کہہ رہا تھا۔

''تم نے پھر بہت گہری بات کر ڈالی۔'' شیر خان نے اُسے بے انتہا محبت و لگن سے ٹوکا۔ ''بھئی پَر سے پرندہ بنانا کوئی تم سے سیکھے۔ عالمِ استغراق میں تانے بانے بُنتے تم محل تعمیر کر سکتے ہو۔ میں تم جیسا کیوں نہیں بن سکتا؟ ہم تو ایک ہی ماں کے جڑواں بیٹے ہیں۔ طبیعت اور شخصیت میں اتنا زیادہ فرق کیوں؟'' وہ چھوٹے بچوں کے مانند بے کل سا



ہو کر تڑپ اُٹھا۔ آج پہلی دفعہ اُسے دلیر خان بے حد سمجھ دار معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد بات کو ٹالتے ہوئے بولا۔

''دلیرو! ابھی ایسی باتیں سوچنے کی ہماری عمر نہیں ہے۔ یہ سوچو کہ یہاں سے چھٹکارا کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ ہم بھی اُداس ہیں اور وہاں بی بی کی حالت خراب ہو چکی ہو گی۔''

''پھر بے وقوفانہ باتیں شروع کر دی ہیں تم نے۔ ہم ایسے بھی دودھ پیتے بچے نہیں ہیں۔ تمہیں یاد ہے نا وہ سبق، محمد بن قاسم نے سترہ سال کی عمر میں حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔ ہوش میں آؤ۔ تم اسی خوش فہمی میں مبتلا رہ کر کب تک نادانی اور کوڑھ مغزی کی باتیں کرتے رہو گے؟'' دلیر خان غصے میں آ گیا۔

اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ لمبی بل کھاتی مونچھوں والا بیرہ نمودار ہوا۔ شیر خان تنتہیا اُسے گھورنے لگا۔

''آپ ہمیں جگانے آئے ہیں؟'' دلیر خان نے شستہ زبان میں کہا۔

''جی...... میجر صاحب آنے والے ہیں۔ بی بی جی فرما رہی ہیں، کھانا مل کر کھائیں گے۔ آپ تیار ہو کر باہر آ جائیں۔'' وہ مؤدبانہ انداز میں بولا اور باہر نکل گیا۔

''کیا تم خفا ہو گئے ہو؟'' دلیر خان نے خجل سا ہو کر پوچھا۔

''نہیں۔'' شیر خان نے منہ پھلا کر سرکشی سے کہا۔ ''تم مین میکھ نکالنے والی ہستی کو اس دنیا میں آنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ ہر وقت کی ٹوکا ٹوکی اور نصیحتیں مجھے قطعاً پسند نہیں ہیں۔ ہم دونوں کا ہم خیال، ہم زبان ہونا ناممکن ہے۔ مردمرنجاں مرنج کے مزاق میں رہ کر اپنی شان و شوکت اور دبدبہ کھو دیتا ہے۔ یہ عورتوں کو زیب دیتا ہے۔ تم نہ جانے کہاں کے پٹھان ہو۔'' بد دماغی کے اثرات نمایاں تھے۔

''بس، مجھے سمجھ آ گئی ہے کہ خود بھی جوتے کھاؤ گے اور مجھے بھی مجبور کرو گے۔'' دلیر خان غسل خانے کی طرف چلا گیا اور شیر خان سوچتے ہوئے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

جب تک دلیر خان تیار ہو کر باہر نکلا، شیر خان نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور گلے لگا لیا۔

''دلیرو! تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے اپنی انسانی جبلت کو ربط و ضبط میں لانا ہے۔ آج

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کے بعد تمہارے ہر مشورہ، ہر نصیحت پر میں قربان۔ مجھے معاف کر دو اور ہنس دو۔"

"میں ناراض ہرگز نہیں۔ اب چوزے، ماں کے پروں سے نکل کر اپنا دانہ چگنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ بس یہ بات پلے باندھ لو۔" دلیر خان نے نرمی سے کہا۔

"ہوں۔" وہ اثبات میں سر ہلاتا غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

"دلیرو! خدا کی قسم! تم بظاہر کس قدر مسکین اور بے ضرر لگتے ہو۔ مگر ہو مہا کھوجی اور منطقی۔ نہ جانے تمہارے ذہن میں اس قسم کی سوچیں کہاں سے اُمڈ آتی ہیں۔ مان گیا ہوں تمہیں۔ میں ایسا کیوں نہیں؟"

دونوں نے ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

"دلیرو! جب میں آپے سے باہر ہونے لگوں تو مجھے آنکھ مار دیا کرنا۔ میں اپنی حماقت کو فوراً سمجھ جایا کروں گا۔" شیر خان نے بھائی سے عہد و پیمان کیے اور دونوں تیار ہو کر باہر رضا کے پاس چلے گئے، جو آپا کی گود میں بیٹھا انگوٹھا چوس رہا تھا۔

"رضا! دیکھو، دو بھائی آئے ہیں۔ انہیں خوش آمدید کہو۔" خوش بخت کچن سے نکلی تو دونوں بھائیوں کو دیکھ کر بولی۔ وہ ذرا سے مسکرائے۔ خوش بخت نے رضا خان کو اُٹھا کر شیر خان کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے جھجکتے ہوئے رضا کو اُٹھا لیا۔

"رضا ہو بہو اپنے شیر لالہ جیسا ہے۔" وہ بڑے پیار سے بولی۔

"مجھ پر بھی لگتا ہے نا؟" دلیر خان نے بے حد اپنائیت سے کہا۔

"آپ دونوں کا بھائی جو ٹھہرا۔" خوش بخت کے لہجے میں بھی اپنا پن تھا۔ حالانکہ خوش بخت بھی مارے کرب اور خوف کے رات بھر سو نہ پائی تھی۔ شب بیداری کے اثرات اُس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ اُسے رہ رہ کر جلال خان کے اس جلد باز فیصلے پر غصہ آ رہا تھا۔ حالانکہ وہ اس وقت کسی قسم کی طوالانی بحث مباحثے میں پڑنے کو تیار نہ تھی۔ مگر غم اور دکھ کا پیمانہ اتنا وسیع و عریض اور تکلیف دہ تھا کہ اُسے کسی پل چین نصیب نہ تھا۔

"کاش! مجھے کوئی اہمیت دیتے ہوئے مشورہ ہی لے لیا ہوتا۔ آخر کو ذمہ داری تو میں نے ہی اُٹھانا تھی۔ کس دھاندلی اور شاطرانہ طریقے سے بگڑے ہوئے بچوں کی اتنی بڑی ذمہ داری مجھ پر تھوپ کر کیسے رات بھر خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ہیں۔ اور میں رات بھر تڑپی ہوں، بلکی ہوں۔ کیا محض یہ کہہ دینا کافی تھا، خوش! اللہ نے تمہیں رضا کے ساتھ



دو جوان بیٹے سونپ کر تمہارا مقام اور درجہ مزید بلند کر دیا ہے۔ میں کیا اعتراض کرتی؟ بہر نوع روشن ضمیری اور اعلیٰ کردار کی یہی نشانی ہے کہ مجھے ان معصوم بچوں کو سینے سے لگا کر ان کے مستقبل سنوارنے پر کمربستہ ہو جانا چاہئے۔ میں تو گاؤں کے غیر اور ناآشنا لوگوں کے بچوں کی ہمدرد اور رہنما بن کر اُن کی جھولی کو مسرتوں اور کامرانیوں سے لبریز کرنے میں کوشاں رہتی تھی، یہ تو رضا کے بھائی اور اسی کا خون ہیں۔ ان کو دھتکارنا سراسر ناانصافی اور زیادتی ہوگی۔ مجھے روایتی رشتے سے باہر نکل کر ماں کی عظمت کو حاصل کرنا ہوگا۔ اس مشکل وقت میں میری مخالفت کتنی ہی زندگیوں کو تاریکیوں اور دلدل میں پھنسا سکتی ہے، جس کے بھیانک اثرات سے میں اور رضا بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ فقط میری قربانی کی ضرورت ہے۔

اُس کے تیور کا اُتار چڑھاؤ، اُس کی دلی کیفیت کی غمازی کر رہا تھا۔ شیر خان نابلد تھا مگر دلیر خان کو اُس کی الم ناک خاموشی نے بے کل سا کر دیا۔

"آغا جان کب تک آئیں گے؟" دلیر خان نے سوال کیا تو وہ یکدم اچنبھے میں اسے دیکھنے لگی۔

"آتے ہوں گے۔ کھانے کے بعد وہ ایک مہینے کے لئے اسکیم پر چلے جائیں گے۔ آپ کو میرے ساتھ رہنے میں کسی قسم کی پریشانی کا اندیشہ ہے تو اپنے آغا جان کو بتانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہئے۔ وہ آپ کے لئے بہتر فیصلہ کریں گے۔" وہ رُوکھے لہجے میں بولی۔ مگر اگلے لمحے اُس نے اپنی سوچ کو کوسا۔

"ہمیں آپ کے ساتھ اکیلا رہنے میں کوئی پریشانی نہیں۔ آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔ رضا جیسے جیتے جاگتے کھلونے کے ساتھ بھلا کوئی اُکتا سکتا ہے؟" دلیر خان نے بے حد سمجھداری سے جواب دیا تو خوش بخت کے رویّے میں پیار کے ساتھ رحم اور ترس کی آمیزش شامل ہوگئی۔ ضمیر نے لعنت ملامت کی۔

"یہ گھر صرف رضا کا ہی نہیں، تم دونوں کا بھی ہے۔ اس لئے یہاں خوش اور مطمئن رہنا ہوگا۔" خوش بخت نے دونوں کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس چھوٹی سی جنت کو ہم سب مل کر مزید حسین و جمیل بنائیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"جی۔" دونوں کے چہروں پر خوشی رقص کرنے لگی، جسے خوش بخت نے بھی محسوس کیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"کھانے کے بعد آغا جان چلے جائیں گے۔ پھر ہم اپنی عیاشیوں کے پروگرام بنائیں گے۔ آپ دونوں نے پہلے کتنی فلمیں دیکھی ہیں؟" خوش بخت کے لہجے میں نرمی آ چکی تھی۔ اس عورت کی اس خاصیت نے ہی تو جلال خان کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اس سے مشورہ کئے بغیر اس کے کندھوں پر اتنی بڑی ذمہ داری کا بوجھ ڈالنا اُسے بالکل زیادتی نہ لگی۔ کیونکہ خوش بخت کا تعلق تو ایسے گھرانے سے تھا، جن میں خدمتِ خلق کا جذبہ خون کے ساتھ شامل تھا۔ وقتی اور عارضی دھچکا اور افسوس، خوش بخت کی فطرت کے سامنے زیر ہو چکا تھا۔ وہ دونوں کو بے حد پیار اور نرمی سے دیکھ رہی تھی۔

"بڑے آغا جی اور بی بی جی کی طرف سے فلم دیکھنے کی اجازت کبھی نہیں ملی۔ ان کا کہنا ہے کہ بچے فلموں سے غلط سبق سیکھتے ہیں۔" شیر خان نے آہستگی سے کہا۔

"انسان اچھے یا برے رستے کا تعین فطرت کے عین مطابق کیا کرتا ہے۔ مجھے آپ دونوں سے کوئی خدشہ یا خوف نہیں۔" اُس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا تو دونوں حیرت و اشتیاق سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ دیدی ماں کی توقعات پر کیسے پورا اُترا جائے۔ وہ انہیں بہت شائستہ اور فرمانبردار بچے سمجھ رہی ہے۔

"کنٹونمنٹ کا سینما ہال زیادہ دُور نہیں ہے۔ ماحول بھی بہترین ہے۔ میں خود آپ کے ساتھ چلوں گی۔ ٹھیک ہے نا؟ پھر آپ دونوں نے فلم کی کہانی اپنے لفظوں میں مجھے سنانی ہے۔ ٹھیک ہے نا؟" لہجے میں بے پناہ حلاوت تھی۔

اس کے بعد اُن کے دل جیتنے کے پروگرام ہر روز بنتے چلے گئے۔ انہوں نے دو ہفتوں میں کیپٹن شہاب الدین کے ہمراہ لاہور کا کونا کونا دیکھ لیا۔ آخری پروگرام گاؤں کا تھا۔ فیروز خان نے اپنے باغوں اور زمینوں کی سیر کرائی۔ گھوڑے پر بٹھا کر آس پاس کے علاقے دکھائے۔ واہگہ بارڈر پر گارڈز کی ڈیوٹی بدلنے کا انداز دکھایا اور انہیں ہندوستان سے پاکستان پہنچنے کی ایک ایک داستان سنائی، جسے انہوں نے بے حد دلچسپی سے سنا۔ تیتر کے شکار سے بھی خوب لطف اندوز ہوئے۔ گاؤں کا ماحول ان کے لئے نیا تو نہ تھا مگر یہاں کا رویّہ اور سلوک، مہمان نوازی اور توجہ قابلِ ستائش تھی۔ ایک مہینے میں بچے اس خاندان میں ایسے گھل مل گئے تھے جیسے جنم جنم سے جانتے ہوں۔ یہاں ہی پل کر بڑے ہوئے ہوں۔



جلال خان واپس آیا تو گھر کی فضا میں تسکین اور اطمینان دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خوش بخت اپنی کوشش اور ہمت کا منہ بولتا ثبوت بن کر شوہر کے حواس پر چھا گئی۔ خوش بخت کی بلند کرداری اور حُسنِ سلوک سے وہ متاثر تو پہلے ہی تھا۔ مگر بچوں کو یوں قبول کر لینا اُس کی عظمت اور صبر کی دلیل تھی۔ جبکہ جلال خان نے اسے کسی قسم کی نصیحت کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ وہ اُس کے بال بال سے آشنا جو تھا۔

"خوشی! میرے کھوئے ہوئے بیٹے تمہاری وجہ سے میرے قریب ہیں۔ تمہاری رفاقت اور رضا خان کی موجودگی میرے لئے باعثِ رحمت ہے۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔" لہجے میں خوشی کے ساتھ احسان مندی کا عنصر بھی تھا۔

"کاش! یہ لمحے امر ہو جائیں۔" خوش بخت تعریف پر نہال ہو کر بولی۔

"یہ بچے اپنی دیدی ماں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ تم نے ان کے پاؤں میں پیار و چاہت کی اٹوٹ زنجیر ڈال کر اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔" وہ اُسے پیار کرتے ہوئے بولا۔ "نہ جانے میری کس نیکی کے بدلے میں مجھے تم مل گئی ہو۔" وہ مسکراتا ہوا سوچ میں گم ہو گیا۔

❖❖○❖❖

"شیر خان! اب سناؤ کہ تمہارے دیدی ماں اور ان کے خاندان کے بارے میں کیا خیالات ہیں؟" دلیر خان نے شوخی سے کہا۔

"تم یہ جتانا چاہتے ہو نا کہ دلیر خان جیت گیا۔" شیر خان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یوں ہی سمجھ لو۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"یہ جو تم چپ شاہ بن کر حالات کی گہرائی میں غوطہ زن ہو کر حقیقت اور سچائی کو سطح پر لے آتے ہو۔ سارا اُس کا کمال ہے اور میں کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی بڑ بڑ کرتا آخری فیصلے پر پہنچ کر ایسی منہ کی کھاتا ہوں کہ مجھے تم پر حسد اور رشک ہونے لگا ہے یار!" شیر خان نے سنجیدگی سے کہا۔

"دراصل تم بی بی کی طرح ایک دم سیخ پا ہو کر اُمید و آس سے بہت دُور چلے جاتے ہو۔" دلیر خان نے بھی سنجیدگی سے کہا۔

"یعنی میں عاقبت نا اندیش اور بے حد جذباتی انسان ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com



وہ عجلت بھرے لہجے میں بولا۔

''ایسا ہرگز نہیں یار!..... تمہاری عقل اور سمجھ کا جواب نہیں۔ بس ذرا غصے کے تیز ہو۔ اس تیزی میں کمی کر لو۔ دیکھو، اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔'' دلیر خان پیار سے بولا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں خود اپنی اس عادت سے بہت نالاں ہوں۔ مگر لگتا ہے کہ یہاں کے ماحول نے مجھے جو تربیت دے دی ہے، میرے لئے بہترین ہے۔ اُف! وہاں میری کلاس کا ہر لڑکا میرا دشمن اور گاؤں کا ہر فرد مجھے ناپسند کرتا تھا۔ مجھے اب سمجھ آئی ہے دلیرو! کہ ایسا کیوں ہوتا رہا ہے؟'' شیر خان کے دل میں جو کانٹا چبھا ہوا تھا، اس کا کرب زبان پر آ گیا۔

''میرے ساتھ بھی یہ سب کچھ ہوتا آیا ہے شیرو! ایسی بات نہیں کہ میں بہت پارسا ہوں۔'' وہ نرمی سے بولا۔

''تم تو بلاوجہ ہی پٹتے رہے۔ اس کا قصوروار میں ہوں۔ مجھے معاف کر دو دلیرو!''

''ہاں شیرو! وہ سب بھائی ہونے کے ناطے ہوتا رہا۔ حالانکہ دنگا فساد میری فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ لیکن میں تمہیں اکیلا کیسے چھوڑ دیتا؟ یار! تم ایک ہی تو میرے بھائی ہو۔ پیار میری بہت بڑی مجبوری ہے نا۔'' وہ شوخ انداز میں بولا۔

''اب تمہارے دو بھائی ہیں دلیرو! اس لئے اب تم مجھے راہِ راست پر لانے کے حق دار ہو۔'' وہ بے حد انکساری سے بولا۔

''باتیں اور شرارتیں بند۔ پڑھائی شروع۔ کل استاد نے ہمارا ٹیسٹ لینا ہے۔ میرا ڈانٹ کھانے کا کوئی ارادہ نہیں۔'' دلیر خان نے فکرمندی سے کہا اور دونوں اپنے اپنے سٹڈی ٹیبل پر کتابوں میں کھو گئے۔

❖❖○❖❖

ہر اتوار حویلی کے بکھرے ہوئے تمام مکین دوپہر کو گاؤں جمع ہو جاتے۔ اور یوں حویلی پھر سے گہما گہمی سے آراستہ و پیراستہ ہو جاتی۔ چھٹی گزارنے کا یہ طریقہ سب کو بے حد پسند تھا۔ جلال خان بھی بمعہ بچوں اور خوش بخت کے بغیر کسی حیل و حجت کے، اتوار کی صبح کو ہی وہاں پہنچ جاتا۔ دن بھر مردانے میں گزارتا۔

زندگی اپنے معمول اور مخصوص ڈگر پر چلتی بے حد پُرسکون اور پُرلطف بیت رہی تھی



کہ اتوار کی صبح نے جلال خان کو ہلا کر رکھ دیا۔

وہ حسبِ معمول حویلی پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ مردان خانہ میں کچھ رونے دھونے کے ساتھ خوشی بھی براجمان تھی۔ فیروز خان کی بچھڑی ہوئی بہن فاطمہ دیدی اپنے تین بیٹوں کے ہمراہ حویلی کے تمام افراد کے بیچ گھری آہ و بکا کر رہی ہے۔ وہ عورت جو چٹان کے مانند مضبوط ہوا کرتی تھی، سب کے سامنے ریزہ ریزہ ہو کر زمین بوس ہو گئی تھی۔ موت کا حافظہ کس قدر دیرپا اور ناقابلِ فراموش ہوتا ہے۔ اس کا کرب، اعصاب کو ایسے مشتعل کرتا ہے کہ سالہا سال کی مسافت کے بعد بھی اپنے مقام پر براجمان رہتا ہے۔ وقت کا مرہم بھی موت کی بے بسی اور لاچارگی کے سامنے ہمیشہ ناکام ہی رہا ہے۔ آج کتنے عرصے بعد اس نے اپنے ادھورے اور دُکھیا خاندان کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس دوران اس خاندان میں معاشی اور معاشرتی کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں، اُسے قطعاً اندازہ نہ تھا۔

یہ لوگ لاہور میں آباد ہو گئے تھے۔ زرعی زمین شیخوپورہ میں الاٹ ہوئی تھی۔ امرتسر میں یہ گھرانہ خوشحالی اور سیاسی سرگرمیوں میں نمایاں کردار ادا کر رہا تھا۔ جب فاطمہ کے سسر کو سکھوں نے اچانک حملہ کر کے شہید کر دیا تو اس کا شوہر اپنے بھائیوں، بہنوں اور بچوں سمیت ایک قافلے کی سربراہی کرتے ہوئے پاکستان چل پڑا۔ انہوں نے پاکستان کی سرزمین کو جب چند قدم کے فاصلے پر دیکھا تو حُب الوطنی کا اِک نعرہ فضا میں گونج اُٹھا۔ اگلے لمحے ہولناک چیخ آسمان کی بلندیوں کو چیرتی ہوئی پاکستان کی مقدس ہواؤں میں تحلیل ہو گئی اور خون میں لت پت کئی جوبن بھرے جسم پاکیزہ اور معطر مٹی کے سپرد کر دیئے گئے۔ جس میں فاطمہ کا سہاگ بھی ایثار کا شیریں گھونٹ پی کر پاکستان کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں اپنا کردار ادا کر گیا تھا۔ سرحد پر اُس کی دو جوان بچیوں کو سکھ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُٹھا کر لے گئے۔ یہ چیختی چلاتی رہ گئی تھی۔ کوئی مدد نہ کر سکا تھا۔ بیٹوں کی جان کی سلامتی پر وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدے میں گر کر شکرانہ ادا کرتی رہتی تھی۔ زبان پر کسی قسم کا گلہ و شکوہ نہ تھا، کسی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ راضی برضا زندگی کے نئے موڑ پر حوصلے اور ہمت سے گامزن ہو کر اپنے بچوں کے لئے اِک مثال بن گئی تھی۔ مگر آج تو بھائی کو دیکھ کر تمام بند ٹوٹ گئے تھے۔

رحیم خان جس کی نسبت خوش بخت سے بچپن میں ہی طے ہو چکی تھی، دیرہ دون سکول

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کا ہونہار طالب علم تھا، جس کا علم جلال خان کو نہ تھا۔ انہوں نے غیر ارادی طور پر اس کو باخبر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ فاطمہ سب کا جائزہ لے کر متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔

''میری خوش بخت...... اللہ نہ کرے...... اور کہاں ہے ثریا؟''

جلال خان دروازے میں کھڑا تمام غیر متوقع حالات پر غور کر رہا تھا کہ خوش بخت، رضا کو کندھے سے لگائے اندر داخل ہوئی تو سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ رحیم خان نے مارے دُکھ کے آنکھیں بھینچ کر اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کرنے کی کوشش کی۔ فاطمہ بے اختیار ہو کر چیخ اُٹھی۔

''فیروز خان! کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے میرا انتظار ہی نہ کیا۔ میری امانت میں خیانت کرتے ہوئے میں تمہیں یاد نہ آئی۔ یہ کیا ظلم ڈھایا ہے تم نے؟ میں تو پہلے ہی زندہ لاش ہوں۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ کمرے میں اتنی گمبھیر خاموشی تھی کہ فاطمہ کی گونجتی ہوئی آواز میں رضا کا رونا شامل ہو گیا۔

جلال خان معاملہ بھانپ چکا تھا۔ محسوس کرنے کی اندرونی قوت پوری طرح بیدار ہو کر اسے بے کل کر رہی تھی۔ وہ فوراً مردان خانے سے نکل کر اندرون حصے میں چلا گیا۔ خوش بخت بھی رضا کو چپ کراتی اُس کے پیچھے نکل گئی۔

''ثریا کو بھی تم نے ذبح کر دیا ہوگا۔ اماں گل! مجھے آپ سے یہ توقع ہرگز نہ تھی۔''

فاطمہ کا رونا دھونا، غیظ و غضب میں بدل چکا تھا۔ اُس نے شعلہ بار آنکھوں سے ماں کو گھورا۔

''اماں گل! چھ بیٹیوں کے ساتھ آپ کی بیٹی بھی آج سے مر گئی۔'' وہ تیزی سے مردانہ خانہ سے نکلی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اُس کے تیور اُس کے ارادوں اور فیصلوں کی غمازی کر رہے تھے۔ چہرے پر پختگی، مضبوطی اور پکا پن، ضد کی صورت میں نمایاں تھا۔ اس دھچکے میں وہ تمام رشتے ناطے، تعلق اور اتصال منقطع کرنے پر اُتر آئی تھی۔ سب خاموش کھڑے اُسے ہکا بکا دیکھ رہے تھے۔

آخر اماں گل کی غم و غصے میں ڈوبی ہوئی بارُعب آواز نے اُسے چپ کرا دیا۔

''حیف ہے کہ میں نے تم جیسی احمق اور نا قابلِ فہم اولاد کو جنم دیا۔ فوراً باہر نکلو اور



وضع داری اور محبت کا ثبوت دیتے ہوئے فراخ دلی سے بھائی کو گلے لگا لو۔ یہ وقت آزمائش کا ہے۔ ہم نے ان بھاری اور جاں گسل لمحوں کا مقابلہ صرف اور صرف صبر و تحمل سے کرنا ہے۔ یہ امتحان ہے پیار اور خلوص کا، جذبوں اور چاہتوں کا، قربانیوں اور محرومیوں کا۔ خود کو سنبھالو۔ ہمیں یہاں اپنا مقام بنانے میں بہت تگ و دو کرنا پڑی ہے۔ اس عزت اور نام کو پل بھر میں نیست و نابود کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ تم اس خاندان کی سب سے بڑی اولاد ہو۔ فاطمہ! اپنا مقام اور ذمہ داری پہچانو اور قابلِ ستائش، بزرگ اور قابلِ آفرین غمگسار بن کر سب کے زخموں کا مرہم بن کر سب کے لئے اِک مثال بن جاؤ۔ یہ گھڑی ہے ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنے اور ایک دوسرے کی توانائی، قوت اور طاقت کو یکجا کر کے مسائل کو حل کرنے کی۔ رحیم خان! ماں کو لے کر اندر چلو۔'' لہجہ تحکمانہ تھا۔ ''کیا سوچے گا میجر جلال کہ کیسا جذباتی اور ناشائستہ خاندان ہے۔ تمہارے یہ رنگ ڈھنگ، یہ طور طریقے اور رشک و حسد ہمیں ذلت و خواری کی آگ میں جھونک دیں گے۔ اپنا دل بڑا کرو بچی! یہ خوشیاں منانے اور ڈھول بجانے کا دن ہے کہ میری نورِ نظر، میرے دل کا چین و سکون میرے سامنے ہے۔'' وہ غصے پر قابو پا کر اُسے پیار سے چمکارنے لگیں۔

فاطمہ تھوڑی دیر کے لئے بت بنی کھڑی رہی، پھر ماں کو گلے لگا کر فیروز خان سے معافی مانگنے لگی۔

سب مردان خانہ سے نکل کر اندرونی حصے میں آ گئے۔ جلال خان برآمدے میں اکیلا بیٹھا اُدھیڑ بُن میں مصروف تھا۔ خوش بخت کمرے میں رضا خان کو سُلانے کی کوشش میں تھی۔ دل و دماغ میں اندیشوں کی جنگ جاری تھی کہ کہیں آنے والے وقت کا ریلا اس کی خوشیوں کو بہا نہ لے جائے۔ اُس نے اپنے شوہر کے ماتھے پر پڑنے والی شکنوں سے تھوڑا بہت اندازہ تو لگا ہی لیا تھا۔ اب اُس کا سامنا کرنے کی ہمت کہاں سے لاتی؟ وہ اسی کشمکش میں مبتلا تھی کہ جلال خان کمرے میں داخل ہوا۔ چہرے کی سنجیدگی میں بے شمار گلے شکوے پوشیدہ دیکھ کر خوش بخت لرز اُٹھی۔

''خوش بخت! میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارا دل مانتا ہے تو تیار ہو جاؤ۔'' لہجہ افسردہ تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



''فوراً واپس چلے جانا درست نہیں لگے گا۔ کھانے کے بعد چلنا مناسب ہوگا۔'' وہ بے اختیار ہو کر بولی۔

''کیا مناسب ہے اور کیا درست ہے، میں خوب جانتا ہوں۔ مجھے سبق سکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ غصے سے بولا تو وہ خاموشی سے اُٹھی اور رضا خان کو اُٹھا کر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ چند لمحوں میں وہ یہ جا وہ جا ہو گیا۔ سب گھر والے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔

''آخر غیر جو ٹھہرا۔ ایسی نازیبا حرکتوں سے ہی تو پہچانا جائے گا۔ میری معصوم بچی کو کیسے دھر کر لے گیا، کم بخت کہیں کا۔'' فاطمہ جل کر بولی۔

''فاطمہ! ایسے مت بولو۔ ایسی نفرت انگیز باتوں سے پرہیز رکھنا ہی تمہاری عزت و عظمت ہے میجر جلال خان ہمارا اپنا ہے۔ ہمارے خاندان کا معتبر اور معزز فرد ہونے کے ناطے ہمارا کرتا دھرتا ہے۔ ہم آج جو بھی ہیں، اس کی مہربانیوں کا گہرا تعلق ہے اس میں۔'' اماں گل بے حد سنجیدگی سے بولیں۔

''یعنی اُس کے احسانوں کے بدلے میں خوش بخت کو بیچ ڈالا آپ نے۔ اُس کی عمر دیکھی ہے، اُس کے باپ کے برابر ہے۔ شادی شدہ، جوان بیٹوں والا ہی رہ گیا تھا میری بچی کے لئے؟ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے مجھ پر اور بچی پر؟ خوش بخت کے لئے بچپن کی منگ کو فراموش کرنا اتنا آسان ہرگز نہیں ہوگا۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''فاطمہ! یہ مت بھولو۔ ہمارے ہاں رشتے بڑوں کی پسند اور مرضی پر طے کئے جاتے ہیں۔ خوش بخت بھی اس رشتے کی گہرائی اور سچائی کو سمجھتے ہوئے ہماری ہم خیال رہی۔ اب وہ اپنے شوہر اور اس کے بچوں کے ساتھ بے حد خوش ہے۔ رحیم کو سمجھا دو، اُس سے دُور رہے۔ اُس کی مسکراہٹوں کو آہوں میں بدلنا اس کے لئے بہت آسان ہوگا۔ بچپن کے طے شدہ رشتے کسی بھی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے۔ پھر بھی مجبوری تو آڑے آ چکی تھی۔ ہم نے جو بھی کیا ہے، بہتری کے لئے کیا ہے۔'' اماں گل سمجھائے جا رہی تھی۔

''سانپ کے سنپولے پالنے سے وہ اس خاندان کی نورِ نظر تو بننے سے رہی۔ سوتن کے ناطے سے ہمیشہ دھتکاری جائے گی۔'' وہ نفرت سے بولی۔

''آپ کی یہ لعن طعن سب کو آزردہ کر رہی ہے۔ مہربانی سے ان کی مجبوری کو سمجھنے کی



کوشش کریں۔ اماں جان! مجھے آپ سے یہ اُمید ہرگز نہ تھی۔'' رحیم خان نے خفگی سے کہا تو ماں حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگی۔

''اماں جان! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آپ مجھ سے خفا نہیں ہوں۔'' وہ ادب سے بولا تو اس نے اُسے گلے لگا لیا۔

''تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔ بس خوش بخت کے پرائی ہو جانے کے دُکھ میں سب کچھ بول گئی۔ اللہ اُسے خوش و خرم اور آباد رکھے۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ہر ایک کی آنکھیں اشکبار تھیں مگر کمرے میں جان لیوا سکوت طاری تھا۔

''سب یہاں موجود ہیں۔ مگر ثریا نظر نہیں آئی۔'' رحیم خان نے آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔

''وہ کمرے میں کہیں چھپی بیٹھی ہو گی۔'' صفیہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

دونوں اُس کے کمرے کی طرف چل پڑے۔

''ثریا! دیکھو یہ کون آیا ہے۔'' صفیہ نے ثریا کو نہ پا کر تجسس بھری آواز میں کہا۔ ذرا سا پردے کی جنبش پر رحیم خان سمجھ گیا کہ وہ اُنہیں تنگ کرنے کے لئے پردے کے پیچھے چھپ گئی ہے۔ رحیم خان نے فوراً پردہ ہٹا دیا۔ وہ منہ، ہاتھوں کے پیالے میں چھپائے رو رہی تھی۔ صفیہ، رحیم خان کے گلے لگی ہچکیوں سے رونے لگی۔

''میرے آنے کی کسی کو خوشی نہیں ہوئی۔'' رحیم نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''آئندہ کبھی ملنے نہیں آؤں گا۔''

یہ سن کر ثریا نے لاچارگی سے رحیم کو دیکھا اور بے حد افسردگی سے کہا۔

''زندہ لاشوں سے خفا نہیں ہوتے رحیم لالہ!''

اُس نے صفیہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اور معاملہ سمجھ کر وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

❖❖○❖❖

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"خان صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔ کیا میں مسئلہ پوچھنے کی جسارت کرسکتی ہوں؟" وہ پلنگ پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اُس نے اُس کی کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ بس یونہی۔" اُس نے لاتعلقی کا اظہار کیا۔

"مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں آرہا۔ آپ کی خاموشی، آپ کے بدلے ہوئے تیور، آپ کی اندرونی کیفیت کی غمازی کرنے کو کافی ہے۔ کیا آپ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں؟" وہ نرمی سے بولی۔

"اگر عقل مند ہو تو سمجھ سکتی ہو میری پریشانی۔" وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"جی۔ اندازہ تو لگا سکتی ہوں۔ آپ کا بتانا زیادہ بہتر ہے۔ ہم دونوں ساتھی ہیں ایک دوسرے کے دُکھ درد اور خوشی کے۔" وہ بے حد ملائمت سے بولی۔

"میں بھی یہی سمجھتا تھا۔" وہ رُکھائی سے بولا۔

"سمجھتا تھا۔ کیا مطلب ہے؟ میں سمجھی نہیں۔" وہ انجان بنی رہی۔

"خوش بخت! میاں بیوی کا رشتہ اعتماد اور بھروسے کی بنیاد پر رکھا جاتا ہے۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ ہمارے رشتے کی بنیاد میں اعتماد کی پختگی اور مضبوطی کی کمی نے اس کو بالکل کھوکھلا کر دیا ہے۔" لہجے میں شکوہ نمایاں تھا۔

"وہ کیسے؟" وہ اندر سے کانپ رہی تھی۔

"تمہارا رحیم سے طے شدہ رشتہ صیغۂ راز میں کیوں رکھا گیا؟ جبکہ میں نے اپنی



زندگی کی کتاب کا ہر صفحہ آپ سب کے سامنے کھول کر رکھنے میں کہیں بھی پردہ پوشی نہیں کی۔ میں سچائی اور حقیقت کو چھپانے کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے فیروز لالہ پر یہ اُمید نہیں تھی۔ اور تم اتنی بڑی حقیقت کو کیسے ہضم کر گئی کہ مجھے کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی۔ تمہاری اس حرکت نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر ہمارے رشتے کو کس قدر کمزور کر دیا ہے، اس کا اندازہ کر سکتی ہو؟" لہجے میں اتنی سنجیدگی تھی کہ وہ لاجواب ہو کر اُس کا منہ تکنے لگی۔

"کلثوم خفیہ عورت نہیں تھی۔ بے حد سچی اور کھری، کھلی کتاب کے مانند۔" اُس نے ایک اور ضرب لگا دی۔

"اتنی سی بات پر خفا ہو گئے۔" وہ منمناتی آواز میں بولی۔ اُسے اپنا تمام تقدس اور پاکیزگی غارت ہوتی محسوس ہوئی۔ اعتماد کی تاریں ٹوٹتی ہوئی اور سکون مفقود ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ چہرے پر شرمندگی کا تاثر نمایاں تھا، جسے جلال خان نے بھی محسوس کیا۔ وہ لامحالہ مسکرا دیا۔

"بچپن کی منگنیاں سراسر جہالت کی نشانی ہیں۔ مجھے اس کا علم ہوتا تو کیا میں تمہیں ٹھکرا دیتا؟ ہرگز نہیں۔ بس افسوس تو رہے گا ہمیشہ کہ مجھے آپ لوگوں نے اپنا نہ سمجھا۔ یہ راز چھپانے کی ضرورت نہ تھی۔"

کہنے کو اور صفائی پیش کرنے کو اُس کے پاس الفاظ ہی نہ تھے۔ اسی اثنا میں رضا کے رونے کی آواز آئی تو دونوں اس طرف متوجہ ہو گئے۔

جلال خان جو اِک مہان ہستی تھی، فراخ دلی اور فیاض طبیعت نے اسے فرشتے کا روپ بخش کر بہت باعزت اور معتبر بنا دیا تھا۔ مگر آج معمولی سی غلط فہمی نے اُس کی شخصیت کو چکنا چُور کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت منہ سُجائے رہتا۔ خوش بخت کتنی بے چینی سے اُس کا دفتر سے واپسی کا انتظار کرتی تھی۔ اب مارے خوف کے معاملہ ہی بدل چکا تھا۔ ہر طرح کی سوچیں ذہن پر آسیب کے مانند مسلط ہو کر اُسے بے کل رکھتیں۔ سچائی میں وقتی کڑواہٹ کا دخل تو ہوتا ہے۔ مگر اس کے دیرپا اثرات کافی حد تک شیریں ہوتے ہیں۔ شوہر کی شکایت کو جھٹلا سکتی تھی نہ اقرار کر کے مزید ندامت و شرمندگی کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتی تھی۔ جلال خان کے من میں اُٹھنے والے شکوک و شبہات لمحہ بہ لمحہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com



اُسے جھنجوڑ رہے تھے۔ خاموش اور اعصابی جنگ نے گھر کا ماحول اس قدر پراگندہ بنا دیا تھا کہ رضا خان بھی ماں کی پریشانی اور لاپروائی کے تاثر سے محفوظ نہ رہ سکا۔ بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔

فیروز خان نے بھی تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے جلال خان سے بات کی۔ کیونکہ قصور اتنا بڑا نہ تھا، جتنی سزا کی سنگینی جان لیوا تھی۔ جلال خان نے فیروز خان کو تسلی و تشفی سے رخصت تو کر دیا، مگر دل میں چبھا ہوا کانٹا ابھی تک اذیت دیئے جا رہا تھا۔ وہ خوش بخت کے ساتھ ابھی بھی اُکھڑا ہوا تھا۔

رضا دو دن ہسپتال میں داخل رہا۔ واپسی پر خوش بخت نے بات چھیڑی۔ اپنی صفائی میں جو دل میں آیا، بولتی چلی گئی۔ ندامت، ذلت اور بے عزتی کے احساس نے اُسے پہلے ہی زیر کر دیا تھا۔ اب اس موضوع پر گفتگو اس کے لئے آسان ہرگز نہ تھی۔ مگر وہ پھر بھی اپنے گھر، اپنے بچے کے لئے التجا کئے جا رہی تھی۔ مگر دوسری طرف نہ ٹوٹنے والی خاموشی تھی۔

گھر پہنچ کر وہ جلال خان کے پیچھے کمرے میں چلی گئی اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

”اب میں تمہاری مکاری اور چالبازی میں آنے والا نہیں۔ میرے اعتماد کو جو تم نے ٹھیس پہنچائی ہے، وہ کیسے فراموش کر دوں؟ نہ جانے کل پھر کس راز سے پردہ اُٹھ جائے اور میں پھر حیرت و تجسس میں اپنی نادانی و بے وقوفی کو کوستا رہوں۔ مجھے فیروز لالہ پر نہ غصہ ہے، نہ ہی کوئی شکوہ ہے۔ مجھے تم سے ایسی اُمید ہرگز نہ تھی۔ تم میری نظروں میں کیا تھی، اس کا اندازہ نہیں لگا سکو گی۔“ وہ حقارت سے بولا تو خوش بخت کے آنسو رک گئے۔

”مجھے بھی آپ سے کم ظرفی کی اُمید ہرگز نہیں تھی۔ میری منگنی ہوئی تھی، شادی نہیں ہوئی تھی، جو بتانا ضروری تھا۔ آپ کو ہر حیلے سے مطمئن کرنے کی میری تمام کوششیں ناکام رہی ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی ان نازیبا اور ناشائستہ حرکات کی وجہ نہیں سمجھتی؟ آپ کو میرے کردار پر شک ہے۔ کھل کر مجھ پر تہمت کیوں نہیں لگا دیتے؟“ وہ غیر اختیاری طور پر چیخ پڑی تھی۔

وہ حیرت سے اُس کا یہ روپ دیکھتا رہ گیا۔

”مجھے جواب دیں۔ اگر آپ کو مجھ پر شک ہے تو میرا آپ کے ساتھ زندگی گزارنے



کا کوئی حق نہیں بنتا۔ پل پل کا جینا اور مرنا میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے جلال خان! میں گونگی بہری اندھی چلتی پھرتی لاش بن کر زندگی گزارنے والی عورت نہیں ہوں۔ مجھے زیادتی اور بے جا ظلم پر احتجاج کرنا آتا ہے۔ آپ کی یہ خوش فہمی ہے کہ مجھے رُلا رُلا کر، میری بینائی کا پانی بہا کر زبان کو مقفل اور پاؤں میں قید بامشقت کی منوں بھاری زنجیروں میں جکڑ کر کال کوٹھری میں پھینک کر مجھ سے اپنے حقوق وصول کرتے رہیں گے، تاحیات۔ ایسا میرے ساتھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔“ لہجے میں اتنی خود اعتمادی تھی کہ وہ چونک گیا۔

”اس معاشرے میں عورت کے حقوق کے لئے آپ جیسے مردوں نے کیا کیا ڈرامے کھیلے ہیں، کیا کیا ڈھونگ رچا کر خود کو مزید مستحکم اور مضبوط بنایا ہے۔ آپ کی ہر چال میں ٹیڑھا پن اور خود غرضی پنہاں ہے..... قصور آپ کا نہیں۔ ہماری پیدائش ہی گناہِ عظیم ہے۔ کتنا ہی اچھا ہوتا، ہمیں پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جاتا۔ کم از کم آپ جیسے بے انصاف اور جھوٹی غیرت کے پرستار مردوں سے پالا تو نہ پڑتا۔ والدین کے گھر سے اس کی حیثیت کو بھائی سے کمتر، اُس کے وجود کو قابلِ نفرت، اُس کی سوچ اور اُس کی پسند کو حقارت کی نظر سے دکھا گیا ہے۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، پڑھنے لکھنے، رہنے سہنے غرضیکہ اُس کی زندگی کا فیصلہ کرنے میں بھی اُسے ناقص العقل، بے وقعت، بے زبان اور بے نام ہی سمجھا گیا۔ یہ مقام جنہوں نے اسے زندگی بخشی اور اس دنیا میں لانے کے قصوروار ٹھہرے، انہوں نے بخشا۔ اگر ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ ہر دفعہ بیٹے کو جنم دے کر سینہ تان کر چلتے۔ پھر طرہ یہ کہ بیٹی کو بے سروسامان، بے دردی سے ہاتھ پاؤں کاٹ کر انجان مرد کے ساتھ رخصت کر کے سرخرو ہونے کی مبارکبادیں وصول کی جاتی ہیں۔ اور سسرال میں اپنی ہم جنس تاک میں بیٹھی ہوتی ہیں۔ اور شوہر سے دُرگت بنانے کے ہتھکنڈے استعمال ہونے لگتے ہیں۔ شوہر، سسر، دیور، جیٹھ تو اونچے شملے، بھاری پگڑیوں والے حضرات کیا درجہ دیں گے اس معصوم کو، جن کے لئے بیاہ کر لائی ہوئی عورت صرف بچے پیدا کرنے والی مشین اور خدمت گزاری کرنے والی نوکرانی کے سوا کچھ نہیں۔ اس عورت کی صحت و آرام پر دھیان دینا، اُس کی عزتِ نفس کا خیال رکھنا اور اُسے انسانوں کے زمرے میں گننا مردانگی کے سراسر خلاف سمجھا جاتا ہے۔ مگر ایک بات آپ ذہن نشین

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کرلیں۔ مجھے اپنے حقوق کی خاطر کھڑا ہونا آتا ہے۔ کیونکہ میرے گھر کی تربیت نے جہاں مجھے خاوند سے وفاداری کا سبق سکھایا ہے۔ وہاں اپنی عزت کی خاطر لڑنا بھی میری گھٹی میں ڈالا گیا ہے۔"

وہ یہ سب کچھ بول کر پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔ جلال خان ہکا بکا ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتا رہ گیا۔ بات تو سچ کہہ گئی تھی۔ ایسی کیا قیامت آ گئی تھی کہ وہ اپنا دماغی توازن ہی کھو بیٹھا تھا۔ اس کے اندر کی بھڑکتی ہوئی آگ کو خوش بخت کے آنسو وقتی طور پر دھیما تو کر دیتے، مگر چنگاریاں سلگتی رہتیں۔ راکھ کے نیچے دبی ہوئی انگارہ بننے اور بھڑکتا شعلہ بننے کی تیاری میں مگن رہتیں۔ آج خوش بخت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ مظلومیت میں گھٹ گھٹ کر سسکیاں بھرنا اور ندامت سے نظریں نیچی کر کے زندگی گزارنا اُس کے بس میں نہ تھا۔ وہ واپس گاؤں جا کر ماضی کی طرح خدمتِ خلق میں اپنے والدین کا ہاتھ بٹانے لگ جائے گی مگر شک وشبہات کے ویران اور بدنما چبوتروں میں رہ کر اپنی زندگی کو رائیگاں نہیں جانے دے گی۔ سُولی پر لٹکی ہوئی جان، دل میں چبھے ہوئے کانٹوں کا کرب، اندیشوں، ڈر اور خوفزدگی کا لہو اُس نے شوہر کے سر پر اُنڈیل کر اپنے دل کی تمام بھڑاس نکال لی تھی۔ بلکتے ہوئے رضا کو اُس نے سینے سے چپکا کر اُسے لاتعداد بوسے دے ڈالے۔ گھر کا جائزہ لیتے ہوئے وہ سوچ میں گم ہو گئی۔ میرے گھر کو کسی کی نظر لگ گئی...... کلثوم کی بددعائیں مجھے کھا گئیں...... یہ گھر، جس کے در و دیوار سے خوشیاں اور مسکراہٹیں پھوٹتی تھیں، آج سکوت اور عالمِ ہُو میں مقید ہے۔

مارے گھبراہٹ کے اُس پر پھر سے وحشت طاری ہونے لگی، جسے اُس نے رضا خان سے میٹھی توتلی باتیں کرتے ہوئے ٹال دیا۔ اپنی بے بسی اور لاچارگی پر رحم و ترس کھانے کے بجائے وہ بے شمار دعاؤں کے ساتھ سجدے میں گر کر باری تعالیٰ سے راہنمائی کی التجا کرنے لگی کہ ایک نسوانی، نازک، پیار سے بھرپور ہاتھ اُس کے سر پر پھرنے لگا۔ وہ چونک کر اُٹھی تو دیکھا، فاطمہ پھوپھی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ دروازے میں جلال خان کھسیانی سی ہنسی کے ہمراہ شرمندگی مٹانے کی کوشش میں کھڑا اُسے تک رہا تھا۔ کم عمری آڑے آتے ہی وہ سہمی اور ڈری، پھر فاطمہ کے گلے لگ کر آنسو ضبط کرنے لگی۔

"خوش بخت! ہم تمہیں یاد نہیں آتے؟" وہ پیار کرتے ہوئے بولی۔ "آج میں نے



سوچا، اپنی بچی کو خود ہی مل آتی ہوں۔ تم نے تو دل بہت سخت ہی کر لیا ہے۔"

"ایسے تو نہیں۔ یاد کیوں نہیں آئیں گی؟ ہمارا ہے ہی کون آپ کے بغیر؟" وہ احتراماً بولی۔

"میری بچی نے گھر تو بڑا سلیقے سے سجا رکھا ہے۔ تمہیں ہنستا بستا دیکھ کر دل کو ٹھنڈک اور راحت نصیب ہوئی ہے۔ باہر تمہارے تینوں بھائی بھی تمہیں ملنے کو آئے ہیں۔" وہ نرمی سے بول رہی تھی۔

خوش بخت ہمت کر کے جاءنماز سے اُتری اور چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

رحیم، کریم اور علیم کو شیر خان اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ اُس نے سوالیہ نظروں سے فاطمہ کو دیکھا تو جلال خان نے خوش بخت کا ہاتھ پکڑا اور شیر خان کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ہاتھ کی گرفت کی مضبوطی، جلال خان کے اندرونی جذبات کی ترجمانی کر رہی تھی، چہرے پر ایسی مسکراہٹ جیسے اُس نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

اتنی جلدی غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ دل میں سوچ کر اپنی فتح مندی پر نازاں ہونے لگی۔ اُسے کیا معلوم کہ شوہر ذات اپنا پینترا بدلنے میں دیر نہیں لگاتی۔ وہ سب سے بڑے تپاک سے ملی اور خوشی خوشی اُن کے ٹھہرنے اور طعام کے انتظام میں محو ہو گئی۔ جلال خان بھی مہمان نوازی کے تمام تقاضے پورے کرنے میں کوشاں ہو گیا۔ مگر اندر کہیں دُور کسی کونے میں ڈھلتی ہوئی جوانی اور خوش بخت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا شباب کا احساس اُسے بے کل کرتا رہا۔

چند دن کے قیام کے بعد یہ لوگ واپس چلے گئے اور حالات پھر سے معمول پر آ گئے۔ جلال خان کوشش کے باوجود پہلے جیسا رویّہ اختیار نہ کر سکا۔ اعتماد کے ٹوٹنے کی گرہ اتنی مضبوط تھی، جسے خوش بخت کا صبر اور پیار، توجہ اور لگاوٹ بھی نہ کھول سکی تھی۔ اُس کی ناراضگی اور خفگی کے رویّے نے جلال خان کو بظاہر قدرے بدل تو دیا تھا، مگر باطن میں شک براجمان تھا۔ حالانکہ اُسے خود پر بڑا زعم بھی تھا۔ اپنے رُتبے پر کبر و پندار بھی تھا۔ پھر رحیم سے خدشہ کس بات کا تھا؟ دونوں میں عمر کے فرق نے اُسے تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ ذہنی انتشار اور پُر پیچ خیالات اُس کے خوب صورت کردار کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر رہے تھے۔ شک کی نظر کا رشتہ شیطان سے منسلک ہوتا ہے، جو رشتوں کے تقدس کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پامال کرتا ہوا ایسا رخنہ ڈالتا ہے کہ پھلتے پھولتے چراغ، روشن مراد حاصل گھرانوں کو ویران اور دشت میں بدل کر نسلوں کو تباہ و برباد کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔ کینسر کے کیڑے کے مانند جسم کے ایک ایک عضو کو اپنی گرفت میں اُس وقت تک جکڑے رکھتا ہے، جب تک سوچنے سمجھنے کی قوت سلب نہیں ہو جاتی۔ موت واقع نہیں ہو جاتی۔

شیر خان اور دلیر خان کی دوستی، علیم سے اتنی گہری ہو چکی تھی کہ چھٹیاں ہمیشہ ایک دوسرے کے گھروں میں گزاری جانے لگیں۔ جلال خان اس دوستی پر مطمئن بھی تھا، نالاں بھی تھا۔ بچے علیم کی صحبت میں وہ کچھ سیکھ رہے تھے جو ایک سکول بھی سکھانے سے قاصر تھا۔ مگر اس گھرانے کی یکجائی سے خوف زدہ ضرور تھا۔

خوش بخت بھی نہایت دانش مندی کا ثبوت دینے میں کہیں بھی مات نہ کھاتی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کو اس مسئلے میں اُلجھانے سے گریز برت رہی تھی۔ اُس کی سمجھ اور فہم کے مطابق دو باہوش ذی روحوں کی زندگی کی راہنمائی میں والدین، دوست احباب اور بچے ہمیشہ معاملے کو سدھارنے کے بجائے بگاڑ دیتے ہیں۔ اُس نے ایسی شادیاں کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹتی دیکھتی تھیں۔ کبھی جڑتی یا کامیاب ہوتے نہ دیکھی تھیں۔ اس لئے جو غلط فہمی اُن کے درمیان حائل ہوگئی تھی، آکاش بیل کی طرح بغیر جڑ کے تھی۔ جلد یا بدیر اُس کا خاتمہ لازم تھا۔ ان لمحوں کے انتظار میں دن بیت رہے تھے۔ مگر ایک سبق جو اُس نے سیکھا تھا کہ شوہر سے رازداری اور پردہ، اعتماد و بھروسے کو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ جس کے بحال ہونے میں نجانے عمریں ہی گزر جائیں۔ اماں گُل جیسی جہاندیدہ عورت کے خام خیال میں بھی نہ آیا کہ خوش بخت کی منگنی کا تذکرہ ہونا کتنا لازم تھا۔ ورنہ کبھی بھی اس معاملے کو راز میں نہ رکھا جاتا۔

وہ جلال خان کی آواز پر چونک اُٹھی۔ آج مہینوں بعد اُس نے اسے خوشی کہہ کر پکارا تھا۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ رضا ہمیشہ کی طرح اُس کی ٹانگوں سے لپٹ کر ضد کرنے لگا۔ اُس نے پیار سے اُسے اُٹھا کر ہوا میں اُچھال دیا اور کھل کھلا کر قہقہے لگانے لگا۔

"رضا! آج تمہارے آغا جان کو کرنل کے عہدے پر فائز کر دیا گیا ہے۔ خوشی! تیار ہو جاؤ۔ رضا کے نانا جان کو شیرینی کے ہمراہ یہ خوشخبری سناتے ہیں۔" خوشی سے اُس کی



آواز میں لرزش تھی۔

خوش بخت اس خوش کن خبر کو سن کر اس کے سینے سے لگ گئی اور دونوں نے بیک وقت رضا کو چومنا شروع کر دیا اور ایک مشترکہ قہقہہ گھر بھر میں گونج اُٹھا۔ رُتبے اور ترقی کی خبر بھی کتنی پُرکیف اور نشہ آور ہوتی ہے کہ یک دم دُکھ اور غم، شکوے اور شکایتیں کہیں پسِ منظر میں پوشیدہ ہو کر چارسُو خوشیوں کے جلترنگ بکھر جاتے ہیں۔ اُس نے غور سے جلال خان کا جائزہ لیا۔ اعصابی جنگ و جدل کی مسافت میں وہ کتنا تھکا ماندا لگ رہا تھا۔ موٹی موٹی بادامی آنکھوں کے نیچے حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ ماتھے کی شکنوں میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ کنپٹیوں کے سفید بالوں میں بھی زیادتی ہوگئی تھی۔ دونوں نے لڑ جھگڑ کر دل کی بھڑاس نکالنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اندر ہی اندر گیلی لکڑی کی طرح دونوں ہی سلگتے رہتے تھے۔ خوش بخت تیار ہوتے خوشی اور غم کے ملے جلے امتزاج میں رو پڑی۔ اُسے ہمیشہ جلال خان کی غیر متوقع حرکات پر غصہ آتا تھا۔ مگر آج رحم و ترس حاوی ہو چکا تھا۔ وہ خود کلامی کر رہی تھی۔ جلال خان اپنی ویران، پژمردہ زندگی کو میری وفا اور محبت سے آباد کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ سب کیا ہو گیا؟ کیوں بات کا بتنگڑ بن گیا، جس کا نہ سر نہ پیر۔ کلثوم کی آہیں اور فریادیں اور بد دعائیں ہمارے درمیان حائل ہو گئیں۔ شاید میں ظالم ہی تھی، جو اُس کا سہاگ چھین لیا۔ اب اُس کی اولاد کی مالک بن بیٹھی۔ وہ مجھے دُعا کیونکر دے گی؟ خوش بخت! تمہیں تو اپنے کیے کی سزا بہت جلد سنا دی گئی ہے، جس کا ازالہ ناممکن ہے۔ میری خاطر جلال خان نے اپنوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اور میں کتنی کم ظرف نکلی کہ اس کے بچوں کو بمشکل ہی قبول کر سکی۔

اُسے وہ دن یاد آ گیا، جب جلال خان بچوں کو گھر میں لایا تھا اور اُس نے کئی راتیں کروٹیں بدلتے اور روتے گزار دی تھیں۔ آخر مجبوراً انا مار کر اُس نے اس حقیقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیا تھا۔ پھر میں نے اپنی منگنی کا بھید کیونکر چھپایا؟ کیا میرے من میں فتور تھا یا دل میں رحیم کی اجارہ داری تھی؟ اگر میری ذات اُس کی یاد اور پیار سے عاری تھی تو پھر ڈر کس بات کا تھا؟ آج اُسے جلال خان سراسر درست اور جائز لگ رہا تھا۔ اُس نے آج خود کو جلال خان کے سانچے میں ڈھال کر سوچا تھا۔ بے شک وہ بالکل معصوم اور بے گناہ تھی۔ مگر جلال کی سوچ کے مطابق اُس کا قصوروار ہونا فطری عمل تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"خوشی! بہت دیر کر دی۔" وہ وردی کو ہینگر پر ڈالتے ہوئے بولا۔ "تمہارے اور میرے درمیان بات ہے کہ فیروز لالہ کو اب جوان بیٹے مل گئے ہیں۔ اب اُنہیں ہمارا انتظار کرنا فضول لگتا ہوگا۔"

"آپ کی جگہ اور کوئی نہیں لے سکتا۔" وہ بے حد ملائمت سے بولی۔ "آپ تو ان کے جگری یار اور چھ بھائیوں کا نعم البدل ہیں۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا؟"

اُس کی یہ نرمی اور خوشامد اُسے کوئی نئی چال لگی۔ کیونکہ بیمار ذہن کی سوچ بھی بیمار اور منفی ہوتی ہے۔ وہ طنزیہ مسکرا دیا۔

"خان صاحب! معمولی سی غلطی کی پاداش میں ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا آپ مجھے معاف کر سکتے ہیں؟ وہ دونوں ہاتھ جوڑے، سر جھکائے کسی ملازم کی طرح اُس کے سامنے کھڑی تھی۔

جلال خان نے اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں بھینچ لیا۔ وہ سینے سے سر لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مجھے معاف کر دیجئے۔ میرا پیار اور عشق آپ ہیں۔ صرف آپ۔" وہ گڑگڑا کر بول رہی تھی۔

وہ جو جلال خان کی منظورِ نظر اور اطمینانِ قلب تھی، اپنا مقام کھونے کا صدمہ اُسے ہلکان کر رہا تھا۔ وہ کون سا حربہ استعمال کرے؟ قرآن اُٹھا کر اپنی پاکیزگی کا یقین دلائے یا رضا کی قسم اُٹھا کر اپنے یار کو منا لے۔ میکے کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر اُسے پُرسکون کر دے یا اُس کے پاؤں پڑ کر اپنی شرافت کی دہائی دے کر اس کے دل و دماغ میں بس جائے۔ وہ کیا کرے؟ اور وہ بدستور ساکت و جامد پیکرِ بے چین کھڑا تھا۔

"کیا آپ نے میری آنکھوں میں، میرے روّیے میں رحیم کے لئے پسندیدگی محسوس کی ہے؟ مجھ سے اپنے دل کی بات کہہ دیں خان صاحب! ہم آج اس مسئلے کو حل کر کے چھوڑیں گے۔" وہ تاسف کے انداز میں بولی۔

"خفیہ پن تمہاری فطرت کا وہ حصہ ہے، جس سے چشم پوشی کرنا سراسر نادانی ہوگی۔ اگر مجھے تمہارے کردار پر رتی بھر شک ہوتا تو میں نے اکیلے رہنے کا فیصلہ کر لیا ہوتا۔ میری زندگی کے بے شمار سال تنہائی میں کٹے ہیں۔ مجھے اس کی عادت ہے۔ شاید وقت پھر سے



ہمیں قریب لانے میں کامیاب ہو جائے۔" لہجے میں سنجیدگی اور کرب تھا۔

"وقت بہت بڑا منصف ہے۔ انتظار میں کہیں ہماری عمریں ہی نہ بیت جائیں۔ ایک بات بولوں اگر اجازت ہو؟" وہ ذہن میں اُٹھنے والی شوریدہ لہروں پر قابو پاتے ہوئے تحمل سے بولی۔

"ہاں بولو!" وہ اپنی تمام تر توجہ اُس کی طرف مبذول کرتے ہوئے بولا۔

"یہ کیسی عجیب اور روح فرسا حقیقت ہے کہ مرد چاہے شادی پر شادی رچاتا جائے، دن بھر حسیناؤں کے جھرمٹ میں گھرا جھوٹے وعدے وعید کرتا رہے، اپنی راتوں کو کوٹھوں کی زینت سے سجاتا رہے، شراب اور جوا اُس کی عیاشیوں کا اہم حصہ ہو، پھر بھی قابلِ قبول اور قابلِ معافی ہے۔ اس کے باوجود بیوی کا دلکش مسکراہٹ سے استقبال کرنا اُس کے اوّلین فرائض میں شامل ہے۔ ایسا کیوں ہے خان صاحب! ہم سے ایسی بے انصافی کیوں؟ میری بچپن کی ٹھہرائی ہوئی نسبت پر اتنا اعتراض کیوں کہ آپ نے اپنی اور میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔" وہ گہرے دُکھ سے بولی۔

"خوش بخت! میں نے تم سے پیار عمر کے اس حصے میں کیا ہے، جب تپتی دوپہر ڈھلنے کو تھی۔ کوئی ڈرامہ یا مذاق نہیں تھا میرا لگاؤ اور اُنس۔ بس ایک دھچکا لگا ہے۔ خدا کرے تم میری جنم جنم کی ساتھی بن کر میرے ہوش و حواس پر چھائی رہو۔ جس مرد کی تم نے تعریف کی ہے، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اس لئے تم پر میری اُمیدیں اور توقعات بجا ہیں۔ تم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ بارش کا پہلا قطرہ، پہلا پیار و عشق، پہلی اولاد کا ذائقہ، مزدور کی پہلی تنخواہ کس اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔" لہجے میں دھیما پن نمایاں تھا۔

"جی جانتی ہوں۔ آپ میرا پہلا اور آخری پیار ہی تو ہیں۔ میری سچائی پر یقین کر لیجئے۔" وہ بلک اُٹھی۔

"میں اپنی بات کر رہا ہوں۔ بیوی بچے ہونے کے باوجود تم میرا پہلا عشق ہو۔ پہلی محبت ہو۔ اور تم نے مجھے دھوکا دے ڈالا۔" لہجے میں گلہ تھا۔

"اِک معمولی سی لغزش اعتماد کو یوں نگل جاتی ہے۔ مجھے علم نہ تھا۔ آپ تو اتنے اعلیٰ ظرف اور روشن ضمیر انسان ہیں۔ مجھے معاف کرنا آپ کے لئے مشکل ہرگز نہیں۔" وہ سر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جھکائے کھڑی تھی۔ جلال خان نے سراسیمہ نظر ڈالی۔ وہاں پاکیزگی اور صبر و تحمل کا اپنا تحیر خیز حُسن و جمال براجمان تھا۔ اُس نے اُس کے جھکے ہوئے چہرے کو اوپر کیا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور تمام شکوے شکایتیں آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلے۔

اماں گُل کی نصیحت اُس کے کانوں میں گونج اُٹھی۔ عورت کی شکست ایک فتح مند اور خوشگوار زندگی کو جنم دے کر ایسی جِلا بخشتی ہے جس کے بیش بہا خزانے سے نسلیں مستفید ہوا کرتی ہیں۔ اپنے مرد کو جیتنے کا ایک گُر کبھی فراموش نہ کرنا۔ آواز دھیمی اور نظریں نیچی رکھ کر اس پر حکمرانی کرو، راج کرو۔ یہ تمہاری جیت ہے۔

◆◆◆○◆◆◆

گاؤں میں جلال خان کی ترقی کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔

مردان خانہ میں گاؤں کے تمام معزز حضرات جمع ہو کر اپنی خوشی کا اظہار کرنے پہنچ چکے تھے۔ گیٹ پر تمام غرباء مبارک باد دینے اور صدقہ و خیرات وصول کرنے آئے ہوئے تھے۔ بتاشوں کی بوریاں تقسیم ہو گئیں۔ فیروز خان خوشی اور فخر سے سب کو اُس کی لیاقت اور ذہانت کے قصے بیان کر رہا تھا۔

جلال خان دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ یہ تو طبعی اور قدرتی امر تھا۔ تعریف تو اس جہاں کے مالک کو بھی بے حد پسند ہے۔ ہم تو بہت ناچیز اور ناتواں مخلوق ہیں، تعریف کو کیسے ہضم کر سکتے ہیں۔

گھر پر بھی ہر طرف سے مبارکبادیں وصول ہونے لگیں۔ روایت کے مطابق جونیئرز افسران کا گھر پر تانتا بندھ گیا تھا۔ مگر ابھی تک اُس کے اپنے خونی رشتہ داروں سے کسی قسم کی کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی تھی۔ جبکہ اُس نے اردلی کے ہمراہ بتاشوں کی بوریاں اور لڈو، آغا جان کی طرف بھجوا دیئے تھے۔ اس گاؤں کے بیسیوں لڑکے آرمی میں بھرتی کروانے سے گاؤں میں اس کی واہ واہ ہو گئی تھی۔ اَن پڑھ اور غریب بچوں کو میس میں بھرتی کروا کر اس نے بے شمار دعائیں وصول کی تھیں۔ پھر آغا جی کی طرف سے خوشی کا کوئی پیغام رساں نہ پہنچا تھا۔ اُسے خوشیاں بانٹنے کے لئے بھی اپنے قربت داروں کی موجودگی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھیں۔ حالانکہ اپنی محرومیوں اور اذیتوں کو وہ شیرِ مادر کی طرح پی لیا کرتا تھا۔ مگر خوشی میں ہمیشہ اُس نے اپنے والدین اور بہن بھائی کی کمی کو محسوس کیا تھا۔ آج بتدریج یہ کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ کیونکہ حیات پانے کا ٹانک انہی خونی رشتوں کی حدت اور تپش میں پنہاں ہے۔

خوش بخت کی سوچ مسافت طے کرتے وہاں تک پہنچ گئی تھی، جہاں جلال خان خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ آج کی خوشی میں اُس کے ساتھ اپنا کوئی نہ تھا۔ دوسری شادی کی وجہ سے وہ اپنے خاندان اور اپنے قبیلے سے تقریباً کٹ کر ہی رہ گیا تھا۔ سب کی نظر میں بچوں کی ذمہ داری اُٹھانا اور گاؤں کے مکینوں کے کام آنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ خاندان کے کسی بھی فرد پر احسانِ عظیم نہ تھا۔ دوسری شادی کی غلطی اپنی جگہ ناقابلِ معافی گردانی جاتی تھی۔ انتظار میں دن گزرتے گئے۔

آخر نئے رینک کے ساتھ اُس کی تبدیلی نوشہرہ اس کے گاؤں کے قریب ہو گئی۔ خاندان سے براہِ راست تعلق رکھنے کے تصور نے جلال خان کو ایسی دلی طمانیت بخشی کہ وہ بھول گیا کہ خوش بخت کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ خوش بخت کو جلال خان کی تمام تسلیاں اور وعدے موہوم اور بے حقیقت لگنے لگے۔ مارے خوف کے اُس پر کپکپی طاری ہو گئی، جس کا اظہار کرنا اس وقت مناسب ہرگز نہ تھا۔ شیر خان اور دلیر خان اپنا سکول اور اپنے دوست چھوڑنے پر نالاں اور پشیمان نظر آنے لگے۔ خوش بخت کے خاندان والے افسردہ اور پُر ملال ہو کر حویلی میں اکٹھے ہو گئے۔ صفیہ اور فیروز خان سینے پر سل رکھے سب کی ہمت بڑھا رہے تھے۔ خطرے کی گھنٹی پُر زور طریقے سے بج اُٹھی تھی۔ خاموشی، مجبوری کا روپ دھارے ہر طرف براجمان تھی۔ بیٹی پرائی ہو چکی تھی۔ اُس پر کسی کا کوئی زور یا دعویٰ نہ تھا۔

گھر کا سامان لکڑی کے بڑے بڑے کریٹوں میں پیک ہو کر نوشہرہ چلا گیا۔ گھر کو میس کے حوالے کرتے ہوئے خوش بخت کو یہاں کے حسین دن اور پُرکیف راتیں یاد آ گئیں۔ وہ ہر کمرے میں حسرت و یاس کی تصویر بنی پھرتی رہی۔ لان خزاں کے موسم سے اثر انداز ہو چکا تھا۔ ہر طرف سوکھے پتے ہوا سے اُڑ رہے تھے۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ شام کی ملگجی روشنی میں اُس نے پورچ کا بلب روشن کر دیا اور اشکبار آنکھوں سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ گھر سے میس کے کمرے میں منتقل ہو کر بے حد غمگین لگ رہی تھی۔ شیر خان اور دلیر خان بھی کھانا کھائے بغیر ہی سو گئے تھے۔ جبکہ جلال خان کے چہرے کی تمازت،

خوشی کی دلیل تھی۔ الوداعی ضیافتیں شروع ہو چکی تھیں۔

سرکاری دعوتوں سے فارغ ہونے کے بعد آخری کھانے کی باری حویلی کی تھی۔ وہاں کا سماں خوش بخت کی رخصتی کا معلوم ہو رہا تھا۔ سردیوں کی دھوپ کی تپش میں خواتین اور بچوں نے باغ میں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ مردان خانہ میں سیاست اور حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات عروج پر تھا۔ فاطمہ اور اماں گُل گھر پر ہی اپنے اپنے دُکھوں کو کرید کر مضطرب ہو رہی تھیں۔ سب آنکھ مچولی، پکڑن پڑائی، پٹھو گرم، چور سپاہی، چھپن چھپائی، بلی چوہے کا کھیل، بادشاہ ملکہ، کرنیل سپاہی جیسے کھیلوں میں محو تھے۔

اس سے فارغ ہونے کے بعد باغ کے اس قطعے کی طرف چل پڑے، جہاں تندرست سبز اور گلابی امرودوں کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ جی بھر کر امرود توڑے اور کاٹے بغیر ان کو کھانے کا مزا لیا گیا۔ اس کے بعد حدِ نظر مالٹے کے باغ پر دھاوا بول دیا گیا۔ باغ کے عقبی کونے میں گنے کے رس کا گُڑ بن رہا تھا۔ گرم گرم گُڑ اور ٹھنڈا ٹھنڈا رس سب کو لطف اندوز کر رہا تھا۔ نہر کا پانی ٹھنڈا ہونے کے باوجود سب پر پھینکا گیا۔ گرد و غبار اور دُھول میں اٹے سب ہنستے کھیلتے، دھینگا مشتی کرتے ہوئے حویلی چل پڑے۔ اونٹ کی طرح تین دن کا کھانا اُن کے پیٹ میں محفوظ ہو چکا تھا۔

باری باری غسل سے فارغ ہو کر سب زنان خانے میں جمع ہو گئے، جہاں لطیفے، گانے، کہانیاں، طنز و مزاح، لڈو، کیرم اور بانسری پر نغموں کی دُھن سنائی گئی۔ سب ہی ایک سے بڑھ کر کلاکار تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے سب خوش بخت کی رخصتی کو بھول کر اپنے اپنے کرتب دکھانے میں مصروف تھے۔ پورا خاندان تسبیح کے دانوں کی طرح مضبوط دھاگے میں پرویا ہوا کیسا بھلا لگ رہا تھا۔ اُن کی زندگی میں استحکام اسی دم سے تھا۔ ورنہ مہاجرت اور مسافرت میں دُکھوں کے سوا کچھ نہیں۔

شیر خان اور دلیر خان تپاک اور ربط و ضبط کا لحاظ رکھتے ہوئے سب میں گھل مل گئے تھے۔ ان محفلوں کے اُجڑ جانے کا قلق سب کو ستائے جا رہا تھا۔

دوسرے دن دوپہر کے کھانے کے بعد خوش بخت کی رخصتی کا وقت آ گیا۔ بارش زوروں پر تھی۔ سردی اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی۔ حویلی میں المناک سکوت طاری تھا۔ جونہی ترشح رُکا، جلال خان جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ رات میس میں گزارنے کے بعد


www.iqbalkalmati.blogspot.com

علی الصبح روانگی کا پروگرام تھا۔ سب نے دُعاؤں کے سائے میں خوش بخت کو خدا حافظ کہا۔ فیروز خان اپنے لختِ جگر، نورِ نظر کو رخصت کرتے ہوئے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش میں لال ہو رہا تھا۔ پیدائش سے لے کر اب تک کی زندگی کا ہر لمحہ فلم کی طرح ذہن میں گھوم رہا تھا۔ کس قدر ہمدرد اور غمگسار بیٹی تھی۔ آج کس بے دردی سے انہیں روتا چھوڑ کر اپنی نئی دنیا بسانے چل پڑی تھی۔ خوش بخت اپنوں کی جدائی کے تصور میں گھلتی جا رہی تھی۔ فاطمہ اسے سینے سے چپکائے ہمت بندھانے کی کوشش کرتے خود روئے جا رہی تھی۔ اُسے اپنی بھتیجی کتنی پیاری تھی۔ اُس نے محض اپنے بھائی کی محبت میں اپنے جذبات کو دبا کر جلال خان کو قبول کرنا اور ہر طرح کے حالات سے سمجھوتہ کر کے بڑے پن کا اظہار کیا تھا۔

رحیم کی کسی حرکت، کسی بات سے یہ ظاہر نہ ہوا تھا کہ اُسے خوش بخت کو کھو دینے کا صدمہ جینے نہیں دیتا تھا۔ اور خوش بخت تو ایسی ہستی تھی، جس نے تمام تر وفائیں، محبتیں اور اُلفتیں اپنے شوہر کے نام وقف کر دی تھیں۔ آج تک نوشتۂ تقدیر کے سامنے کسی کو سوال کرنے کی مجال نہ ہوئی تھی۔ راضی بہ رضا کا وطیرہ اپنائے سب اپنی اپنی دنیا میں مگن ہو چکے تھے۔

جلال خان کے دل کی تمام کدورتیں بغض و عناد، رشک و حسد، خوش بخت کی صلح کُل اور دانش مندی کے سامنے ہار مان چکی تھیں۔ اُس نے سر جھکا کر جو شکست تسلیم کی تھی، وہ اُس کی زندگی کی سب سے عظیم الشان فتح بن گئی تھی۔

اُس کی یونٹ کے لوگ اُسے خوش آمدید کہنے گارڈ روم پہنچ چکے تھے۔ دوسری جیپ میں اُن کا روزمرہ استعمال میں آنے والا سامان بھی پہنچ گیا۔ اس میں ایک کالے رنگ کا جست کا صندوق بھی تھا، جس کا پینٹ جگہ جگہ سے اُتر کر اُس کی سال خوردگی کی نشاندہی کر رہا تھا۔ اس نے بھی نہ جانے کتنے ہی سفر طے کئے تھے۔ اکیڈمی سے دیئے جانے والے اس صندوق پر ابھی بھی لیفٹیننٹ جلال خان، دیرہ دون اکیڈمی لکھا ہوا نمایاں تھا۔ اس سے افسر کا بے حد جذباتی لگاؤ ہونے کی وجہ سے گھر کے تمام سامان پر یہ صندوق بھاری اور اہم ہوتا تھا۔ آج بھی یہ صندوق اُس کے ہمراہ تھا اور اُس کے تمام یونیفارم اسی میں محفوظ تھے۔ دنیا بدلی، وقت نے کروٹ لی مگر یہ صندوق نہ بدلا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



خوش بخت پہلی دفعہ شوہر کے تبادلے پر یہاں آئی تھی۔ اُس کے رعب داب اور شان وشوکت کو وہ پہلے سے ہی دیکھ چکی تھی۔ مگر آج کا ٹھکا اُس کے نئے رینک کی گواہی دینے کو کافی تھا۔

بے شمار سیلوٹوں کے ہمراہ اُن کو میس لے جایا گیا۔ دو کمروں کا صاف ستھرا چھوٹا سا سویٹ بے حد سلیقے اور قرینے سے سجا ہوا تھا۔ یہاں ان کا قیام دو ماہ کا تھا۔ کیونکہ بنگلہ وائٹ واش ہو رہا تھا۔ صوفوں کی پوشش، فرنیچر کی پالش جاری تھی۔ پرانے پردوں کی جگہ نئے پردے تیار ہو رہے تھے۔ لان میں موسمی پھولوں کی پنیریاں لگ رہی تھیں۔ خوش بخت روزانہ صبح تھوڑی دیر کے لئے گھر کا چکر لگاتی اور ہر کمرے کو سجانے کے منصوبے بناتی واپس آجاتی۔ میس کے عارضی قیام کا بھی اپنا ہی مزا اور راحت ہے۔ نہ دال گوشت کی فکر نہ خریداری کی ضرورت، نہ کھانا پکانے کا جھنجٹ نہ گھر چلانے اور مہمان داری کی ذمہ داری۔ ہر کام وقت سے پہلے تیار اور حکم سے پہلے حاضر۔ بیگمات کی ذہنی اور جسمانی آزادی کا یہ وقت کبھی بھلایا نہیں جاتا۔ جیسے میکہ گھر، اس کی آسائشیں اور بے نیازی اور لاپروائی سے گزرے ہوئے لمحات یادگار بن جاتے ہیں۔ میس میں ٹھہرنے کا احساس ایسا ہی ہوتا ہے۔ خوش بخت کو یہ نیا تجربہ خاصا دلچسپ لگا تھا۔ شیر خان اور دلیر خان کا سکول میں داخلہ ہو جانے کی وجہ سے وہ بھی اس جگہ سے محظوظ ہونے لگے تھے۔ نئے دوست نیا ماحول اور نئے استادوں کی خال الخاص توجہ کافی تسلی بخش تھی۔

یہاں پھر سے ضیافتوں کا دور شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے انہیں سی۔ او نے اپنے گھر دعوت پر مدعو کیا۔ اور یوں دو مہینے کا عرصہ پلک جھپکتے بیت گیا۔ خوش بخت نے حویلی کے ہر فرد کو خط لکھ کر اپنے سفر کا حال، میس میں رہائش کا مزا اور رضا کی نت نئی شرارتیں اور باتیں بیان کی تھیں۔ جلال خان کی نوکری اور اس کی شان میں کیا کیا قصیدے نہ لکھ ڈالے۔ نئے گھر کی تمام تفصیل ایسے لکھی گئی کہ ہر ایک نے خط کو اَن گنت دفعہ پڑھا اور خوب داد دی۔ اڑوس پڑوس سب اس کا حال دریافت کرتے رہتے اور اس کے لئے بے شمار دعائیں اور نظر اُتارنے کے ٹوٹکے استعمال کئے جاتے۔ اپنے شوہر کے گھر میں بیٹی کی خوشی اور آبادی والدین کو جدائی کے جان لیوا صدمے سے کوسوں دُور رکھتی ہے۔ بس مژدۂ راحت افروز خبروں کے انتظار میں ان کے کان دروازے پر ڈاکیے کی صدا پر لگے



رہتے ہیں۔

شیر خان بچپن سے ہی شرارتی اور من موجی بچہ تھا۔ لان کے عقبی احاطے میں ایک پرانے برگد کے درخت پر لوہے کی زنجیر کا بے حد مضبوط جھولا لٹک رہا تھا۔ وہ اس پر بیٹھا، جھولتا ہوا بچوں کے رسالے کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک روح کی کہانی کے بارے میں سوچنے لگا۔ تھوڑی کوشش کے بعد کہانی اپنا روپ سامنے لے کر آ چکی تھی۔ دلیر خان کو بے حد سنجیدگی سے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''تمہیں علم ہے یہ بنگلہ کس کا تھا؟''

''ہاں جانتا ہوں۔ کسی فرنگی فوجی نے تعمیر کرایا تھا۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔

''کیا تم اُس کی بیوی کا نام جانتے ہو؟'' وہ کتاب کو بند کرتے ہوئے بولا۔

''ارے مجھے اس کے نام سے کیا غرض؟ یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ اس بنگلے میں دس سال بڑی عیش وعشرت سے قیام پذیر رہے تھے۔ پاکستان بننے سے کچھ عرصہ پہلے وہ لندن چلے گئے تھے۔'' اُس نے بھی کتاب بند کر دی۔

''تمہیں علم ہے کہ مسز ایلفرٹ کو یہ گھر کتنا پسند تھا؟'' شیر خان آہستہ آہستہ اُسے اپنی گھڑی ہوئی کہانی کی طرف لا رہا تھا۔

''ان فضول باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔'' وہ اُلجھ کر بولا۔

''تو سنو! میں تمہاری معلومات میں اضافہ کئے دیتا ہوں۔ مسز ایلفرٹ کو اس گھر سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ یہ گھر چھوڑ کر لندن جانے کے لئے کسی صورت میں تیار نہیں ہو رہی تھی۔ شوہر نے، بچوں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ نہ مانی۔ نتیجہ کیا نکلا؟ بتاؤ بدھو کہیں کے، تم کچھ نہیں جانتے؟'' وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

''ارے مجھے یہ سب کچھ جاننے کی کوئی حاجت نہیں ہو رہی۔ کل میرا ٹیسٹ ہے۔ مجھے تنگ نہ کرو۔'' وہ کمرے میں جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ شیر خان نے اسے دونوں بانہوں میں جکڑ لیا۔

''میرا بھی تو ٹیسٹ ہے یار! سچی، کہانی سن لو۔ پھر دونوں پڑھنے بیٹھ جائیں گے۔''

''چند لفظوں میں سناؤ۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔'' وہ اُس کی باتوں سے تائب ہو گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"اچھا تو سنو دلیرو! آخر مسز ایلفرٹ بیمار ہو کر بستر سے لگ گئی۔ اور آخر ایک دن اُس نے گلے میں پھندا ڈال کر پنکھے سے لٹک کر خودکشی کر لی۔ اس لئے وہ آج بھی اسی جھولے پر خوشی خوشی جھولا جھول رہی ہوتی ہے۔ میری ان گناہگار نگاہوں نے کئی بار یہ سین دیکھا ہے۔" وہ لہجے میں تاسف لاتے ہوئے بولا۔

"سچ؟" دلیر خان حیرت و اشتیاق سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ ہوش وخرد کی دنیا سے باہر آچکا تھا۔

"بالکل سو فیصدی سچ۔" شیر خان نے خود اعتمادی سے کہا تو دلیر خان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"ڈرومت۔ جس کمرے میں اُس نے خودکشی کی تھی، وہ دیدی ماں کا کمرہ ہے۔" اس نے بات کو آگے بڑھایا۔

"دیدی ماں کو بتانا ہمارا فرض بنتا ہے شیرو! وہ کہیں اُنہیں جانی نقصان نہ پہنچا دے۔ مجھے تو رضا کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ کہیں اُسے کچھ نہ ہو جائے۔ اللہ نہ کرے۔" دلیر نے سر جھٹک کر تشویش کا اظہار کیا۔

"بچو! کیا ہو رہا ہے؟" خوش بخت، رضا کو اُنگلی سے پکڑے چلتی ہوئی قریب آ گئی۔

دلیر خان نے سانس روکے تمام کہانی گوش گزار دی۔ خوش بخت نے شیر خان کو تفتیشی نظروں سے دیکھا۔

"دیدی ماں! مجھے تو وہ ابھی بھی جھولے پر نظر آ رہی ہے۔ وہ دیکھیں، کالی سکرٹ پر لال پھولدار بلاؤز پہنے پرستان کی شہزادی لگ رہی ہے۔" لہجے میں پذیرائی نمایاں تھی۔

"ہمیں تو خالی جھولا نظر آ رہا ہے شیرو!" دیدی ماں نے حیرت سے کہا۔ "تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"ہاں دیدی ماں! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ رات کو ضرور آپ کے کمرے میں سونے آتی ہوگی۔ آج آپ ذرا ہوش کی نیند لیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی سامنے آ جائے گا۔ پھر اس کا دفیعہ کرنے کا سوچیں گے۔"

"سونے نہیں، تمہارے آغا جان سے ملنے آتی ہوگی۔" وہ قہقہہ لگا کر اُٹھی۔ خوف اعصاب پر چھا چکا تھا۔



"شیر خان! آج میں اسے تمہارے کمرے میں بھیج دوں گی۔ ٹھیک ہے نا؟" وہ ہمت بحال کرتے ہوئے بولی۔

"میں اس کمرے میں نہیں سوؤں گا دیدی ماں! مجھے میس کے کمرے میں بھیج دیں۔" دلیر خان ڈر کے مارے کانپنے لگا تو شیر خان ڈرپوک کا نعرہ لگا کر اُسے چھیڑنے لگا۔ اور خوش بخت کی جان میں بھی جان آئی۔ اُس نے شیر خان کو کان سے پکڑ لیا۔

"مجھے تمہاری شرارت کا اندازہ تو ہو گیا تھا۔ مگر تمہاری اداکاری کو داد دیتی ہوں۔ اندر سے میں بھی ہل گئی تھی۔" تینوں کے قہقہے فضا میں گونج اُٹھے۔

اس کہانی نے ایسی شہرت پکڑی کہ گھر گھر اس کا ذکر ہونے لگا۔ بچے شیر خان کے ہمراہ مسز ایلفرٹ کو دیکھنے پہنچ جاتے۔ مگر بدقسمتی سے ہر دفعہ بچے ناکام ہی لوٹتے۔ مسز ایلفرٹ صرف شیر خان کو ہی نظر آتی رہی۔ جلال خان نے بھی اس شرارت کو خوب سراہا اور یوں کہانی کی طوالت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا گیا۔

❖❖○❖❖

www.iqbalkalmati.blogspot.com



شیر خان اور دلیر خان کی غیر موجودگی کی وجہ سے درپیش آنے والے مسائل قدرے کم ہو چکے تھے۔ گرد و پیش کی نواحی بستیوں کے اختلافات بتدریج چل رہے تھے۔ کلثوم بچوں کی جدائی میں جہاں آزردہ تھی، وہاں اُن کی جان کی سلامتی اور تعلیم کے رجحان پر مطمئن اور پُرسکون بھی تھی۔

آج ڈیڑھ سال بعد وہ باپ کے ہمراہ ماں سے ملنے گاؤں آئے تھے۔ پہلی دفعہ اُنہیں اپنا گاؤں، اس کی کچی گلیاں، جگہ جگہ گندے پانی کے چھپڑ بہت ناگوار گزرے۔ وہاں کے لوگ، اُن کی حرکات وسکنات بہت نازیبا لگیں۔ ماں کی باتوں میں ناشائستگی اور کھردرے پن نے اُنہیں چونکا دیا تھا۔ پہلے تو یہاں کا سب کچھ بہت اعلیٰ معلوم ہوتا تھا۔ آج سب سوچوں کا دھارا بدل چکا تھا۔ وہ تمام وقت اپنی ماں کے دائیں بائیں بیٹھے اپنی نئی زندگی کے بارے میں بتاتے رہے اور وہ پتھر بنی سنتی رہی۔ بیٹوں کا لب ولہجہ، اُٹھنا بیٹھنا، پہننا، اوڑھنا اور خیالات بالکل باپ کی غمازی کر رہے تھے۔ اُس شوہر کی، جسے یہ پاگل تصور کر کے اُس کی ہر بات کو رد کر دیا کرتی تھی۔ آج بچے ماں کو بدلنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ ان معصوم اور ناسمجھ بچوں کو کیا علم کہ ان کا ذہن تو کورے کاغذ کے مانند تھا، جس پر جیسا چاہا لکھ دیا۔ پکے ذہن کی ان پڑھ ماں جس نے زندگی کے تلخ وترش تجربات میں بھی کچھ نہ سیکھا۔ اس کے ذہن کا کوئی ورق خالی نہ تھا۔ اس پر بیتے سالوں کی مسافت کی ٹیڑھی میڑھی، آڑی ترچھی لکیروں کا راج تھا۔ ایک سیدھی لکیر لگانے کی گنجائش یا ایک شستہ لفظ لکھنے کی جگہ نہ تھی۔

وہ گھریلو سازشوں اور پراپیگنڈوں میں رہ کر وقتِ عصر کو عبور کرنے والی تھی۔ اس



گڑھ سے رہائی اور لاتعلقی ناممکن تھی۔ اس کے لئے ان نظریات کا پرچار، ہم خیال ہونا اور سنگ چلنا اپنی ہار کا اعتراف تھا۔ ہوائیں رُخ بدلتی ہیں، موسموں میں تبدیلی رونما ہوتی ہے، شخصی محاذ پر فطری طور پر فتح یابی کا فقدان ہی رہا ہے۔

بچوں کی زبانی خوش بخت کی تعریفیں اُس کے کانوں میں زہر اُنڈیلتی ہر دم اُسے بےکل اور بےچین کر رہی تھیں۔ دُعاؤں کے سائے میں اُس نے بچوں کو الوداع تو کر دیا مگر ایسے طویل مراقبے میں چلی گئی کہ اُس کے ہر انداز میں کٹھور پن اور اجنبی پن نے سب کو ہراساں کر دیا۔ آغا جی نے پیر صاحب کو گھر بلا کر دعا درود بھی کروا ڈالا۔ مگر کلثوم کی خاموشی نہ ٹوٹ پائی۔ تقدیر کے ورق پر لکھا ہوا ناکامی اور شکستگی کا لفظ اُس کے اعصاب کے تناؤ اور توڑ پھوڑ میں لحہ بہ لحہ اضافہ کرتا چلا گیا۔ خود ساختہ پریشانیوں کا ردِعمل بدمزگی، شورش اور بغاوت کے بعد ایک اور ہی سمت چل پڑا تھا۔ خاندان کے لئے یہ نوید مسرت نہ تھی، فکرمندی کا مقام تھا۔ مزاروں پر چڑھاوے چڑھانا، دم درود کی محفلیں سجانا، صدقہ وخیرات بانٹنا، دیسی جڑی بوٹیوں سے کشتے اور کاڑھے بنانا اور طرہ یہ کہ مرشد کا آنا جانا زندگی کا معمول بن گیا۔

سب کلثوم کی نااُمیدی اور مایوسی میں وقتی افاقہ کو ہی غنیمت سمجھ کر اظہارِ تشکر سے باری تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے۔ مگر جب جلال خان کی والدہ محترمہ فالج کے حملے سے دوچار ہوئیں تو جلال خان کے لئے خاموش رہنا بہت صبر آزما کام تھا۔ اُس نے خوش بخت سے مشورہ کئے بغیر ہی دفتر سے چھٹی لی اور گھر پہنچ گیا۔

''خوش بخت! کہاں ہو؟'' لہجے کی تیزی اور بےچینی سے وہ پریشان ہو کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

''جی خان صاحب! خیریت تو ہے؟ آپ پریشان لگ رہے ہیں۔'' وہ ایک دم گھبرا گئی۔

''خیریت ہی تو نہیں۔ تم بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ بی بی جان کو لا کر ہسپتال داخل کروانا پڑے گا۔ اُن کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی ہے۔ اگر وہ اسی ناراضگی کی حالت میں عالمِ فانی سے کُوچ کر گئیں تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' جلال خان کا مدعا سمجھ کر اس کے وجود میں پھریری دوڑ گئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"ممکن ہے تمہاری خدمت گزاری اور میری فرماں برداری اُن کی دلی کدورتوں کو دُور کر دے۔ خوشی اُن کی خفگی اور بے تعلقی نے میرا چین وسکون برباد کر دیا ہے۔ میری بخشش والدین کی رضا اور آشیر باد میں پنہاں ہے۔ اور تمہارے رضا خان کی اس قبیلے میں قبولیت اور مقام تمہارے صبر وتحمل کا مرہونِ منت ہے۔"

خوش بخت نے معصومیت سے سر ہلا کر اعتراف کیا۔ مگر بے ساختہ دل اور ذہن میں تلاطم برپا ہو گیا۔ اُس کی ازدواجی زندگی پھر سے ایک نئے آزمائشی موڑ کی طرف گامزن ہونے کو تیار کھڑی تھی۔

"ہوسکتا ہے رضا کی وساطت سے وہاں تک تمہاری رسائی ہو پائے۔" خوش بخت نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔ اُس کے من کا دیوتا حقیقت پسندی پر مبنی باتیں کر رہا تھا۔ وہ انکار کیسے کرتی؟ وہ شوہر کے آخری اور حتمی فیصلے پر اُٹھی اور جانے میں عافیت سمجھ کر تیار ہونے لگی۔ یہاں آتے ہوئے اماں گُل کی نصیحتیں اُسے یاد آنے لگیں کہ بیٹا اپنا دل بڑا اور منطق چھوٹی کر لینا۔ کیونکہ مرد کبھی بھی اپنا قبیلہ، اپنا آبائی ٹھکانہ، اپنا خونی رشتہ، اپنے نام وشناخت کو ہمیشہ کے لئے خیرباد نہیں کہتا۔ وعدوں کی یاد دہانی اور منطق اس جذبے کے سامنے بالکل ہیچ ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہمارے خاندان کی عظمت کی لاج تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اپنے روّیے سے ان کے دل جیت لینے میں تمہاری کامیابی ہے۔"

"خوش بخت! آج پھر سرتاپا ہار میں تمہاری جیت ہے۔" وہ خود سے ہم کلام ہوئی۔

رضا خان کو آیا تیار کر کے اندر آ گئی اور سعادت سے بولی۔

"میڈم! میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"آپ میرے ساتھ ہی چلیں گی۔ رضا خان کو وہاں آپ کی ضرورت پڑے گی۔" وہ بے ساختہ بول اُٹھی۔

رضا خان اپنے ددھیال، خوش بخت اپنے سسرال پہلی دفعہ جا رہی تھی۔ خوفزدگی اور شرمندگی نے اُس کے چہرے کا رنگ فق کر دیا تھا۔ انجان اور غیر شناسا لوگوں سے سامنا کرنا اس کے مفادات میں ہرگز نہیں جاتا تھا۔ ان کے ردِعمل کا بھی اسے بخوبی اندازہ تھا۔ مگر جلال خان کی پریشانی اور پیدا ہونے والی بدمزگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ بجھے دل کے ساتھ پوری طرح تیار ہو چکی تھی۔ سعادت مندی سے دُکھ کو اپنے اندر سموتے ہوئے



تیاری میں مصروف ہو گئی۔ جلال خان اُس کی پریشانی کے لبریز پیمانے کو اپنی عقابی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اُسے بازوؤں کے حصار میں مقید کر کے اُسے دھیما کرنے کی کوشش کی۔

"خوشی! مجھے تمہاری اور تمہارے خاندان کی ذاتیات پر حملہ آوری کا اندیشہ تو ہے۔" وہ فہمائشی انداز میں اُس کی سوچ اُگلوانا چاہتا تھا، مگر خاموشی کا دورانیہ بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کس ٹھوس جواز کو پیش کر کے ماں کے مقدس رشتے کو ٹھکرا دیتی جبکہ وہ راہِ راست پر تھا۔

"میری زندگی میں بچے اور ماں کے علاوہ کوئی اور اہم نہیں ہوسکتا۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"میں بھی نہیں؟" وہ تنبیہی لہجے میں اُس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم تو میری زندگی ہو جانم! باقی تو سب بکھیڑے ہیں۔" مدح سرائی پر وہ مروّتاً مسکرا دی۔

اُن کی گاڑی ایمبولینس کے ہمراہ اُس کے آبائی گاؤں میں داخل ہوئی تو گاؤں کے چھوٹے بچے شرارتیں کرتے، شور مچاتے اُن کے ساتھ ہو لئے اور انہیں گھر تک چھوڑ کر گیٹ بند ہونے پر واپس پلٹ گئے۔ جلال خان نے خوش بخت کو وہاں کا تمام حدود اربعہ، بچپن کی معصوم شرارتیں، لڑکپن کے بے ضرر قصے اور نوخیز جوانی کی یادگار اور نرالی تمنائیں، سب گوش گزار کر دیں۔ اُسے اس گاؤں کے ذرّے ذرّے سے عشق تھا۔ وہ اس گاؤں کے ہر باسی کا مقدر بدل دینے کا خواہش مند تھا۔ وہاں کی معاشی کمزوریاں اور غلامی کے نظام کے بارے میں اُسے معلومات فراہم کر رہا تھا اور وہ لامحالہ اپنی انسانی جبلت کو ضابطے اور وضع میں رکھتے ہوئے ہمہ تن گوش تھی۔

گھر میں قدم رکھتے ہی ہر کونے سے تمام مکین نکل کر وسیع وعریض صحن میں جمع ہو گئے۔ خوش بخت کو دیکھ کر عورتوں کی چادریں سر سے سرک کر ماتھے تک اور گردن سے اُٹھ کر ناک تک پہنچ گئیں اور چار سُو کھسر پھسر ہونے لگی۔ کلثوم پہلے سے ہی درخت کے سائے میں چھپر کھٹ پر آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ صحن کی ہلچل پر وہ چونک کر اُٹھی اور ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے اُس کی نظروں نے جو دیکھا، ناقابلِ برداشت تھا۔ جلال خان، خوش بخت کا ہاتھ تھامے ماں کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ رضا خان، آیا کے ساتھ اُن

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کے پیچھے تھا۔

''پہلا حملہ میرے خاوند پر تھا، دوسری دفعہ میرے بچے میری آغوش سے جدا ہو گئے۔اب میرے گھر پر قبضہ کرنے پہنچ گئی ہے چڑیل کہیں کی۔'' وہ بڑبڑائی اور تیزی سے اُٹھ کر اُن کے پیچھے ساس کے کمرے میں چلی گئی اور کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔

''جلال خان! ہماری بے بسی اور لاچارگی کا تماشا دیکھنے آئے ہو؟ اس فاحشہ کے سامنے مزید ذلیل مت کرو۔''

جلال خان نے شعلہ بار نظروں سے اُسے دیکھا اور آغا جی سے مخاطب ہوا۔

''ہم بی بی جان کو لینے آئے ہیں۔اگر آپ کی اجازت ہو تو۔'' وہ مؤدبانہ انداز میں بولا۔

''اب تو اس کی طبیعت کافی سنبھل گئی ہے۔اللہ نے نئی زندگی بخش کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔فالج میں کبوتر کی یخنی بہت کارآمد ہوتی ہے۔بہار خان نے سینکڑوں کبوتر خرید کر ڈربوں میں ڈال دیئے ہیں۔انڈوں کے تیل کی مالش دن رات جاری ہے۔اسی سے افاقہ ہوا ہے۔'' والد صاحب بادلِ نخواستہ انداز میں بولے۔

''میں اس کل کی چھوکری پر بھروسہ نہیں کر سکتی۔اس کا تمہاری ماں سے کوئی خونی رشتہ نہیں۔یہ لڑکی کیا جانے کہ بزرگوں کو کیسے سنبھالا جاتا ہے۔مار ڈالے گی ان کو۔'' کلثوم کے لہجے میں بد دماغی کا اثر نمایاں تھا۔

''پتری! تم یہاں سے جاؤ۔تمہاری اپنی طبیعت درست نہیں۔جاؤ، جا کر آرام کرو۔'' سسر کے لہجے میں ملائمت تھی۔

کلثوم نے ایک لمبی 'ہوں' کے ساتھ سر جھٹکا اور باہر نکل گئی۔

خوش بخت کو سسر نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور رضا کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔

''دادی جان کو پوتا لینے آیا ہے۔اسے خالی ہاتھ کیسے بھیجا جائے؟''

''بہت بہت شکریہ آغا جی! بی بی جان جونہی صحت یاب ہوئیں، ہم واپس چھوڑ جائیں گے۔'' اظہارِ تشکر سے اُس کا لہجہ لرزش زدہ تھا۔

''تمہاری بی بی ہے۔میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ لیکن قدم تندرستی کی طرف تو اُٹھ چکے



ہیں۔'' والد نے پھر سے تسلی وتشفی دی۔

''بہترین ہسپتال کی سہولیات اور تجربہ کار ڈاکٹروں کی موجودگی میں ماں کو گھر پر رکھ کر پرانے دیسی ٹوٹکوں اور دم درود سے علاج معالجہ کرانا سراسر زیادتی ہے آغا جی! آپ ہمیں دعا دے کر رخصت کریں۔ہسپتال میں ڈاکٹر انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ ماں کو نیم غنودگی میں دیکھ کر بولا۔

''ٹھیک ہے۔بڑی دیدی کو ہمراہ لے لو۔بہو کے لئے چھوٹے بچے کے ساتھ ذرا مشکل ہو جائے گی۔'' وہ خاموش بیٹھی خوش بخت کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''جیسے آپ کی مرضی۔'' جلال خان نے اثبات میں سر ہلایا۔اور پھر ماں کو لے جانے کی تیاری شروع ہو گئی۔کلثوم اپنے کمرے میں مقید ہو کر اپنی تقدیر کو کوسنے لگی۔خوش بخت، سسر کے روّیے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔جبکہ باقی تمام خواتین اور مرد حضرات اپنی نفرت وہتک آمیز روّیے کو چھپانے میں ناکام رہے تھے۔

گاؤں کے لوگوں کے لئے بیمار پُرسی تفریح کا ایک بہانہ بن جاتی ہے۔خاص کر مریض اگر ہسپتال پہنچ گیا ہو تو فکرمندی کے اظہار کا نقشہ اور طریقہ ہی بدل جاتا ہے۔ گاؤں سے اظہارِ ہمدردی کرنے والوں کا تانتا بندھ چکا تھا۔محدود سوچ کے پیشِ نظر مریض کی کوفت اور تکلیف کو بالائے طاق رکھے اس اوّلین فرض کی ادائیگی جاری تھی۔ ہسپتال کا عملہ بھی مشکلات کا سامنا کر رہا تھا۔

جونہی ماں کی طبیعت سنبھلی، جلال خان اُنہیں گھر لے آیا۔بڑی نند کی موجودگی میں خوش بخت اُن کی خدمت میں شب و روز ایک پاؤں پر کھڑی تھی۔شرفِ میزبانی کی استدعا کا ہر لمحہ ہوش و خرد کے ساتھ گزارنے والی خوش بخت کے اس ادراک کی غمازی کر رہا تھا، جو اُسے اپنی ماں کی آغوش اور اماں گل کی قیادت نے سونپا تھا۔اُس کے روّیے میں نہ عجلت اور نہ ہی کسی ناگواری کا شائبہ تھا۔ماں اوائل دنوں میں خوش بخت کو دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر کر اپنی خفگی اور نفرت کا اظہار کرتی تھی، لیکن یہ سلسلہ ناپائیدار ثابت ہوا۔ساس اور نند اُس کی پذیرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ہر آنے والے کے سامنے ملانے لگیں۔اس کی سلیقہ شعاری، دانش مندی اور دُور اندیشی کے چرچے سسرال میں محوِ گردش ہو چکے تھے۔جلال خان اس کی وضع داری، اخلاقیات اور رکھ رکھاؤ سے واقف تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com



تھا مگر اُسے خاندان والوں کی جانب سے بھلے روّیے کی توقع ہرگز نہ تھی۔

عورت عمر کے کس حصے تک شوہر کے ساتھ رہنے کے قرض ادا کرتی رہتی ہے؟ اور کب تک وہ اپنا حق سمجھ کر یہ قرضے وصول کرتا رہتا ہے، آخر کیوں؟ اس لئے کہ وہ اُس کے نان نفقہ کا ذمہ دار ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ جبکہ وہ اُس کی ملکیت اور جائیداد کی حیثیت کے لحاظ سے سب سے کم قیمت قرار دیتے ہوئے بے توجہی کی فہرست میں لکھ دی جاتی ہے۔

اُس نے اپنی زہریلی سوچ کو ذہن سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی۔ پُروائی کے ہلکے سے جھونکوں سے اُس نے جھرجھری لی اور برآمدے میں کھڑی سرخ کونڈیوں سے لٹکتی ہوئی ننھی منی بیلوں میں سے سوکھے پتے چننے لگی۔ برآمدے کے سفید ستونوں کے ساتھ پام اور سدابہار کے پودے ہوا میں جھوم کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ پورچ سے پار وسیع وعریض لان میں سورج کی نکھری اُجلی کرنیں، شبنم کے قطروں کو ضوفشانی بخش کر ماحول کے حُسن میں اضافہ کر رہی تھیں۔ لان کے چاروں طرف کیاریوں میں گلاب کے پھول اپنے جوبن پر تھے۔ موتیے کے پودوں کے جھنڈ میں سفید کلیاں، مسکان کو تیار کھڑی تھیں۔

کبھی کبھار بدلتے ہوئے موسم کے تیور دلوں پر اُداسی کی مُہر ثبت کر جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی جذبات واحساسات کو من میں دبائے وہ باہر نکل آئی تھی۔ ابھی تک گھر کے تمام افراد گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ بیٹ مین کے کوارٹر کا بلب بجھ چکا تھا۔ اُس کی ڈیوٹی بھی بہت جلد شروع ہو جایا کرتی تھی۔ مگر خوش بخت کی ڈیوٹی اس سے بھی سخت تھی۔ اُس کا ساس کو نماز کے لئے وضو کرا کر دودھ، اُبلے ہوئے انڈے کے ساتھ کُٹی ہوئی ادرک کو مکھن میں تڑک کر پیش کرنا روز کا معمول تھا۔ آج اُس پر بدلتے موسم کی الکس طاری تھی۔ وہ اپنی نیند کو چھوڑ کر بستر سے جدا ہونے میں کوفت محسوس کر رہی تھی۔ وہ مرتی کیا نہ کرتی کے مقولے کو مدِنظر رکھ کر بے بسی کا دامن تھامے بستر پر لیٹنے کے بجائے دل کو بہلانے تازہ ہوا میں نکل آئی تھی۔ سوچوں میں باغیانہ پن بھی تھا، جو کبھی کبھار سر اُٹھاتا رہتا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ اُس کا سر کچل کر زندگی کی نئی گرہ سلجھانے کے لئے تیار ہو جاتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی شخصیت کو دوغلے پن سے محفوظ رکھ کر ہی خود کو پُرسکون رکھ سکتی تھی۔ بے شک حسبِ حال کئی بار وہ خود سے اُلجھی تھی، اپنی نرم مزاجی کو کوسا تھا اور اپنے



ازدواجی رشتے کے بسیط قفس کو لعنت ملامت بھی کیا تھا، مگر فطرتاً وہ ایسی سوچوں کو اپنی ذات پر حاوی ہونے سے پہلے ہی راہِ راست پر آ جاتی تھی۔ وہ مزاج کی تلخی و ترشی کے ساتھ باہر نکلی تھی۔ مگر جلد ہی ضمیر کی بیداری اور بدلتے ہوئے خوب صورت موسم اور مسکراتے پھولوں نے اُس کی بکھری ہوئی شخصیت کو یکجا کیا اور اُس نے دلفریب انگڑائی لے کر اپنی سستی و کاہلی کو معطر اور راحت بخش خنکی کے سپرد کر دیا اور وہ چپل اُتار کر ننگے پاؤں گیلی اور ٹھنڈی مخملیں گھاس پر چہل قدمی کرنے لگی۔ ہلکی سی ٹھنڈ سے اُس کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ اُس نے اپنے نائٹ گاؤن کی بیلٹ کو کس لیا اور ساس کے لئے موتیے کی بند کلیاں توڑنے لگی۔ وہ یہ سوچ کر مسکرا دی کہ جب وہ گلاب کے پھولوں کی پتیاں اور موتیے کی کلیاں چاندی کی طشتری میں ڈال کر اپنی ساس ماں کو پیش کرے گی تو وہ اس کے عوض اپنی تمام تر لطافت اور تقدس کے ہمراہ اس کی جھولی کو اَن گنت دعاؤں سے بھر دے گی۔ اپنے خشک ہونٹوں سے اُس کے ماتھے پر بوسہ دے گی۔ اپنے کھردرے اور سخت ہاتھ اُس کی پیشانی پر پھیر کر جلال خان کی خوش قسمتی کا اقرار کرے گی تو اُسے کس قدر تقویت پہنچے گی۔ جہاں مشکلات اور مسائل کا توڑ نیلی چھت والے کے پاس موجود ہے، وہاں اُس نے انسان کو اپنی ذات کی اصلاح اور تصحیح کے اختیارات بھی بخش رکھے ہیں۔ خوش بخت اپنی زندگی کے سفر پر رواں دواں اسی قانون کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے گھر کے ماحول میں مسرتوں اور کامرانیوں کے دیے جلاتی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر وہ بھی تھی تو انسان۔ اس کے وجود میں بھی خون کی حرارت وحدت اور جھرنوں کی ٹھنڈک و راحت گردش کرتی تھی۔ سوچ میں مدوجزر قدرتی امر تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُسے جن اختیارات سے نوازا تھا، وہ انہیں نظرانداز کر کے اپنی اور اپنے ساتھ وابستہ بے شمار زندگیوں کو داؤ پر لگانے کی سزاوار ہرگز نہ تھی۔

بات تو سچ تھی کہ ایک عورت کی ناخوشی اور ناکامی ایک نسل اور ایک معاشرے کی تباہی و بربادی کو جنم دیتی ہے۔ وہ ہر بار صفائے دل و جان اور عفو و درگزر کے فارمولے پر عمل پیرا ہو کر عورت کی معراج اور شان کی گواہی بن کر زندگی میں قوسِ قزح کے رنگ بھر کر اُسے تختِ بخت پر بٹھا دیتی۔

موتیے کے پھول توڑتے ہوئے وہ ہارن کی آواز پر چونک اُٹھی۔ چوکیدار پوچھ گچھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے بعد بڑا گیٹ کھول رہا تھا۔ کار کے پورچ تک پہنچتے، اُس نے کار میں بیٹھی خاتون کو بغور دیکھا۔ کلثوم شٹل کاک برقعے میں پچھلی سیٹ پر براجمان تھی۔ تیزی سے دو خواصیں گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اُتریں اور اس کی جانب کا دروازہ کھول کر اُس کا ہاتھ پکڑا، احتراماً آنکھوں سے لگایا اور وہ برقعہ سنبھالتی ہوئی باہر نکلی۔ برآمدہ پار کر کے دروازے کی گھنٹی بجائے بغیر وہ اندر داخل ہو چکی تھی، جہاں اُس کا شوہر اور دو بچے رہائش پذیر تھے۔ یہاں اُس کے حقوق، خوش بخت سے کم ہرگز نہ تھے۔ اُسے اس گھر میں جانے کے لئے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ہکا بکا دیکھتی رہ گئی۔ خواصین برآمدے میں حکم کے انتظار میں کھڑی ہو گئیں۔

"یہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟" وہ جزبز ہو کر بڑبڑائی۔ اُسے ایسے لگا جیسے اُس کے منوں بھاری قدم ایسی دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں، جہاں کی کوئی حد نہیں۔ وہ بمشکل چلتی ہوئی برآمدے تک پہنچی اور آرام دہ کرسی پر دھڑام سے گر گئی۔

جلال خان اُسے ڈھونڈتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ خوش بخت کو کرسی پر بے سدھ دیکھ کر گھبراہٹ کے مارے چیخ اُٹھا۔

اُس کے آس پاس گھر کے تمام افراد جمع ہو چکے تھے۔ کلثوم ابھی تک ساس کے گلے لگی آہ و بکا کر رہی تھی۔ نند، خوش بخت کی ہتھیلیوں پر مساج کرتے ہوئے سورۃ کوثر پڑھ کر دم کر رہی تھی۔ شیر خان ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اُسے بے چینی سے آوازیں دینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد خوش بخت نے سر ہلایا اور آنکھیں کھول دیں۔ جلال خان نے اُسے بانہوں میں بھرا اور سیدھا اپنے کمرے میں لے آیا۔ رضا خان اس افراتفری کے عالم میں جاگ کر اُونچی آواز میں رونے لگا۔ پل بھر میں گھر کی فضا بدل گئی تھی۔ جلال خان اور خوش بخت تیار ہو کر ہسپتال روانہ ہو گئے۔ دونوں بھائی، رضا خان کو بہلانے لگے۔ کلثوم یہ دیکھ کر جل کر بولی۔

"میں نے تم دونوں کو یہاں پڑھنے لکھنے بھیجا تھا نہ کہ اس کتیا کی اولاد کو کھلانے اور سنبھالنے کے لئے چھوڑا تھا۔"

"کلثوم! ہوش کے ناخن لو۔ اس گھر کی چاردیواری میں ایسی زبان اور ایسے



پراپیگنڈوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ خوش بخت بہت اصیل بچی ہے۔ اُس کے سامنے خود کو پستیوں میں گرا کر اپنے خاندان کا منہ کالا کرنے سے پہلے پل بھر کو سوچ لینا۔ ورنہ جلال خان تمہیں فوراً واپس بھجوا دے گا۔" نند کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ آپ بھی اس جادوگرنی کے حربوں میں آ گئی ہوں گی۔ اس کے پاس ایسی کون سی گیدڑ سنگھی ہے کہ جو اس کے قریب لگا، اسی کے گن گانے لگا۔" وہ تلخی سے بولی۔

"کاش! تم سمجھ سکتی۔ کاش! تم عورت کے حقیقی مقام کو پہچان جاتی۔ کاش! تم یوں برباد نہ ہوتی۔" ساس نے اپنی فالج زدہ زبان سے بہ مشکل الفاظ ادا کرنے کی کوشش کی۔

"خالہ بی بی! اس کاش کی گردان کو طول مت دیں۔ آپ کا پوتڑوں کا بگڑا ہوا لاڈلا میری بربادی کا ذمہ دار ہے جس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو میں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ روزِ قیامت اس کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹوں گی۔ اور اللہ تعالیٰ سے سوال کروں گی کہ میرے لئے اس مرد کا انتخاب کیا تھا؟ چلی ہیں مجھے نصیحت کرنے۔ یہ جھوٹی ہمدردیاں اپنے پاس رکھیں۔ مجھے ان کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میں یہاں آئی ہوں بیمار پُرسی کو۔ رہنے نہیں آئی۔" وہ زہرخند سے بولی۔ ساس کے چہرے پر پژمردگی چھا گئی۔

"ایسے طعنے بی بی جان کو بیمار کر دیں گے کلثوم! خدا کے لئے خاموش رہو۔" نند قہر آلود لہجے میں بولی۔ غصہ کلثوم کے اعصاب پر غالب آ چکا تھا۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ چلائی۔

"آج میں اُس کم بخت کو آپ کے اور آپ کے بہروپیے بھائی کے اصلی رنگ دکھا کر ہی جاؤں گی۔ میری خاموشی اور صبر کا تم لوگوں نے یہ صلہ دیا ہے۔ آخر آپ ٹھہرے جو سسرال۔ بے مروّت اور بے فیض۔ آپ سب کا بیڑا غرق ہو۔ میں آج اپنے بچے لے کر ہی جاؤں گی۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے اُس پر پورا یقین ہے۔"

"بی بی جان! اب گاؤں کی زندگی میں ہمارے لئے رتی بھر کشش نہیں رہی۔ ہم آغا جان کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور رضا خان ہمارے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا۔" شیر خان نے ماں کی خوش فہمی کو دُور کرنے کی ہمت کر لی۔

"ہم آپ کو بھی ناراض نہیں کر سکتے بی بی جان!" دلیر خان نے ہمیشہ کی طرح بات

www.iqbalkalmati.blogspot.com



کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ظاہر ہے، تعلیم مکمل ہوتے ہی ہم گاؤں آجائیں گے۔ آپ بالکل تسلی رکھیں۔"

"یہ میرا حلالی بیٹا ہے۔ شیر خان! تمہیں تو میں دودھ ہی نہیں بخشوں گی۔" وہ اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ باہر کے دروازے کی چرچراہٹ سے ان کو جلال خان اور خوش بخت کی آمد کے احساس نے خاموش کرا دیا۔

جلال خان اُسے سہارا دے کر کمرے میں لے گیا۔ پلنگ پر لٹا کر اُس نے خانساماں کو آواز دی اور اُسے گرم گرم دودھ لانے کا حکم دے کر ماں کے کمرے کی طرف چل دیا۔

کلثوم، شوہر کو دیکھ کر چھلاوے کی طرح باہر کو لپکی اور خوش بخت کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ آہٹ پر اُس نے نیم وا آنکھوں سے جائزہ لیا۔ کلثوم کو دیکھ کر اُٹھنے کی ناکام کوشش نے اُسے شرمندہ سا کر دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں خبردار کرنے آئی ہوں، بچے میرے ساتھ واپس گاؤں جا رہے ہیں۔ تم مجھے ایک بات بتاؤ، کیا تم رضا کے بغیر خوش رہ سکتی ہو؟" وہ جوش میں تھی۔ مگر خوش بخت نے جواب نہ دینے میں عافیت سمجھی۔

"میری ایک بات یاد رکھنا۔ یہ موٹی غلافی آنکھوں اور گھٹاؤں جیسے کالے اور گھنے بالوں والے شوہر سے کبھی وفا کی اُمید نہ رکھنا۔ یہ جو میری اور تمہاری اولاد ہے نا، اسی سانپ کے سنپولے ہیں۔ ان کا زہر تمہاری زندگی میں گھل کر رہے گا۔ کتنے دن سکھ پا سکتی ہو؟"

وہ اُس کی جاہلانہ منطق اور ہٹ پر حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔

"تمہارے پاس میرے لئے کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ تم نے میرا سہاگ، میری اولاد اور میرے سسرال کو سرِ عام چھینا ہے۔ مگر یاد رکھو! ایسی بے جوڑ شادیاں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں۔ نہ جانے تمہارا خاندان کیسا ہے۔ دوسری عورت کے سہاگ کا تاج تمہارے سر پر سجا کر دو بچوں کے باپ کے لڑ باندھ دیا۔" وہ زہر اُس کی سماعت میں انڈیل رہی تھی۔ دروازے میں کھڑا جلال خان مصلحتاً خاموش تھا۔ خوش بخت بھی اُس کے سامنے ایک ملزم کی طرح نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔

وہ غصے سے پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔ اِک طویل ہنگامے اور شور شرابے کے بعد وہ



مجبوراً بچوں کو چھوڑ کر واپس گاؤں چلی گئی۔ گھر میں سکون کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ آندھی اور طوفان تھم چکا تھا۔ مگر اُس کے اثرات خوش بخت پر ابھی بھی نمایاں تھے۔ رپورٹ کے مطابق وہ دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ جس کی وجہ سے اُس کی ہمت اور برداشت کا مفقود ہونا عجیب بات نہ تھی۔ جلال خان کو اس کا پرانا تجربہ تھا۔ وہ اُسے دوائی دے کر سو جانے کی تلقین کرنے لگا۔

❖❖○❖❖

www.iqbalkalmati.blogspot.com



آج لیڈیز کلب میں افسران اور سٹاف ممبرز کی بیگمات کا بہت بڑا اجتماع تھا۔ رسالپور اور نوشہرہ سے بھی خواتین پشاور میس کے لیڈیز روم میں پہنچ چکی تھیں۔ خوش بخت، لیڈیز کلب کی چیئر پرسن کے ہمراہ ہر طرح کے انتظامات میں سب سے آگے تھی۔ آج کی اس میٹنگ میں محترمہ فاطمہ جناح چیف گیسٹ تھیں۔ خوش بخت ہال میں موجود تھا خواتین کو فاطمہ جناح کی کارکردگی کے بارے میں مستفید کر رہی تھی اور روسٹر پر 1948ء کا پیغام جو انہوں نے گرلز گائیڈ ایسوسی ایشن کو بھیجا تھا، پڑھ کر سنا رہی تھی۔

"اگر عورت کو سماجی خدمات، ایثار، تنظیم اور دوسرے لوگوں کی ہر وقت مدد کرنا سکھایا جائے تو اس کی قدر و منزلت ملکی اور گھریلو معاملات میں بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ اگر یہ ساری ضروری باتیں کم عمری میں تعلیم کے ساتھ ساتھ سکھا دی جائیں تو وہ کردار کے بنانے میں بہت مدد دیں گی۔ اور یہ امتحان پاس کرنے اور ڈگریاں حاصل کرنے کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہیں۔"

یہ فاطمہ جناح کا پیغام ہر قماش کی عورت کے لئے تھا۔ یہاں پر موجود ان پڑھ اور کم تعلیم یافتہ خواتین جو لیڈیز کلب کے نام پر خوفزدہ ہو کر اس میں سے کیڑے نکال کر اپنی کم مائیگی اور احساسِ کمتری سے کنارہ کشی اختیار کر لیتی تھیں۔ مگر آج اُن کے شوہروں کی نوکری اور حاضری کی طرح لیڈیز کلب کی میٹنگ میں شمولیت اہم قرار دی گئی تھی تاکہ وہ تعلیم یافتہ خواتین کی صحبت میں بیٹھنے سے ڈگری تو حاصل نہ کر سکیں گی مگر زندگی کے سنہری اصولوں سے روشناس ہو سکتی ہیں۔ اگلی نسل کے لئے بہت کارآمد اور مؤثر اقدامات کے امکان کی اُمید رکھ سکتی ہیں۔ ایک جیتی جاگتی مثال، عورت کے روپ میں اُن سب کے



سامنے تھی، جن کی خود اعتمادی، خوش بیانی اور خوش اسلوبی کو سلیوٹ کرنے کو دل چاہے۔ انہیں مادرِ ملت جیسے مقدس اور قابلِ احترام خطاب سے ایسے تو نہیں نوازا گیا تھا۔ خوش بخت نے ہر خاتون کو اُس کے نام اور پہچان سے متعارف کرایا تھا۔ جس پر مادرِ ملت نے خوشی کے اظہار میں سب کو معاشرے کی تعمیر میں اُن کے کردار کی اہمیت کو سراہا اور آغازِ اسلام سے لے کر آج تک کی ان گنت خواتین کی مثالیں اور پاکستان کے بننے میں اُن کے کردار کی چشم دید گواہی کی سچی داستانیں گوش گزار رہی تھی۔ تمام خواتین محظوظ اور مطمئن ہو کر گھروں کو واپس چلی گئیں۔ ان کہانیوں اور مثالوں کا تذکرہ مہینوں تک ہر گھر میں محوِ گردش رہا تھا۔

جلال خان دن بہ دن ترقی کے زینے طے کرتا کبھی یہاں، کبھی وہاں اپنے فرائض ادا کر رہا تھا۔ رضا خان اور فرح خان بھی والدین کے زیرِ سایہ پروان چڑھ رہے تھے۔ فرح بچپن سے ہی ناک نقشے اور عادات میں ماں کی اصل نقل تھی۔ رضا خان میں مکمل باپ کی چھاپ تھی۔ طبیعت میں وہی ہمدردی اور فیاضی تھی۔ اور دوسرے کی عزتِ نفس کو مدِ نظر رکھ کر گفتگو کے انداز سے وہ جلال خان معلوم ہوتا تھا۔ شیر خان اور دلیر خان، آرمی اور ایئر فورس میں اپنے عہدوں پر فائز ہو چکے تھے۔ فاطمہ پھوپھی کا چھوٹا بیٹا علیم جو اُنہی کا دوست بھی تھا، وہ بھی فوج میں کیپٹن کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ خوش بخت کے دونوں بھائی ایئر فورس میں پائلٹ بن چکے تھے۔ بلکہ دونوں گاؤں کے بے شمار بچے اپنی اپنی قابلیت و ذہانت کے بل بوتے پر جلال خان اور فیروز خان کی قیادت میں کاکول اکیڈمی اور رسالپور اکیڈمی سے تربیت حاصل کر کے کمشن حاصل کر چکے تھے۔ آج گاؤں میں کوئی بچہ ننگے پاؤں اور پھٹے پرانے کپڑوں میں گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلتے نظر نہ آتا تھا۔ سب معصوم ہاتھوں میں کتاب تھی اور دل میں کچھ بن کر اُبھرنے کی تمنا تھی۔

فیروز خان کی راہنمائی میں چلنے والے اسکول آس پاس کے علاقوں میں بھی اپنا بہترین کردار ادا کر رہے تھے۔ اماں گُل آخری دم تک خدمتِ خلق کے جذبے میں سرشار رہیں اور بدقسمتی سے ایک حادثے میں اماں گُل اور صفیہ، خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ خوش بخت کی تینوں بہنوں کی شادیاں، فاطمہ پھوپھی کے بیٹوں سے ہو چکی تھیں۔ ثریا تعلیمی میدان میں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ باقی دونوں بہنوں نے ماسٹرز پنجاب یونیورسٹی سے کیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com



تھا۔ خدیجہ کی دو بیٹیاں کنگ ایڈورڈ سے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور اُن پر جلال خان کی نظر تھی۔ شیر خان اور دلیر خان بھی دل و جان سے اُن پر فریفتہ ہو چکے تھے۔ مگر راز تینوں میں ہی محوِ گردش رہتا تھا۔

جلال خان کا گاؤں بھی خوشحالی کی طرف گامزن ہو چکا تھا۔ دیرینہ چلنے والی دشمنیاں ختم تو نہ ہوئی تھیں مگر رکھ رکھاؤ اور دنیا داری کا رُوپ دھار چکی تھیں۔ تعلیم اور باہمی اتفاق کی وجہ سے آئے دن کے حملے ماضی کا حصہ بن چکے تھے۔ بڑے آغاجی اور بی بی جان کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ کلثوم اپنی اسی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ خود رائی میں رتی بھر کی واقع نہ ہوئی تھی۔ مگر دو بیٹوں کے شانوں پر سجے ہوئے چاند اور ستاروں کی چمک نے اُس کے تفاخر میں مزید اضافہ کیا تھا۔ حالانکہ آج بھی شوہر کی سٹاف کار پر لہراتا ہوا ایک ستارے والا جھنڈا اُسے جلال خان کی ذاتی پذیرائی اور خودنمائی کی دلیل لگتا تھا۔ اُسے اس پر فخر نہ تھا، مگر مامتا اپنے تقاضے اور ناطے نبھانے میں سرشار تھی۔ وہ اُن کے سر سہرا سجانے کے خواب دیکھتے اور اُن کے گھر آنے پر ہر بار اُن کی خاموشی پر اُنہیں جی بھر کر برا بھلا کہتی۔ اُسے کیا معلوم کہ وہ تو اُس کی سوتن کے خاندان کی بیٹیوں کو اس کی بہوئیں بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

❖❖○❖❖

خوش بخت سفید رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے، صراحی نما گردن میں پرلز کی مالا اور کانوں میں بُندے ڈالے شیشے کے سامنے کھڑی نفاست سے بنائے ہوئے لمبے بالوں کے جُوڑے میں آخری پن لگا رہی تھی کہ دروازے کی تیز طرار بیل سے چونک اُٹھی۔ چند لمحوں میں شیر خان اور دلیر خان اُس کے سامنے کھڑے دیدی ماں کو قابلِ ستائش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ارے شیطان کو یاد کیا تو وہ حاضر۔ مان گئی ہوں۔" اُس نے لبوں پر ہلکے گلابی رنگ کی لپ اسٹک لگاتے ہوئے دونوں کو چھیڑا۔

"جنت سے اُتری ہوئی ہماری دیدی ماں! اب کہاں جانے کو تیار ہیں؟" شیر خان نے ساڑھی کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "آسمانی حور معلوم ہو رہی ہیں۔ خدا کی قسم، جو جھوٹ بولوں۔"



"ایسی باتیں کوئی تم سے سیکھے۔" خوش بخت نے قہقہہ لگایا۔ "بے وقت کی آمد اور بے جا خوشامد۔ دال میں ضرور کالا ہے۔"

"آپ ہماری رگ رگ سے واقف تو ہیں دیدی ماں! پھر ہم کیا عرض کریں؟ کیوں کر التجا کریں؟" دلیر خان نے دیدی ماں کو سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"دال سے کالا نکلوانے ہی تو آئے ہیں۔ اس کٹھن کام کے لئے ایک ہفتے کی چھٹی ناکافی تو نہ ہو گی دیدی ماں!" شیر خان آنکھیں گھما کر مستعدی اور ہوشیاری سے بولا۔

"ذرا تیاری رکھیں۔ دال کا کالا پہیلی کے بوجھنے سے رفو چکر ہو گا۔"

"لیڈیز کلب، کلاس فور سرونٹس کی مدد کے لئے مینا بازار کا افتتاح کر رہا ہے۔ آپ کی دیدی ماں، چیف گیسٹ ہیں۔ واپس آ کر تم دونوں کی خبر لیتی ہوں۔" انداز میں دھمکی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ضرورت مندوں کی امداد میں یہ ناچیز و حقیر بندے بھی آتے ہیں۔" شیر خان نے نہایت عاجزی وانکساری کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"آج سچ مچ کسی چکر میں ہیں آپ دونوں۔" وہ مسکرائی۔ "کوئی لڑکی وڑکی پسند آ گئی ہے کیا؟ مجھے شک نہیں اپنی اس سوچ پر، یقین ہے۔"

"چلو جی دلیرو! ایک پہیلی تو بوجھ ہی لی دیدی ماں نے۔" شیر خان نے بھائی کے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔" خوش بخت نے رِسٹ واچ پر نظر دوڑائی اور سفید رنگ کا پرس اُٹھا کر خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"دیدی ماں بہت جہاندیدہ خاتون ہیں۔ دیکھنا وہ ہمارے مقصد تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گی۔" دلیر خان نے انکشاف کرتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔ بی بی کو کون منائے گا؟" شیر خان کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"او یار! پہلے دیدی ماں تو رضامند ہوں۔ اگلا قدم بعد میں اُٹھانے کا سوچیں گے۔ تمہاری گرم گرم کھانے کی عادت نہ گئی۔ فوجی تربیت بھی تمہیں سدھارنے میں ناکام ہی رہی۔" دلیر خان کے لہجے میں طنز و مزاح نمایاں تھا۔

"تم تو مزاجاً ابھی تک ٹھنڈے اور دھیمے ہو۔ حیرت کی بات ہے۔ پائلٹ تو طبعاً

www.iqbalkalmati.blogspot.com



تمہارے جیسے نہیں ہوتے۔ اُنہیں تو آکاش کی بلندیوں کو چیرنا اور رفعتوں کو پانا آتا ہے۔ تیزی اور پھرتی اُن کی ذات کا اہم حصہ ہوتی ہے۔'' شیر خان نے اُسے چھیڑا۔ تمہارا F-6 طیارہ تمہیں اُڑاتا ہوگا۔ وِری بیڈ دلیرو!''

''یہ بھید تم کیا جانو، زمین پر کینچوے کی طرح رینگ کر دشمن کا مقابلہ کرنے والے سپاہی!'' اُس نے ہنستے ہوئے ضرب لگائی۔ ''ہم رفعتوں کے باسی اور تم پستیوں کے باشندے۔''

''واہ، واہ! کیا خود پسندی پائی ہے اس مرنجاں مرنج پائلٹ نے۔ ذرا میری بات پر غور کرنا۔ حکمرانی اور حاکمیت کے تخت دھرتی پر ہی مزین کیے جاتے ہیں۔'' شیر خان نے بھی چھیڑا۔

''دربارِ الٰہی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اُس کا دربار کہاں مزین ہوتا ہے؟'' اُس نے اُسے پھر سے سُوئی چبھوتے ہوئے کہا۔

''تم اپنی نوکری کی پسندیدگی میں زمین و آسمان کے قلابے ملالو۔ میری صحت پر کوئی اثر پڑنے والا نہیں۔ اپنی سوچ کو درست کرو۔ کیونکہ بھائیوں میں مقابلہ اور تفریق اپنی شکست کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ باز آجاؤ دلیرو!'' وہ سچ مچ فکرمند ہوگیا۔

''میں تو تمہیں چھیڑ رہا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ بھائیوں کی یکجائی ہی دشمن پر فتح یابی کی دلیل ہے۔'' دلیر خان بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرے ساتھ چھیڑ خانیاں کرو گے تو مجھے بھی تو تمہاری اصلیت بتانے میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ ڈیڈی ماں، مغرب سے پہلے تو آنے سے رہیں۔ چلو ہم فلم دیکھنے چلتے ہیں۔ انتظار میں وقت کا گزرنا مشکل ہو جائے گا۔'' شیر خان نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''چھوڑو یار! ہم اتنے دنوں بعد ملے ہیں۔ گپ شپ لگاتے ہیں۔ رضا اور فرح بھی آتے ہی ہوں گے۔''

بیٹ مین کو چائے کا کہہ کر دونوں بھائی باہر برآمدے میں کین کی کرسیوں پر نیم دراز ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ رضا خان اور فرح اسکول سے آگئے۔ انہوں نے مارے خوشی کے بیگ میز پر پھینکے اور اُن کے گلے میں بانہیں ڈال کر گود میں براجمان ہو کر پڑھائی اور دوستوں کے قصے سنانے لگے۔



رات کے کھانے سے فارغ ہو کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ رضا اور فرح، سونے کی اداکاری میں کامیاب ہو کر بھائیوں کے کمرے میں پریوں اور جنوں کی کہانی سننے پہنچ گئے۔ ایسی ڈراؤنی اور بھیانک کہانی سننے کے بعد فرح، ماں کے بستر میں جا گھسی اور رضا، دلیر خان سے چپک کر سو گیا۔

دوسری رات خوش بخت اُن کے ہتھے چڑھ گئی۔ سہیلی بوجھ پہیلی کا موضوع کافی دلچسپ اور دلفریب تھا۔ چند سوالات کے بعد خوش بخت نے اُن کے وجود میں پسندیدگی کے بیج تلاش کر لئے تھے۔ اعتراض یا انکار کے حق کو وہ اپنے ہاتھ میں لینا نہیں چاہتی تھی۔ دیکھے بھالے بچوں کی طرف داری ماں ہونے کے ناطے کرنا لازم بھی تھی۔ مگر وہ بالکل چپ سادھے بیٹھی تھی۔

''ڈیڈی ماں! ہم بی بی کے منتخب کردہ رشتوں کے ساتھ دو گام بھی نہ چل سکیں گے۔ ڈیڈی ماں جیسی عورت صدیوں میں صرف ایک دفعہ جنم لیتی ہے۔ یہ آغا جان کی خوش نصیبی تھی کہ آپ اُنہیں مل گئیں۔ اس لئے ہماری شادی کا فیصلہ تاریخ کو پیشِ نظر رکھ کر کیا جائے تو آپ کی مہربانی ہوگی۔'' دلیر خان نے خاموش خوش بخت کا جائزہ لیتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

''ڈیڈی ماں! آپ کچھ تو جواب دیں۔'' دونوں بیک وقت بولے۔

''میں سوچ رہی ہوں، تم دونوں کتنی بڑی بڑی اور سمجھ داری کی باتیں کرنے لگے ہو۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''ڈیڈی ماں! بات کرنے کا حوصلہ، خود اعتمادی اور ہماری ہمت میں آپ کا ہاتھ ہے۔ ان بازوؤں کے سہارے تیرنا اور ان ناتواں پاؤں پر کھڑے ہونا اور زندگی کی بھاگ دوڑ میں شامل ہو کر اپنی زندگی کو کامیاب بنانا ہم نے آپ سے سیکھا ہے۔'' شیر خان نے عاجزی سے کہا۔ ''ہماری ماں ایک سادہ اور اَن پڑھ خاتون ہیں۔ انہوں نے نہ دنیا دیکھی، نہ ہی اس کی چالوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے ماحول سے وہ کچھ سیکھ لیا، جس کے لئے کسی درس گاہ یا اتالیق کی ضرورت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابھی تک اپنی سادگی اور بزرگوں کی ہٹ دھرمی کا خمیازہ بھگت رہی ہیں۔ بے جوڑ رشتوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ ہم آغا جان کو بالکل قصوروار نہیں ٹھہراتے۔ انہیں بھی تو اپنے ساتھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چلنے والا ساتھی چاہیے تھا۔ ان کا حال اور مستقبل تو قابلِ ستائش ہے۔ مگر آپ، رضا اور فرح مستقبل میں احساسِ تنہائی سے مضطرب ہو جائیں گے۔ کیونکہ خاندان میں جو مقام، بی بی کو حاصل ہے، آپ کو نہیں۔ رضا اور فرح بھی بڑے ہو کر اس کمی کو محسوس ضرور کریں گے۔ کیوں نہ ہم ابھی سے اس امر کی پیش بندی کرنے کی سوچیں۔ آغا جان نے ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اس پر مضبوط عمارت کھڑی کرنے میں ہمیں آپ کی مدد، ہمت و حوصلے کی ضرورت ہے۔ ہمارا خیال ہے، عائشہ اور حفظہ کی آمد سے دو خاندانوں کے فاصلے اور دُوریاں یکسر ختم ہو سکتی ہیں۔ محبتوں اور چاہتوں کا کھلنے والا نیا باب ہم سب کے لئے خوش آئند نتائج کا سبب بن کر نئی نسل کو زندۂ جاوید رکھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔'' شیر خان کے دلائل پر دلیر خان نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

مزاحیہ گفتگو نے سنجیدگی کا رُوپ دھار کر خوش بخت کو تذبذب میں ڈال دیا۔

''کیا ہم آپ کو پسند نہیں ہیں دیدی ماں؟ آپ کی خاموشی نے ہمیں فکرمند کر دیا ہے۔ کیا آپ برا مان گئی ہیں؟ ہم اپنی خواہش کا اظہار آپ سے نہیں کریں گے تو کیا بی بی سے کریں گے؟'' شیر خان نے خوشامد کی۔

''اپنے آغا جان سے مشورہ کر لیا ہوتا۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔

''ان سے بات ہو چکی ہے دیدی ماں!'' دلیر خان نے برجستہ جواب دیا۔

''چالاکی کی انتہا ہے بھئی۔ آج مجھے تم دونوں کے جوان ہونے کا یقین ہو گیا ہے۔ کیا اپنی بی بی سے بھی رضامندی لی ہے؟'' خوش بخت ہنستے ہوئے اصلی موضوع کی طرف آ گئی۔

''آپ کی رضامندی کے بعد اگلا قدم اٹھایا جائے گا۔'' شیر خان اُس کے پاؤں دبانے لگا۔

''ہٹو، خوشامدی کہیں کا۔'' خوش بخت اپنے پاؤں کھینچتے ہوئے ہنسنے لگی۔ ''سب سے پہلے مجھے آپ کی بی بی کی رضامندی چاہئے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں، جتنا آپ نے سمجھ رکھا ہے۔ آخر اُس ماں نے بھی کیسے کیسے خواب دیکھے ہوں گے۔ تم دونوں میری بات اپنے پلّے باندھ لو۔ ماں کی دُعا، اولاد کے بگڑے ہوئے نصیبوں کو بھی بدل ڈالتی ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے رحمتیں اور نوازشیں فرمانبردار اولاد کی باندی بن جاتی ہیں۔ عائشہ



اور حفظہ کو کلثوم کبھی بھی قبول نہیں کرے گی۔ اُس پر پھر سے قیامت ٹوٹ جانا قدرتی امر ہو گا۔ اس کے لئے خود کو تیار رکھو۔ یاد رکھنا! ان رشتوں کی خاطر ماں سے بحث مباحثہ اور بدتمیزی کرنا گناہِ کبیرہ کے زمرے میں آئے گا۔ ذرا انسانیت کے جامے میں رہ کر بات کرنا۔'' اُس نے سنجیدگی سے نصیحت کی تو وہ دونوں افسردہ ہو گئے۔

''منہ لٹکانے کی ضرورت نہیں۔ جوڑے تو آسمان سے بن کر زمین پر اُترتے ہیں۔ ہماری حیثیت اِک کٹھ پتلی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ ڈور تو اُس کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری ہر حرکت میں اُس کی مرضی شامل ہے۔ مایوسی تو ایمان کی کمزوری کا نام ہے۔ ہمارے اندر بسنے والی یہی کمزوریاں تو ہمیں ہر وقت نالاں رکھتی ہیں۔'' رحم اُس کے اعصاب پر چھا گیا۔ وہ اُنہیں تسلی دینے لگی۔

''دیدی ماں! آپ کی تمام باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ بی بی کو منایا کیسے جائے؟ کیا آپ کے پاس ایسا کوئی معجزہ ہے؟'' شیر خان نے سوچتے ہوئے کہا۔

''بچے، ماں کی ہر کمزوری سے واقف ہوتے ہیں۔ میں کون سا حربہ استعمال کرنے کی تلقین کروں؟ میں کچھ نہیں جانتی۔'' وہ زیرِ لب مسکرائی۔

''ہم عمر بھر شادی نہیں کریں گے۔'' شیر خان نے دلیر خان کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور دونوں ہنسنے لگے۔

''کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے ماں بیٹوں میں؟'' جلال خان کمرے میں داخل ہوتے ہی خوشگوار لہجے میں بولا۔ ''کہیں میرے خلاف پراپیگنڈہ تو نہیں ہو رہا؟''

''بالکل درست سمجھا ہے آپ نے۔'' خوش بخت نے شوخی سے کہا۔

''ذرا میں بھی تو سنوں۔'' وہ شوخ لہجے میں بولا۔

''ماں اور بیٹوں میں کچھ اپنی ذاتیات کی باتیں بھی تو ہو سکتی ہیں نا۔ آپ جا کر آرام فرمائیں۔'' وہ مسکرا رہی تھی۔

وہ بھی مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ انہیں کھل کر گفت و شنید کا وقت دے کر ایک دوسرے کے اعتماد کو بڑھانا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ ایسا ناقابلِ حل مسئلہ تو تھا نہیں جس میں کسی قسم کی دُشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ ماں بیٹوں میں مانوسیت اور بے تکلفی ایسی تھی کہ ہر زاویے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تبادلۂ خیالات کر سکتے تھے۔ وہ خصلتیں جو انسانی جبلت کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ضابطے میں لانے کے کام آتی ہیں یعنی انسان اور جانور میں تفریق کرنے کا سبق سکھاتی ہیں، وہ خوش بخت نے دونوں بیٹوں کے دماغ میں گھول کر ڈال دی تھیں۔ اچھائی اور برائی میں تمیز اور اس کا احساس، احساسِ تشخص اور مستقبل کے بارے میں فکرمندی اور تجسس کا پیدا ہونا، ہر قانون اور ضمن گوش گزارنے کے نتیجے میں آج وہ پوری خود اعتمادی سے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اُس کی محنت اور کاوش اکارت نہ گئی تھی۔ وہ نشے میں سرشار اُن کے منہ سے ہر طرح کی بات اُگلوا رہی تھی۔

آخر کار وہ خوش بخت کی رضامندی اور اجازت سے اپنی ماں سے تبادلۂ خیالات، صلاح ومشورہ اور آخر میں منانے کے تمام حربوں کے بعد ایک کارگر دھمکی دینے پہنچ گئے۔ خاندان کی بیسیوں لڑکیوں کے حدود اربعے بیان کرنے کے بعد ماں مایوس ہو گئی۔ بہار خان کی بیٹیاں جو کہ نوشہرہ آرمی پبلک سکول میں زیر تعلیم تھیں، ان سے انکار کی وجہ سمجھ نہ آئی۔ ماں کے بے حد اصرار پر انہوں نے اپنی پسند بتا کر خاموشی پر اکتفا کر لیا۔ ماں پر جھرجھری سی چھا گئی۔ اول فول بکتے اُس کی زبان تھک گئی۔ مگر دونوں خاموش ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کیا مجال کہ جوں نے بھی رینگنے کی گستاخی کی ہو۔ وہ تپ کر خودکشی کی دھمکیاں دینے لگی کہ میری حیات میں بیٹوں کی شادیاں اللہ ماری میری سوتن کے خاندان میں ہرگز نہ ہوں گی۔ چاہے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔

بیٹے اپنا آخری فیصلہ اور آخری دھمکی دے کر کمرے میں بند ہو گئے۔

''ہم عمر بھر شادی کریں گے، نہ ہی اب نوکری پر جائیں گے۔ یہاں کی دشمنی کو پالیں گے اور ایک دن قتل کر دیئے جائیں گے۔ بس یہ ہے آپ کی خواہش تو ہم پوری کیے دیتے ہیں۔'' بغیر کسی نافرمانی اور گستاخی کے۔ انہوں نے دُکھی لہجے میں کہا اور کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ ماں نے کھانا ٹرے میں سجا کر نوکرانی کے ہاتھ اندر بھیجا۔ واپس کر دیا گیا۔ بادام کا شربت اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے لے گئی، مگر جواب ندارد۔ پھر ناریل اور دھنیے کے تیل کا محلول بنا کر اُن کے بالوں میں مالش کرنے پہنچ گئی مگر مسکرا کر انکار کر دیا گیا۔ غسل خانے کو خوب دھلوا چمکا کر سفید براق جیسے کُرتے اور شلواریں، صاف تولیے اور خوشبودار صابن اور ٹالکم پاؤڈر کا نیا ڈبہ کھول کر وہاں رکھا گیا اور بڑی خوشامد سے اُنہیں بلانے گئی۔ تاکہ وہ نہا دھو کر تازہ دم ہو جائیں۔ آزردہ مگر آدمیت کے جامے میں رہ کر



بات کرنے کے انداز نے ماں کے دل کو کچوکے لگا دیئے۔ وہ سوچ کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔ اُس نے اُنہیں جوان ہوتے بھی نہ دیکھا تھا۔ ان کے یہاں سے رخصت ہونے کے بعد جب یہ ڈیڑھ سال بعد باپ کے ساتھ گاؤں آئے تھے تو چہرے داڑھی مونچھوں سے کھردرے ہو چکے تھے۔ قد وقامت بھی باپ کے برابر ہی آ گئی تھی۔ جوانی کی اس تپتی دوپہر میں گلے میں پھنسا ہوا نوالہ بھی پگھل چکا تھا۔ پھر دوسری بار یہ گاؤں ماں کی دعا لینے بھیجے گئے تھے۔ جب شیر خان، کاکول اکیڈمی اور دلیر خان، رسالپور اکیڈمی جانے کے لئے تیار کھڑے تھے، افسران بننے کے بعد خوش بخت انہیں چھٹیاں گزارنے ماں کے پاس بھیج دیا کرتی تھی۔ کیونکہ اپنے فرائض کی سبکدوشی کے بعد اب انہیں اپنے پاس رکھنے کا جواز نہ تھا۔ وہ ماں کے کلیجے کا سکون اور اُس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن کر ان کی قسمت کو چار چاند لگانے کی سزاوار تھی۔ بے شک اُن کی خواہش کا بخوبی تجزیہ کرتے ہوئے اسے لاتعداد مفادات کی بُد بُد ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ ان کی ماں کی رضامندی کے بغیر ایک قدم نہ اُٹھانا چاہتی تھی۔ قدم قدم پر ماں کی دعاؤں کے ساتھ اس کی دعائیں بھی ان کا پیچھا کیا کرتی تھیں۔ آج پھر اُن کی نئی زندگی کا بہت بڑا فیصلہ ہونے جا رہا تھا۔ گھر میں اُس نے عید میلاد النبی کی محفل سجا کر خشوع وخضوع سے ان کی بہتری کے لئے دعا مانگی تھی۔ آنسو اُس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے اور وہ سر جھکائے باری تعالیٰ کے سامنے سر بسجود تھی۔ تمام خواتین رخصت ہو چکی تھیں۔ تنہائی ملتے ہی وہ سجدے میں گری گڑگڑا کر فریاد کر رہی تھی کہ دروازے کی بیل پر چونک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ہاتھ ابھی بھی دعا کے لئے اٹھے ہوئے تھے، جھولی پھیلی ہوئی تھی کہ یکدم اُس پر اور خالی جھولی میں گلاب کے پھولوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ اشکبار آنکھوں سے اُس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ شیر خان اُس پر پھولوں کی بارش برساتا، فتح مندی کی مسکراہٹ لئے کھڑا تھا۔ اُس کے پیچھے دلیر خان، کلثوم کے شانوں پر بازو رکھے محظوظ ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں؟ من میں کھلبلی مچ اُٹھی تھی۔ کے ٹو کو ریزہ ریزہ ہوتے اُس نے اپنی زندگی کے دورانیے میں پہلی دفعہ دیکھا تھا، جو کہ ممکنات میں سے نہ تھا۔

''خوش بخت! میں کن الفاظ سے کس کس احسان کا شکریہ ادا کروں؟'' کلثوم چند قدم بڑھا کر اُس کے قریب آ گئی۔ اظہار تشکر اُس کے چہرے پر عبارت تھا۔ خوش بخت کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ردِعمل ایسا تھا جیسے گونگے کا گڑ کھایا ہو۔

''ڈیڈی ماں!'' دلیر خان نے اُسے پیار سے جھنجوڑا۔ ''واپس آ جائیں۔ اتنا طویل شاق درست نہیں۔''

''ہاں، ہاں۔'' اس نے کلثوم کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ وہ کس طنطنے والی خاتون تھی، جس نے اپنا خاوند، اپنے سسرالی رشتے، اپنے بچے کھو دینے میں بھی پچھتاوا یا ندامت کا اظہار نہ کیا تھا، آج اس کے سامنے ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر اِک بھکارن کے مانند کھڑی تھی۔

''مجھے معاف کر دو خوش بخت! میں تم سے تمہارے دلیر خان اور شیر خان کی خوشیوں کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔ مجھے علم ہے، خالی لوٹانا تمہاری فطرت میں نہیں۔'' آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

خوش بخت نے اُس کے بندھے ہوئے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھینچ لئے۔ ''مجھے گناہگار مت کریں ڈیڈی! خان صاحب ابھی آتے ہی ہوں گے۔'' وہ بمشکل بول پائی۔

''اُس سے نہ میرا کوئی رشتہ ہے نہ تعلق۔ خوش بخت! یہ سہاگ تمہیں نصیب ہو۔ تم نے دو معصوم اور ناسمجھ بچیوں کی خوشیوں کو زندگی بخشی ہے، ورنہ وہ بھی میری طرح فرمانبرداری کا لبادہ اوڑھے سہاگن تو بن جاتیں مگر بہت جلد سہاگ کے ہوتے ہوئے بیوگی کا روپ دھار کرتا حیات مجھے کوستی رہتیں۔'' لہجے میں اپنائیت کے ساتھ دکھ کی بھی آمیزش تھی۔

جلال خان دروازے میں کھڑا امبر کو زمین بوس ہوتے دیکھ کر حضرت علیؓ کے قول کو سراہنے لگا۔ ارادوں کے بدلنے سے میں نے خدا پایا۔ جس نے ماں کے دل کو کسی خاص الخاص گوشت پوست سے تشکیل دے کر اُس میں اپنی روح پھونک دی تھی۔ جس عورت کو دنیا کی کوئی طاقت نہ بدل سکی۔ اُس کی اولاد نے اُسے سرتاپا ہی بدل ڈالا تھا۔ اور اس تبدیلی پر وہ نالاں و پشیمان ہرگز نہ تھی۔ ہار کی اس جیت پر سرشار تھی۔ زبان پر خوش بخت کے صبر کا قابلِ تحسین کلمہ اور وِرد تھا۔

❖❖○❖❖

دورِ فرنگ کی طرز کے بنے ہوئے پرانے اور وسیع و عریض بنگلے کو جدید لوازمات سے



مزین کیا گیا تھا۔ بڑے گیٹ، لان اور پورچ کی تمام لائٹوں کو نیا رنگ دے کر پرائے پن کو کم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ دونوں بے حد اشتیاق سے جائزہ لے رہے تھے۔ محرابی برآمدوں کے ستونوں پر لال گھنگا بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس پر پیلی اور سفید چنبیلی کی بیلوں پر ستاروں اور قمقمے کے مانند جگمگاتے اور بچے کی طرح کھلکھلاتے پھولوں نے اُنہیں خوش آمدید کہا۔ اس کے دائیں جانب سبز مخملیں گھاس کا نکھرتا ہوا ہر تنکا اُنہیں اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ آتشی گلابی، پیلے اور سفید قطار در قطار گلاب فضا میں قلاقند کی معطر خوشبو بکھیر رہے تھے۔ لان کے کونے میں راکری کے بیچ سدابہار مُنے پودوں کے سبز پتوں کے ہلکے اور گہرے شیڈز نے جو حُسن بکھیرا تھا، قابلِ دید اور قابلِ ستائش تھا۔ لان کے درمیان فوارے کے آس پاس زمین بوس ہوتی ہوئی بوتل، برش کے جھٹکے پانی میں اپنا عکس چھوڑ رہے تھے۔ بیٹھنے کے لئے درختوں کے تنے کے بینچ آرٹ کا شاہکار پیش کر رہے تھے۔ بائیں طرف دیوار پر کھٹیون کی بیلوں کی پھیلی ہوئی خوشبو اور دیوار کو ڈھانپے تازگی بخش رہی تھی۔ ایک طرف آم کے جھولتے ہوئے درخت اپنی عمر اور گزرے وقت کی گواہی دے رہے تھے۔ اُن پر لگا ہوا بُور گھاس پر گرا، پلو کے موتیوں کے مانند چمک رہا تھا۔ لیچی کے بے شمار تناور درختوں کو دیکھ کر جلال خان بے اختیار بول اٹھا۔

''خوشی! لیچی کے درختوں کی یہ نسل مجھے ڈیرہ دون کی معلوم ہوتی ہے۔ کیا میٹھی لیچی تھی وہاں کی۔ جوسِلا اور خوش ذائقہ۔ ناقابلِ فراموش۔''

''آپ کہیں نہ کہیں سے گھومتے گھماتے ڈیرہ دون اکیڈمی ضرور پہنچ جاتے ہیں۔'' اُس کا نسوانی پُرمزاح قہقہہ فضا میں گونج اُٹھا۔ ''گلاب کے پھول کس کی یاد دلاتے ہیں؟'' اُس نے چھیڑا۔

''تم سے پہلی ملاقات کی۔'' وہ مسکرایا۔

اسی اثنا میں دو مالی، گلاب کے پھولوں کے گلدستے لے کر حاضر ہو گئے۔ خوش بخت نے شکریہ کہہ کر گلدستے پکڑ لئے اور پھولوں کو سونگھتے ہوئے بولی۔

''لان پر کی گئی محنت لفظوں کی محتاج نہیں۔ ماشاء اللہ! دل خوش ہو گیا ہے ہمارا۔''

''میڈم! آپ بنگلے کے عقبی حصے کا بھی دورہ کریں۔ بغیر کھاد کے ہر طرح کی موسمی سبزی مل جائے گی اور ہر قسم کا موسمی پھل۔''

www.iqbalkalmati.blogspot.com



اتنی دیر میں بارہ سالہ رضا اور نو سالہ فرح بنگلے کے اندرونی حصے میں جا کر اپنے اپنے کمروں کا انتخاب کر کے چہرے پر طمانیت سجائے باہر آ گئے۔ بچوں کے لئے ایک طرف کونے میں سوئمنگ پول کے ساتھ پرندوں کا بہت بڑا پنجرہ بنا ہوا تھا، جس میں کئی قسموں کے معصوم پرندے اپنے قفس سے رہائی حاصل کرنے کے لئے بے چینی سے اِدھر اُدھر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ مور اپنا حُسن بکھیرنے میں محو تھے۔ خرگوش اُچھل کُود کر رہے تھے۔ اُسے مرحوم اماں گُل کی باتیں یاد آ گئیں۔

''بیٹا! یہ پرندے آسمان کی وسعتوں اور فضاؤں میں پرواز کرنے کے لئے پیدا کیئے گئے ہیں۔ انہیں اپنے مزے اور لطافت کی خاطر قید کرنا گناہِ عظیم ہے۔ ہمیں روزِ حشر اس ظلم پر جواب دہ ہونا پڑے گا۔''

وہ تیزی سے آگے بڑھی اور پنجرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ ''خان صاحب! ذرا سوچیں تو، ہمیں قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے کیسا محسوس ہو؟ یہ بے زبان ضرور ہے، بے حس اور بے جان ہرگز نہیں۔''

اتنی دیر میں دو شکاری کتے اپنی موجودگی کا اظہار کرنے لگے۔ باپ بیٹے نے دیکھ کر خوشی سے ایک دوسرے کو آنکھ ماری۔ رنگ برنگے سدھائے ہوئے بے شمار کبوتر، جنگلی حسین کبوتر، لال پیلے ہرے کئی نسلوں کے طوطے، فاختائیں، رنگ برنگی چڑیاں دروازہ کھولنے پر بھی باہر نہ نکلیں۔ ایک میاں مٹھو چُوری خورے بولتے ہوئے طوطے نے اُن کی تمام تر توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ خوش بخت نے ہاتھ بڑھا کر اس کو اُنگلی پر بٹھا لیا۔ اُس نے خوشی میں سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔

اس سے پہلے کہ بچے اسے مجبور کرتے، اس نے اسے الوداع کہہ کر فضا میں اُچھال دیا۔ وہ سنبھلتا ہوا، پرواز کرتا درخت پر جا بیٹھا اور اپنی زبان میں سب کو باہر کے ماحول سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دینے لگا۔ دھیرے دھیرے پنجرہ خالی ہو گیا۔ جلال خان اُس کی اس حرکت پر اُسے قابلِ آفرین انداز سے دیکھے جا رہا تھا۔ بچے بھی ہر پرندے کے اُڑ جانے پر تالیاں بجاتے اور الوداعی گانا گاتے، ماحول کو خوشگوار بنا رہے تھے۔ پنجرہ گھرے اور گھنیرے امرودوں کے درختوں کے پتوں سے جھانکتے ہوئے نیم سبز اور گلابی امرودوں میں گھرا ہوا تھا۔ پنجرے کے جنگلے کی دیواروں کے ساتھ جڑی ہوئی شاخوں کے تمام امرود پرندوں کے کھائے ہوئے تھے۔ اسی کے ایک کونے میں کیلے کے درختوں کا جھنڈ تھا جن پر کچے کیلوں کے تندرست گچھے لٹک رہے تھے اور عقبی حصے میں سال رسیدہ، پیوند کیئے ہوئے بیر کا بارُعب اور تناور درخت مضبوط شاخیں پھیلائے انہیں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ اُس نے اللہ کی شان میں قصیدے پڑھتے ہوئے سر اُٹھا کر اس پر لگے ہوئے ہرے اور لال بیروں کو دیکھا اور جلال خان کی طرف دیکھ کر گویا ہوئی۔

''خان صاحب! اس گھر میں داخل ہوتے ہی صدقہ خیرات اور قرآن خوانی کا انتظام ہونا بہت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں پیار و محبت کی نظر، حسرت و یاس کی نظر، بغض و عناد کی نظر اور رشک و حسد کی نظر سے محفوظ رکھے۔''

اب ان کے قدم گھر کے اندرونی حصے کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ چوڑی اور مضبوط دیواروں اور اونچی چھتوں والے وسیع کمرے جن کے روشن دان فال سیلنگ سے پوشیدہ ہو چکے تھے، چھتوں پر لٹکنے والے جدید فانوس روشنی بکھیر رہے تھے۔ کاٹھ کی کھڑکیوں کی جگہ شیشے کی لمبی چوڑی، سٹیل کی کھڑکیوں نے لے لی تھی۔ فرش پر کالی اور سفید ٹائلوں پر وال ٹو وال میٹنگ اور اوپر ایرانی اور افغانی چھوٹے بڑے رنگ برنگے قالین قوسِ قزح کا سماں پیش کر رہے تھے۔ کوئلوں کے آتش دانوں کی جگہ بجلی کے ہیٹر نصب تھے۔ ایم۔ ای۔ ایس کا خوب صورت فرنیچر اُس کے رُتبے کی کھلم کھلا غمازی کر رہا تھا۔

وہ بچوں کے ہمراہ واپسی کے لئے برآمدے میں نکل آئے۔ نوکروں کی اِک فوج اُنہیں خوش آمدید کہنے اور ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لئے محوِ انتظار تھی۔ پورچ میں جیپ کے رُکنے پر سب اُس طرف متوجہ ہو گئے۔ جلال خان کا اے۔ ڈی۔ سی یونیفارم میں ملبوس اُس کے قریب آیا اور سیلوٹ کے بعد دیر سے پہنچنے کی معذرت کی۔ جلال خان نے سنجیدگی سے انگریزی میں ہی جواب دیا۔

''آئندہ ایسی غلطی نہیں ہونی چاہیئے۔''

خوش بخت زیرِ لب مسکرائی۔ بچے لالہ کہہ کر اس سے لپٹ گئے۔ یہ کیپٹن شیر خان تھا، جو لیفٹیننٹ جنرل جلال خان کا اے۔ ڈی۔ سی مقرر کیا گیا تھا۔

انگریز حکومت کے وقتوں میں فوج میں یہ قانون لاگو کیا گیا تھا۔ اس کے پس پردہ بہت بڑی منطق اور دانش مندی پنہاں تھی کہ اگر کسی جرنیل کا بیٹا فوج میں کسی ایسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



عہدے پر فائز ہے جو ایک اے۔ڈی۔سی کا ہونا چاہئے تو کیوں نہ اسی کے بیٹے کو یہ شرف بخشا جائے۔ باپ کے زیرِ سایہ اس کی تربیت کے خاطر خواہ اور خوش آئند نتائج کا امکان فوج کے لئے بہترین ثابت ہو سکتا ہے۔ بالکل ایسے ہی، جیسے مختلف قبائل میں باپ اپنی نشست کو سنبھالنے کی تمام تر ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھانے کے تمام اصول اور طریقے اپنے بیٹے کی تربیت میں شامل کرتا ہے تاکہ اس کے بعد اس کے قبیلے کو کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اسی کے پیشِ نظر انگریز فوج میں یہ قانون تشکیل دیا گیا، جو آج بھی اسی طرح قائم و دائم ہے۔

جلال خان نے نہایت تپاک سے سب کے ساتھ مصافحہ کیا۔ شیر خان نے ایک ایک کا نام اور اُس کا کام اپنی فہرست میں لکھا ہوا تھا۔ وہ ہر ایک کے بارے میں تفصیل سے بتائے جا رہا تھا۔ لکھنؤ سے ہجرت کر کے آنے والے خانسامے پر خوش بخت بہت خوش ہوئی۔ ایک سالچی عورت، جس کا تعلق پرانی دلی سے تھا، خوش بخت کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو سمجھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''ہر طرح کا مغلئی کھانا ہم نے اپنے والد صاحب سے سیکھا ہے۔ ہمارے دادا، مغل شہزادوں کے دربار میں خانسامے کا کام کیا کرتے تھے۔''

خوش بخت نے مسکراہٹ سے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

گھر کی جھاڑ پونچھ کرنے والی ایک فربہ خاتون خود کو کالی چادر میں سر سے پاؤں تک لپیٹے اپنے پردے کی اہمیت اور گہرائی کی نشاندہی کر رہی تھی۔ جلال خان نے تجسس سے اُس کے کھلے چہرے کی طرف دیکھا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ یہ خاتون نہ جانے کس مجبوری میں مبتلا اتنے سخت پردے میں مقید نوکری کر رہی ہے، جلال خان کی رحم سے بھرپور نظریں اُس کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ نظروں کی حدت کو محسوس کرتے ہوئے عالمِ تذبذب میں نظریں جھکائے، زمین کو جوتی کی نوک سے کھرچنے لگی۔ شیر خان اُس کا تعارف کرا رہا تھا۔

''سلطانہ پچھلے دس سال سے اسی بنگلے پر اپنے فرائض ادا کر رہی ہے، جس کی دیانت داری اور وفاداری کی مثالیں دی جاتی ہیں۔''

''رضیہ سلطانہ۔'' جلال خان نے عجیب اور حیرت انگیز نظروں سے اسے دیکھا اور



ماضی کے ورق پلٹنے لگا۔ دلاور اپنی معصوم رضیہ سلطانہ کو پہچاننے سے انکار کر کے ضمیر کی لعنت و ملامت کو برداشت نہ کرتے ہوئے اسی رات سینے میں یہ جان لیوا اور گھناؤنا راز چھپائے منوں مٹی تلے جا چھپا تھا۔ نہ جانے کتنی آزمائشوں، حقارتوں اور نفرتوں کی مسافت طے کر کے وہ یہاں تک پہنچی تھی۔ وہ اُسے دیکھ کر دہل گیا تھا۔ خوش بخت نے اُس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو محسوس تو کر لیا تھا، مگر خاموش تھی۔ اُسے سوال کرنے کی عادت نہ تھی۔ حالات خود بخود ہی جواب بن کر اُس کے سامنے آ جایا کرتے تھے۔

جب وہ شادی ہو کر اس چھاؤنی کے ایک چھوٹے سے گھر میں آئی تھی تو چہل قدمی کرتے ہوئے وہ اس بنگلے کو کنکھیوں سے دیکھتی گزر جایا کرتی تھی۔ وہ اس بنگلے کو نظر بھر کر دیکھنے کی روادار نہ تھی، جس کے ہر کونے پر ہر وقت اسلحے میں لیس باوردی گارڈز گشت کرتے رہتے تھے۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے اس طرف دیکھنا بھی ناقابلِ معافی ہو گا۔ جہاں کے مکینوں کا تعلق شاید کسی اور سیارے سے تھا۔ مگر آج بغیر کسی حیل و حجت کے اس نے خود اعتمادی سے اس بنگلے کا کونا کونا چھان مارا تھا۔ گھروں کے احاطے جوں جوں وسیع و طویل ہوتے ہیں، دل اتنے ہی مہین اور خائف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بے ثباتی اور غیر محفوظ ہونے کا خفقان اور جان و مال کے لُٹ جانے کا اندیشہ اُن کی زندگی میں ایسا ناگہانی انقلاب لاتا ہے کہ بے پناہ سروسامانی کے ہمراہ ایک ایسی حسین اور آرام دہ جیل کی قیدِ تنہائی میں کٹنے والے شب و روز بھی سجل اور پُروقار معلوم ہونے لگتے ہیں اور اس مصنوعی اور عارضی شان و شوکت اور جاہ و جلال کی نگہداشت کی خاطر دوسروں کا چین و سکون اور نیندیں حرام کر دی جاتی ہیں۔ کبر و پندار کے اس بے وقوفانہ احساس سے عاری وجد اور عالمِ مسرت میں انہوں نے اس گھر کا معائنہ کیا تھا۔ ماضی کی اَن گنت دلفریب یادیں اُن کے آس پاس محوِ گردش تھیں۔

کیپٹن شیر خان اور اس کی بیگم لیفٹیننٹ ڈاکٹر عائشہ خان کو اس بنگلے کے عقب میں فلیٹ مل گیا تھا، جسے وہ سیٹ کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ دلیر خان اپنی بیگم لیفٹیننٹ ڈاکٹر حفظہ کے ساتھ سرگودھا بیس پر رہائش پذیر تھا۔ جلال خان کو پہلا جرنل بننے کا شرف حاصل تھا۔ اس خوشی میں فیروز خان نے اپنی حویلی کے بکھرے ہوئے تمام مکین، اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو گاؤں میں ضیافت پر مدعو کیا تھا۔ خوش

www.iqbalkalmati.blogspot.com



بخت چند دنوں سے حویلی میں ہی موجود تھی۔ ایک عورت کے چلے جانے سے حویلی ویرانی اور بے توجہی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جہاں قرینے اور سلیقے کی نصیحتیں ہوا کرتی تھیں، وہاں صفیہ اور اماں گل کی غیر موجودگی میں ہر چیز اِدھر اُدھر بکھر کر مایوسی و اُداسی کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ نوکر اور نوکرانیوں کے ساتھ حویلی کے ہر گوشے کو سنوار رہی تھی۔ اب تو ہر کمرے میں بجلی کے فانوس اور پنکھے لٹک رہے تھے۔ بجلی سے چلنے والی ہر طرح کی مشینیں باورچی خانے میں موجود تھیں۔ باورچی خانہ باہر کے مخصوص احاطے سے اُٹھ کر زنان خانے کے ملحقہ کمرے میں آچکا تھا۔

دیہاتی فضا میں بھی فطری و قدرتی قسم کے نغمے اور سرود کے حُسن کا انداز بدل چکا تھا۔ سورج کے نمودار ہونے سے پہلے اس کی کچی گلیوں میں بیلوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں کسی مندر کا سماں پیش کیا کرتی تھیں۔ مگر آج ٹریکٹر کے چلنے کی آواز اور اس پر نور جہاں کے الاپتے ہوئے فلمی گانے ماحول کے سکون کو غارت کر رہے تھے۔ بیلوں کے پیچھے ہاتھ میں چھمک اُٹھائے اُنہیں ہانکتے ہوئے کھیتوں کی جانب موسمی فصل کی کاشتکاری کے لئے لے جانے والے کسان کسلمندی کی حالت میں ٹرالی میں نیم وا بیٹھے تھے۔ جوش و خروش نام کو نہ تھا۔ علی الصبح لسی بلونے کی صدا گھر گھر سے اُٹھ کر فضا میں تحلیل ہوا کرتی تھی۔ بھینسوں کے تھانوں پر دودھ کی دھاریں اپنی موسیقی سے ہمکنار ہو کر قدرتی سُر کا حصہ بنا کرتی تھیں۔ چکی پر آٹا پیسنے والی دوشیزاؤں کی کانچ کی چوڑیوں کی کھنک اُن کے سہاگن ہونے کی گواہی دیا کرتی تھیں۔ تھوڑے ہی فاصلے پر نہر کے پانی کے چلنے کی صدائیں ٹیوب ویل کی بھونڈی آواز میں دب چکی تھیں۔ جھانجھروں اور پائلوں کی جل ترنگ روز کا معمول ہوا کرتا تھا۔ مگر آج سب کچھ بدل چکا تھا۔ آٹا پیسنے والی چکی کی کُوکُو نمایاں تھی۔ مشینی زندگی کا بول بالا تھا۔ جو کام مہینوں میں ہوا کرتا تھا، جدید آلات نے اُسے گھنٹوں میں مقید کر دیا تھا۔ فصلوں کی بڑھتی ہوئی پیداوار کے سبب گاؤں میں خوشحالی نظر آنے لگی تھی۔ حویلی کے آس پاس کے تمام کچے گھروندوں، بانس کے چھپروں اور بوسیدہ اور حبس زدہ کوٹھڑیوں کی جگہ پکے گھروں نے لے لی تھی۔ گلیاں لال اینٹ کی اور پانی کے نکاس کے جدید انتظام میں فیروز خان کی کاوش کا ہاتھ تھا۔ زندگی آسان اور سہل ہونے کے ساتھ ترقی کی طرف گامزن تھی۔



وہ حویلی کی صفائی ستھرائی کرتے بیتے دنوں کی مشکلات کے بارے میں سوچ جا رہی تھی۔ روح پُر ملال بھی تھی، شادماں بھی تھی۔ اس ملے جلے حسین امتزاج میں وہ کبھی گنگنانے لگتی، کبھی آہیں بھرتی ماں اور اماں گل کو متلاشی نظروں سے اپنے آس پاس دیکھنے لگتی۔ فیروز خان نے اب تو اپنی زندگی اسی گاؤں کے نام کر دی تھی۔ ماڈل ٹاؤن وہ بہت کم جاتا تھا۔

ثریا تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ گئی تھی۔ اُس کی شادی رحیم خان سے ہو چکی تھی۔ زہرہ اور جہاں آرا نے پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹرز کر لیا تھا۔ اُن کی شادیاں بھی کریم اور علیم سے ہو چکی تھیں۔ دونوں بیٹے فوج میں کمشن لے چکے تھے۔ باقی خاندان ابھی تک طویل سفر پر گامزن تھا۔ فیروز خان کا ہر قدم اور ساتھ اُن سب کے لئے کامیابیوں کا سندیسہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں خدمتِ خلق کا جذبہ وافر مقدار میں سمو کر اپنی ہمیشگی اور پائیداری کا سامان تو کر دیا۔ مگر دنیا کو فانی قرار دے دیا۔

خدا تعالیٰ کی خوشنودی، اپنے پرائے کی آفرین و پذیرائی کی طمع یا دلی اطمینان و سکون کا لالچ۔ کون سی حِس ہمیں ڈوبتے کو بچانے پر مجبور کرتی ہے۔ ہم اپنی فطرت کے مطابق راہ متعین کرتے ہوئے زیست بتا دیتے ہیں۔ سچائی اور اصل حقیقت کو پسِ پردہ رکھتے ہوئے بعض اوقات دوسروں کے سروں پر احسانات کا منوں بھاری ٹوکرا رکھ کر شادماں ہو جاتے ہیں۔

اسی گاؤں میں دلاور کے بیٹوں نے بھی نام پا لیا تھا۔ انہوں نے دو منزلہ چوبارہ بنا کر اپنی خوشحالی کو منوانے کی کوشش کی تھی۔ ان کی چھوٹی دو بہنیں تعلیم کی غرض سے شہر ہوسٹل میں رہ رہی تھیں۔ بچے اپنی پڑھائی میں مگن خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ وقت کا مرہم سب کے زخموں کے کرب کو طمانیت بخش چکا تھا۔ مگر ممتا کی تڑپ اور اذیت میں کمی کے بجائے زیادتی اور اضافہ ہونا فطری عمل تھا۔ رضیہ سلطانہ کی یاد میں ماں نے رو رو کر اپنی آنکھوں کی بینائی قربان کر دی تھی۔ مگر کسی کو اس کی پروا نہ تھی۔ جدائی اور دُوری، خونی رشتوں کی حدت و تپش کو نگل جاتی ہے۔ جن کے لئے راتیں جاگتی ہیں، دن دُہائی دیتے ہیں، اُن کا احساس اُفق کے اس پار بادلوں کی اوٹ میں بسیرا کر لیتا ہے جہاں تک رسائی ہی ناممکن ہو جاتی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



زندگی بے حد خوشیوں سے ہمکنار خراماں گزر رہی تھی۔ جلال خان، رضیہ سلطانہ کی طرف سے بے خبر ہرگز نہ تھا۔ وہ جس باعزت خاندان سے تعلق رکھتی تھی، اس کی جائے پناہ اور منزلِ مقصود وہ تھی۔ خوش بخت بھی اُس کی بے بسی اور ناکامی کا سن کر مضطرب ہوگئی تھی۔ آخر ایک دن خوش بخت نے بڑے پیار اور ہمدردی سے اُسے گھر پہنچانے کا ذکر چھیڑا۔ وہ خوش ہونے کے بجائے خفگی سے بولی۔

"میڈم! میری ذاتی زندگی کو کریدنے اور اس کا فیصلہ کرنے کا حق میں نے آپ کو قطعاً نہیں دیا۔ اگر صاحب کو میری پراگندہ زندگی کے بارے میں علم ہے تو پردہ داری میں ہی میری مصلحت سمجھیں۔ ورنہ مجھے یہ نوکری چھوڑ کر اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں گی۔ میں یہاں بہت باعزت زندگی گزار رہی ہوں۔ میرے بوڑھے ماں باپ میرے بغیر زیادہ دیر زندہ نہیں رہیں گے۔ میڈم! ہم پر رحم کھائیں۔"

"مجھے معاف کر دو رضیہ! میں نے تو تمہارے بھلے کا سوچ کر مشورہ دیا تھا۔" وہ کھسیانی سی ہو کر مسکرائی۔

"میرا نام سلطانہ ہے میڈم! آپ خود سوچیں، میں اپنے ضعیف والدین کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں، جنہوں نے مجھے اُس وقت سہارا دیا، جب میرے اپنے خون نے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔" وہ روہانسی ہوگئی۔ "میڈم! میں نے والد کے منہ سے انگارے نکلتے دیکھے ہیں۔ میں مارے حیرت کے بھاگتی جا رہی تھی۔ اُس دن کی گرمی، بھوک اور پیاس کی شدت مجھے آج بھی روزِ روشن کی طرح یاد ہے۔ میں ایک سرسبز لان میں چھپنے بڑھی ہی تھی کہ گر گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں بان کی کھٹیا پر لیٹی ہوئی تھی۔ میرے آس پاس دو انسان نما فرشتے مجھے پنکھے کی ہوا، منہ میں پانی کے قطرے ڈال کر مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو پُرمسرت آوازیں اُبھریں۔

"اے بھلیے لوکے! تیری دِھی نے اکھاں کھول لتیاں نیں۔ ہُن رونا بند کر۔ وِیکھ کِنی سوہنی، پلی پلائی دِھی مل گئی اے سانوں۔"

مالی بابا کی اپنی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے مجھے ہتھیلی کا چھپولا بنا لیا۔ میرے ماضی سے انہوں نے کوئی سروکار نہ رکھا تھا۔ وہ ماتا ہی کیا، جو حالات اور واقعات کو مدِنظر رکھ کر اولاد کے رشتے کو تسلیم کرتی ہو۔ بابا نے ہمیشہ فوجی افسروں کے لان رنگ برنگے



پھولوں سے سجائے تھے۔ اُن کی ضعیفی اور کمزوری کو دیکھ کر ایک فوجی افسر نے مجھے آیا گیری کی نوکری دلوا دی۔ میری زندگی میں اتنا سکون اور بے لوث پیار ہے کہ میرا اپنا خون مجھے مہارانی بنانے کو بھی تیار ہو تو میں اس تخت کو بھی لات مار دوں گی۔" وہ بے حد پُرسکون تھی۔

"دلاور چاچا تو اُسی رات اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔" خوش بخت نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"اُنہیں میری محبت، میری مجبوری و بے بسی اور اپنے پچھتاوے نے موت کی نیند سُلا دیا۔" وہ رو پڑی۔ "ابا کو مجھ سے پیار تو تھا نا۔ جھوٹی آن بان کی بھینٹ چڑھ گئے، بے چارے میرے ابا۔ قربان جاؤں آپ پر۔"

"کیا تمہیں علم ہے کہ تمہاری ماں نے رو رو کر آنکھیں پھوڑ لی ہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "ہر آہٹ پر تمہیں پکارتی ہے۔"

"ایسے نہ کہیں میڈم! میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔ میں اُن کے لئے مر چکی ہوں۔ یہی بہتر ہے۔" وہ تڑپ اُٹھی۔ "خدارا، اس راز کو یہیں ہی دفن کر دیں۔ سب کی نظر میں میری بہت عزت و احترام ہے۔ اس کو قائم رہنے دیں میڈم! عورت عزت و حرمت کے بغیر فاحشہ ہوتی ہے۔ اور میں فاحشہ اور طوائف بن کر زندگی گزارنا پسند نہیں کرتی۔ اس معاشرے میں پروان چڑھی ہوئی ہر عورت کے پاس اپنی پاک دامنی اور تقدس کے بغیر اور کوئی خزانہ نہیں ہوتا۔ میرا دامن تو اس سے بھی خالی ہے میڈم!.....لوگوں تک بات پہنچی تو کوئی بھی مجھے اپنے گھر کی دہلیز تک نہ آنے دے گا۔ نفرت اور حقارت بھری نظروں کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں رہی۔" وہ زاروقطار رونے لگی۔

"تم بے فکر رہو۔ یہ راز میرے سینے میں قبر تک جائے گا۔" اُس نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اُٹھایا اور اپنے روبرو بٹھا کر بولی۔ "ہماری نظر میں تم بہت مہان ہو۔ تم تو میری ثریا ہو۔ تم ہمیشہ کے لئے میرے ساتھ رہو گی، میرے گھر کا قابلِ احترام فرد بن کر۔"

"یہ ناممکن ہے میڈم! میرے بوڑھے ماں باپ کو اس وقت میری اشد ضرورت ہے۔" وہ فکرمندی سے بولی۔

"بزرگ، گھر کا تالا ہوتے ہیں۔ ہمارا ذاتی گھر مکمل ہونے والا ہے۔ یہ اُس گھر

www.iqbalkalmati.blogspot.com



میں رہیں گے۔ کوارٹر میں نہیں، انیکسی میں۔ کیونکہ تم میری ثریا ہو۔ رضا اور فرح کی خالہ ہو۔'' وہ اپنائیت سے بولی۔

''ہم بہت چھوٹے لوگ ہیں میڈم! مخمل میں ٹاٹ کا پیوند بہت بھدا اور بدنما معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کیا کہے گی؟ لوگوں کی سوچ کی سمت بدل جائے گی۔ آپ کو ناقابلِ فہم قرار دے کر مجھ پر کیچڑ اُچھالا جائے گا میڈم! ظلم اور ناانصافی کا نام دنیا ہے۔'' وہ رُندھی ہوئی آواز میں بولے جا رہی تھی۔

''مجھے اس کی رتی بھر پروا نہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''میڈم! میرا آپ سے وعدہ ہے کہ ہم زندگی بھر آپ کے کوارٹر میں رہ کر آپ کی خدمت کریں گے۔ میری طرف سے کبھی عہد شکنی نہ ہوگی۔'' وہ سعادت مندی سے بولی۔

''تم نے کبھی شادی کے بارے میں سوچا ہوگا۔ کیونکہ عورت کے تحفظ کے لئے مرد ساتھی کا ہونا باعثِ فخر ہے اور ضرورت بھی۔'' اُس نے موضوع بدلا۔

''میڈم! مجھے مرد ذات سے نفرت ہے۔ میں ان کی حریصانہ فطرت کا آج تک خمیازہ بھگت رہی ہوں۔ میرا کیا قصور تھا؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ کیا پاکستان کی تعمیر میں میرا کردار باغیانہ تھا؟...... دگدھا میں دونوں گئے، مایا ملی نہ رام۔ پاکستان کے نشے میں سب کچھ کھو کر بے دست و پا آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔ اپنے رہے نہ ہی پاکستان نے تحفظ دیا۔ سب کچھ گنوا دیا۔ سکھوں نے میرے خاندان کو پناہ دی تھی، مگر اپنوں نے لوٹ لیا۔ اور اپنے ہی خون نے ان لٹیروں اور غنڈوں کے سپرد کر دیا، ہمیشہ کے لئے۔ ہر رشتے سے میرا اعتبار اُٹھ گیا ہے۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنی زندگی میں بہت مطمئن اور پُرسکون ہوں۔ مجھ پر رحم کیجئے۔''

اُس نے خوش بخت کے گھٹنوں پر سر ٹیک دیا۔ وہ اُس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''مگر یاد رکھنا، تم میری ثریا ہو۔ مجھے چھوڑ نہ جانا۔ تمہیں میری قسم۔''

❖❖○❖❖



1965ء پاکستان کے لئے کٹھن آزمائشوں کا سال بن کر اُبھرا تھا۔ چار سُو جنگ کے بادلوں کے دھندلکے نے فضا کو سوگوار بنا دیا تھا۔ کیونکہ ابھی تو پاکستان کے وجود میں آئے زیادہ مدت نہ ہوئی تھی۔ لوگوں پر مہاجرت کے آثار ابھی بھی نمایاں تھے، پھر بھی قوم میں آزادی کی خاطر قربانی کا جذبہ سرایت کر گیا تھا۔ گرد و پیش کا ماحول پاکستان زندہ باد کے نعروں سے لبریز ہر ذی روح میں اُبھرنے والے احساسات و جذبات کو جلا بخش رہا تھا۔ اندھیری راتوں اور روشن دنوں میں گھر کے پچھلے احاطوں میں مورچے نور جہاں کی سریلی اور مدھم آواز کے ترانوں میں کس پھرتی سے کھودے جا رہے تھے۔

سرحدوں کے آس پاس بسنے والے تمام دیہات خالی کروا لئے گئے تھے۔ انہی میں سے فیروز خان کا خوشحال اور لمحہ بہ لمحہ ترقی کی راہوں پر گامزن رہنے والا گاؤں بھی شامل تھا۔ فیروز خان نے گھر کا تمام اثاثہ ماڈل ٹاؤن والے بنگلے میں پہنچا دیا تھا۔ حسرت و یاس سے بھری نگاہوں سے اس نے اپنے آم، امرود اور مالٹے کے باغات کو خدا حافظ کہا تھا۔ گاؤں کو خیرباد کہتے ہوئے اُس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں کہ آج پھر وہ مہاجر ہو گیا تھا۔ اُجڑ گیا تھا۔ تباہ و برباد ہو گیا تھا...... اس مقدس سرزمین کی پاکیزگی و سلامتی کی خاطر۔ اپنی آزادی کی حفاظت کی خاطر۔

❖❖○❖❖

''خان صاحب! جس کا تصور مجھے ہراساں و پریشان کئے دیتا تھا، وہ حقیقت بن کر سامنے آ ہی گیا۔ اب کیا ہوگا؟'' وہ ٹیلی فون پر لرزش زدہ آواز میں بول رہی تھی۔

''اللہ کو یہی منظور ہے خوش بخت! بس دُعا گو رہو۔ دلیری و بہادری ہمارا ایمان اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فتح یابی ہمارا مقدر ہے، آخری دم تک۔'' دوسری طرف سے با اُمید آواز اُبھری تو وہ رو دی۔

''آپ تین دن سے گھر نہیں آئے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے میری جان!'' وہ بے کلی سے بولی۔

''خوشی! تم ایک سپاہی کی بیوی ہو۔ میری رفاقت میں تمہیں بھی حوصلہ مندی اور ہر طرح کے حالات کی قبولیت کا سبق سیکھ لینا چاہئے تھا۔ محسوس ہوتا ہے، میری تربیت میں کہیں نہ کہیں کمی رہ گئی ہے۔'' آواز سنجیدہ تھی۔

''آپ تو خفا ہو گئے ہیں۔'' وہ چونک اُٹھی۔ ''چند لمحوں کے لئے آ جائیں۔'' وہ چھوٹے بچے کے مانند ضد کرنے لگی۔

''جانِ من! تھوڑی دیر میں میٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ تمہیں علم ہے نا، گرد و پیش کی تمام سرحدوں کا ذمہ دار میں ہوں۔ میری پل بھر کی کوتاہی سینکڑوں سپاہیوں کی شہادت کا سبب بن سکتی ہے۔ تم حوصلہ رکھو۔ تمہاری دعاؤں اور رفاقتوں کے سائے میں میرے تمام فیصلے اور منصوبے فتح یابی کا رُخ اپنائیں گے۔ یہ مت بھولنا میری جان!''

رابطہ منقطع ہو گیا۔ خوش بخت، ریسیور کو بے بسی سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ آنکھوں میں ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ میں ایسی کم ہمت تو کبھی نہ تھی۔ یہ مجھے کون سی حس بزدل بنائے ہوئے ہے؟ جلال خان کا پیار۔

اُس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے اُس کی حالیہ نئے رینک کے ساتھ اُتروائی ہوئی تصویر کو سینے سے لگا لیا۔

میری زندگی کا ہر لمحہ آپ کو لگ جائے خان صاحب!...... وہ بہت جذباتی ہو گئی تھی۔

اُٹھ کر بچوں کے کمرے میں جانے کے لئے دروازہ کھولا ہی تھا کہ اچنبھے سے اُچھل پڑی۔ سلطانہ، دروازے کے ساتھ بیٹھی دعا مانگ رہی تھی۔

''سلطانہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' لہجے میں حیرت تھی۔

''ثریا کی آپا کل پر وقتِ آزمائش ہے۔ ثریا کو کیونکر نیند آئے گی؟'' بیٹھے بیٹھے اُس نے خوش بخت کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیا۔

''تم رو رہی ہو؟'' خوش بخت نے اُسے پکڑ کر کھڑا کیا۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی



تھیں۔ شب بیداری کا اثر تھا یا بیتے دنوں کی تلخیوں کی یاد تھی۔ دونوں گلے لگ کر ایک دوسرے کو تسلی و تشفی دینے لگیں۔

چھاؤنی کی بجلی آف تھی۔ دونوں موم بتی کی روشنی میں بچوں کو پنکھے سے ہوا دیتے باتیں کرنے لگیں۔ عقبی برآمدے میں بلّیوں کے غرّانے کی آواز میں خوفزدگی اور لڑاکے پن کا تاثر اُنہیں اور مایوس کر گیا۔

''کتنی ماؤں کے پیار و محبت سے پالے ہوئے جوان گبھرو بچے، لاڈلے اور آنکھوں کے تارے اس پاک سرزمین کی سلامتی پر ہنستے ہوئے قربان ہو جائیں گے۔ نہ جانے کتنی بیوائیں اپنے سہاگ کے ایثار پر اس دنیا کی کڑوی کسیلی نظروں کو زندگی بھر کے لئے برداشت کریں گی۔ کتنے ہی یتیم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی ناروا حالات کا شکار ہو جائیں گے۔ سلطانہ! یہ سوچیں مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتیں۔'' خوش بخت اُس سے دل کی باتیں کر لیا کرتی تھی۔ وہ اُس کی ہم عمر بھی تھی اور پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ سمجھ دار بھی تھی۔ اس کی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔

''میڈم! اڑوس پڑوس کے ملک صلح و صفائی سے رہنے کو بزدلی کا نام کیوں دیتے ہیں؟ اس کی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ بھارت ہماری پہچان کو ماننے سے کیوں انکار کرتا ہے؟ ان زمینی ٹکڑوں کی خاطر قیمتی جانوں کی قربانیاں کیا جائز ہیں؟ ایسی ملکیت کو کیا کرنا جو دلوں کو، گھروں کو اور زندگیوں کو تباہ و برباد کر دے۔ دشمن کو اس میں اپنا مفاد کہاں نظر آتا ہے؟ وہاں بھی تو ہر گھر میں قیامت ٹوٹ پڑے گی۔'' سلطانہ نے بات گہری کی تھی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو سلطانہ! یہ سب دشمن کی ہٹ دھرمی کی نشانی ہے۔ ہمیں آزاد فضا میں سانس لینے کی عادت نے تن من دھن قربان کرنے کو لازم سمجھ لیا ہے۔ آزادی کے پھل کا ذائقہ ناقابلِ فراموش ہوا کرتا ہے۔ اس کی بحالی کی تمنا ہماری رگوں میں خون کے ساتھ گردش کر رہی ہے۔ ایک آزاد ملک کا وجود میں آنا اور پھر وہاں ایک سیاسی جمہوری نظام کا قائم ہونا اور اپنے دینِ اسلام کے اصولوں کی کھلم کھلا تبلیغ کرنے میں ہماری قوم کا مفاد ہے۔ کیا نشہ اور سرور ہے اس مفاد میں؟ کیا تم جانتی ہو اس ذائقے اور نشے کو؟'' خوش بخت کے لہجے میں سکون آ چکا تھا۔

''جی۔'' سلطانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com



"آزادی اور جمہوریت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں ایک دوسرے پر اعتماد کر کے گہری نیند سویا جاتا ہے۔ عمرانیات کی بنیاد پر غیر ضروری احساسِ برتری کے حیات ہونے میں ہماری شکست ہو گی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری قوم ابھی تک ان علتوں سے پاک صاف ہے۔ ایک دوسرے کا درد ہے۔ بھائی چارہ اور اپنائیت ہے۔ واحد یہی عمل ہماری آزادی کو بتدریج کامرانی کی راہوں پر گامزن رکھے گا۔ انسان فطری طور پر جھگڑالو بھی ہے اور حریص و کمینہ بھی۔ اُسے آزادی کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے اپنے اخلاقیات اور عملی کردار کو مضبوط اور مثبت بنانا ہو گا۔ اور چھوٹے بڑے کو بے دھڑک اپنے خیالات کی آگہی کی اجازت دینا ہو گی۔" وہ من میں اُٹھنے والے خوف اور وہم کو مثبت گفتگو سے دبانے کی کوشش میں تھی۔

سلطانہ اُس کے غم کے پیمانے کی گہرائی اور طوالت کو بخوبی سمجھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر تناؤ بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں اُس کا چہرہ زردی کی طرف مائل ہوتا جا رہا تھا۔ مگر لفظوں میں بلا کی ہمت اور آس تھی۔ سلطانہ چپکے سے اُٹھی اور اخروٹ کی نقش و نگار والی طشتری میں شکر چڑھے بادام ڈال کر لے آئی۔ ہاتھ میں ٹھنڈے دودھ کا گلاس بھی تھا۔

"میڈم! بادام کھائیں، دودھ پئیں اور پھر سونے کی کوشش کریں۔" وہ بے حد اپنائیت سے بولی۔ "میں بچوں کے پاس ہی نیچے لیٹ جاتی ہوں۔"

"خان صاحب ایمرجنسی میٹنگ میں بیٹھے ہیں۔ مجھے نیند کیسے آسکتی ہے؟ تم جا کر سو جاؤ۔" لمحہ بھر توقف رہا، پھر گویا ہوئی۔ "اس وقت ہمیں منطقی اور فلاسفی باتوں کے بجائے نوافلِ حاجات پر زور دینا چاہئے۔"

"پژمردگی اور افسردگی میں دل عبادت کی طرف مائل ہی کب ہوتا ہے؟" وہ آہستگی سے بولی۔

"لوگ تو عالمِ اضطراب میں باری تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔" سلطانہ کی بات پر وہ برجستہ بولی۔

"میڈم! ہر ذی روح اپنی اپنی فطرت کی زنجیروں میں مقید ہے۔" وہ مؤدب لہجے میں بولی۔



"سلطانہ! تمہاری منطق، تمہارے دلائل ہر بار مجھے اِک نیا سبق سکھا دیتے ہیں۔" وہ پیار سے بولی۔

"میڈم! آپ مجھے خوش کرنے کے لئے مروّتاً کہہ رہی ہیں۔ کہاں میں اور کہاں آپ۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

"ثریا! میری بات پر یقین کرنا سیکھو۔" وہ بے حد لگاوٹ سے بولی تو وہ مسکرا دی۔

"میم! صاحب کو فون کر لیں۔ آپ کے دل کو تسلی ہو جائے گی۔" لہجے میں رقت انگیزی تھی۔

چھاؤنی کے گھپ اندھیرے میں کتوں کے بھونکنے اور رونے کی آوازیں اُن کے کانوں میں زہر گھول رہی تھی۔ گرد و پیش کے ماحول میں پھیلی ہوئی ان بھونڈی آوازوں نے ہول اور وحشت کے احساس کو بڑھا دیا تھا۔ خوش بخت کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"وہ مجھے بزدل اور ڈرپوک سمجھ کر برا مان جائیں گے۔ اُن کی سوچ کے مطابق میرے ہاتھ میں بھی بندوق ہونی چاہئے اور ان کے شانہ بشانہ دشمن کا مقابلہ کرنے میں پیش پیش ہونا میرے فرائض میں شامل ہے۔" وہ سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

"آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ صاحب بہت سچے اور کھرے انسان ہیں۔ جو دل میں آیا، منہ پر کہہ دیا۔ تلون مزاج مرد کسی وقت بھی فریب نہیں دے سکتا۔ اللہ کا شکر ادا کیا کریں۔ وہ آپ کے بہت قدر دان ہیں۔ کئی بیگمات مجھ سے طرح طرح کے سوالات کر چکی ہیں۔ ادھر میں بھی سلطانہ ہوں نا، آپ کی ثریا۔ ایسی بولتی بند کرتی ہوں کہ وہ منتوں ترلوں پر اُتر آتی ہیں کہ کہیں آپ کو بتا نہ دوں۔" وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔

"ہاں سلطانہ! خان صاحب جیسا شوہر میں نے اپنی زندگی میں دیکھا ہے، نہ دیکھوں گی۔ ہر مرد ہر رشتے کے ساتھ نہایت انصاف سے چلتا ہے۔ میں خود ان کی بہت قدردان ہوں۔" اُس کے لہجے میں پیار تھا۔ فون کی گھنٹی نے دونوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔

"خدا خیر کرے۔" دونوں کی زبان سے بیک وقت نکلا۔

"میم صاحبہ! جنرل صاحب بالکل ٹھیک ہیں۔ مصروفیت کی وجہ سے آپ سے بات نہیں کر سکتے۔ انہوں نے فرمایا ہے، آپ سو جائیں۔ ممکن ہے، میں صبح ہی بچوں سے ملنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com



آسکوں۔'' اے۔ڈی۔سی کیپٹن شیر خان بول رہا تھا۔ جب وہ فوجی وردی میں ملبوس ہوتا تھا تو دیدی ماں کو میم صاحبہ کہہ کر پکارا کرتا تھا۔

''شیرو! اُن تک میرا سلام پہنچا دینا۔ تم ٹھیک ہو نا؟ عائشہ کہاں ہے؟'' وہ بھرّائی آواز میں بولی۔

''وہ رات کی ڈیوٹی پر ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہمت میں ہے۔ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔'' وہ سنجیدہ تھا۔

''دلیر خان بھی ٹھیک ہے نا؟'' وہ فکرمندی سے بولی۔

''جی۔ دلیرو کا سکواڈرن کل یہاں سے منتقل ہو رہا ہے۔ حفظہ بھی سرگودھا ہی رہیں گی۔ میں چلتا ہوں۔'' خدا حافظ کہہ کر وہ ڈیوٹی پر چلا گیا۔

''سلطانہ! تم میرے ساتھ کب تک جاگو گی؟ تمہارے بابا پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''میں اُنہیں بتائے بغیر کبھی کہیں نہیں ٹھہرتی۔ وہ سو گئے ہوں گے۔ بے چارے دونوں بہت کمزور اور لاغر نظر آنے لگے ہیں۔ اُنہیں میری فکر ہی لے ڈوبے گی۔ ماں باپ سمجھتے ہیں کہ تمام مسائل کا حل بیٹی کی شادی میں پوشیدہ ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ اپنی اولاد کے مسائل ہی تب شروع ہوتے ہیں، جب آپ انجان خاندان کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ پر اُنہیں کون سمجھائے؟'' وہ جزبز ہوتے بولی۔

''ویسے سلطانہ! ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ سوچنے میں کیا حرج ہے؟'' وہ مسکرائی۔

''میڈم! مجھے تحفظ چاہئے تھا نا۔ سو وہ مل گیا۔ پہلے بابا سے اور اب آپ سے۔ عمر کی سہ پہر بیت گئی تو پھر مجھے تنہائی اور اکیلا پن خائف نہیں کرے گا۔ بس اپنی شکل اور وجود کے بگڑنے کا انتظار ہے۔ پھر میں ہر طرح سے محفوظ ہو جاؤں گی۔'' وہ بے حد سنجیدہ ہوگئی تھی۔

خوش بخت اُس کے مرجھائے اور بے توجہی کے شکار چہرے کی طرف دیکھ کر سوچنے لگی۔ عورت اپنی بڑھتی عمر اور جاتی جوانی کے دُکھ میں ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور آخر کار وقت کو ساکت و جامد رکھنے کے تمام حربے مہنگی کریموں اور جڑی بوٹیوں کی صورت میں اُس کی زندگی میں شامل ہو کر اُسے وقتی و عارضی سکون تو مہیا کر دیتے ہیں۔ مگر وہ



وقت کو پابند اور قید نہیں کر سکتیں۔ یہ جنس ہی فرق ہے۔ جسے اپنے شباب کے گزر جانے کا شدت سے انتظار ہے۔

''میڈم! آپ صوفے پر لیٹ تو جائیں۔ ذرا کمر سیدھی کر لیں۔ لائیں میں آپ کے پاؤں دبا دیتی ہوں۔'' وہ خدمت گزاری کے لئے کھڑی ہوگئی۔ اُس نے اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''ماں ہر وقت ایک ہی دعا دیتی ہے آپ کو۔ تمہاری میڈم سدا سہاگن رہے۔ دودھوں نہائے، پوتوں پھلے۔ میڈم! آپ بے فکری سے سو جائیں۔ بے شمار دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔'' لہجے میں بے حد ممنونیت تھی۔

''چلو، اپنے کمرے میں چلتے ہیں۔ بچے گہری نیند سو رہے ہیں۔ یہ بھی کیسی مخلوق ہے۔ بے فکر اور حد درجے کی بے نیاز۔'' وہ جانے کے لئے کھڑی ہوگئی۔

''میڈم! بچے اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان کے معصوم دل بھی ماں باپ کے لئے بے پناہ ہمدردی اور پیار میں دھڑکتے ہیں۔ ایک دفعہ کی بات ہے، کسی پیر نے اباجی کا ہاتھ دیکھ کر یہ انکشاف کیا کہ وہ زمانہ شباب میں ہی اس دنیا سے گزر جائیں گے۔ میں آج بھی اپنے اس دکھ درد کا اندازہ لگا سکتی ہوں۔ کئی راتوں کی نیند مجھ پر حرام ہوگئی تھی، مگر اباجی سے اظہار نہ کر سکی۔ حالانکہ اُس وقت میں دسویں کلاس کی طالبہ تھی۔'' اُس کے لہجے میں دنیا جہاں کا دُکھ بھر آیا تھا۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ معصوم فرشتے اپنے کرب اور فکر کو اپنے وجود تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ بدمزاجی اور چڑچڑے پن کا شکار ہو جائیں گے مگر کیا مجال کہ فکرمندی کا اظہار کر جائیں۔ بچپن سے لے کر اب تک کے بے شمار واقعات میرے ذہن میں بھی گھوم گئے ہیں۔'' اُس نے سلطانہ کے ہر لفظ کی تائید کی۔

وہ دونوں موم بتی کی روشنی میں بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف رہیں۔ سلطانہ تو اُس کا دل بہلانے بیٹھی ہوئی تھی، خوش بخت نے بھی اعتراض نہ کیا۔ وہ سلطانہ کی ذات کے بارے میں کسی قسم کی گفتگو سے ہمیشہ ہی پرہیز کیا کرتی تھی۔ بے جا ہمدردی اور احسان سے اُسے سخت نفرت تھی۔ اُس کی زندگی میں عزت کے تحفظ سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہ تھی۔ نہ اُسے اچھے کھانے کی خواہش تھی، نہ اچھے پہناوے کی، نہ ہی کسی مرتبے اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com



بہترین گھر کی۔ بس کالی چادر میں چھپ کر زندگی گزارنے پر مطمئن تھی۔ کسی کو اپنی زندگی میں جھانکنے کی شہ تک نہ دیتی۔ اپنے کام سے مطلب رکھتی۔ ہر ایک کی عزت کرتی اور ہر ایک سے عزت کرواتی۔ اُس کی زندگی کے بھی چند اصول تھے، جن پر وہ ہمیشہ کاربند رہتی تھی۔

اُس نے سلطانہ کو آرام کرنے کے لئے کوارٹر کی طرف بھیج دیا اور خود صبح کی ملگجی روشنی میں باہر برآمدے میں نکل آئی۔ اپنے گرد و پیش کی فضا اور ماحول میں انتہا کی اُداسی کو محسوس کر کے اُس کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ اس دھندلے اور مایوس کن منظر کو دیکھ کر وہ آنکھیں بند کر کے سحر کی کرنوں اور اُجالوں کی منتظر ہو گئی۔

وہ اسی عالم میں کھڑی تھی کہ جلال خان کی گاڑی پورچ میں آ کر رُکی۔ شیر خان بھی ساتھ تھا۔ اُس نے تیزی سے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

"مجھے لگتا ہے آپ رات بھر نہیں سوئیں۔" جلال خان نے اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے غور سے اُس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اُس کی پلکیں جھک کر اقرار کر رہی تھیں۔

"شیر خان! تم جا کر آرام کرو۔ مجھے جب بھی تمہاری ضرورت محسوس ہوئی، بلالوں گا۔ گھر جاؤ اور بے فکری سے اپنی نیند پوری کرو۔ عائشہ بھی ڈیوٹی سے فارغ ہو گئی ہو گی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تو شیر خان نے سلیوٹ کیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

دونوں کمرے میں آ گئے۔ خوش بخت ایک بہادر جرنیل کی بیوی ہونے کے ناتے بہت دلیری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہ شوہر سے بیداریٔ شب کی اذیت کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چند گھنٹوں کے آرام کے بعد جلال خان نے جی۔ ایچ۔ کیو میٹنگ پر جانا تھا۔ اور اس کے بعد واپسی کی اُمید تھی۔ خوش بخت نے دل ہی دل میں ان گنت دعائیں اور کلام پاک کی برکت کے سہارے اور خدا کے فضل و کرم کے سائے میں اُسے خدا حافظ کہا۔ دل تھا کہ اُداسیوں کی آماجگاہ بن کر اسے کسی پل چین نہ لینے دے رہا تھا۔ اِک دھڑکا سا تھا، جس نے خائف کیا ہوا تھا۔ اندیشوں سے بھرپور ذہن کو بہلانے اور سہلانے کی ہر کوشش اُسے بتدریج کھائیوں میں لے جا رہی تھی۔ مارے دُکھ درد کے وہ دعائیہ انداز میں سجدے میں گر کر اپنے سہاگ کی بھیک مانگنے لگی۔



باورچی خانے سے مترنم آواز اور ترانے کے دل میں کھب جانے والے بول اُبھرے۔ بیٹ مین، ریڈیو پر بڑے انہماک سے نور جہاں کے ترانے سنا کرتا تھا۔ ترانے تھے کہ روح کو ہلا دینے والے۔ سوئے ہوئے جذبوں کو جگا دینے والے۔ مرے ہوئے احساسات کو حیات بخشنے والے۔

سرفروشی ہے ایماں تمہارا، جراُتوں کے قرضدار ہو تم
جو حفاظت کرے سرحدوں کی، وہ فلک بوس دیوار ہو تم
اے شجاعت کے زندہ نشانو! میرے نغمے تمہارے لئے ہیں

وہ پوری توجہ سے سنتی اپنے ناتواں دل کو حسین تسلیاں دیتی رہی۔ اہلِ رزم، توپوں اور گولیوں کی بوچھاڑ سے خوف زدہ ہونے لگیں تو رُوئے زمین پر آزادی، خود شناسی اور خود اعتمادی کا قلع قمع ہونے میں زیادہ وقت درکار نہیں ہوتا۔ مائیں، بہنیں اور بیویاں اس آزادی کا وہ مستحکم ستون ہیں، جن کے دل حزین خوناب سے ہمکنار ہو کر چہروں پر فتح مندی کی ضوفشانی، بکھرے لبوں پر تسکین و طمانیت کا تبسم سجائے اپنے پیاروں کی جدائی اور شہادتوں پر راضی ہو کر زبان الوادعی کلمات سے مزین ان کے حوصلوں کو چٹانیں بننے میں پیش پیش ہوتی ہیں۔ ان کا کردار سراپا احترام و آفرین ہے۔

وہ رضا اور فرح کو نصابی اور غیر نصابی کتابوں سے فوجیوں کی بہادری کے قصے سناتی اپنا دل بہلاتی رہی۔

صبح کی روشنی میں جلال خان کی گاڑی باہر رُکنے پر وہ دروازہ کھولنے بھاگ گئی۔

"آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟" وہ پیار بھرے لہجے میں اُس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

"نہیں تو۔" اُس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیمار پڑ جاؤ گی خوشی! حوصلہ رکھو۔ میں ٹھیک ٹھاک تو ہوں۔ پھر کاہے کی فکر؟" وہ کمرے میں پہنچ کر اُسے سمجھانے لگا۔ "اس وقت رضا خان اور فرح کو تمہاری اشد ضرورت ہے۔ بچے اپنے غم و فکرات اپنے من میں ہی دبائے رکھتے ہیں۔ ماں ان کے حوصلے اور ہمت کا وسیلہ بنتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر یہ جان، یہ دل، بے وجہ ہی بے کل کیوں رہنے لگا

www.iqbalkalmati.blogspot.com



ہے؟'' وہ اُس کے شانے پر چاند اور ستاروں کو بوسہ دیتے ہوئے بولی۔ ''خدا کرے، یہ آپ کے شانوں پر ہمیشہ چمکتے رہیں۔''

''ارے مجھے کچھ نہیں ہونے والا۔ جنگ میں ہمیشہ اوسط درجہ سپاہی، نائیک، حوالدار، کیپٹن، میجر اور کرنل کے گریڈز کو شہادت نصیب ہوا کرتی ہے۔ میں اتنا خوش نصیب کہاں کہ اس رینک میں شہادت کا رُتبہ پالوں اور اس دھرتی کی حفاظت کرنے کا عہد، اپنی ماں، بہنوں، بیٹیوں کی حرمت و تکریم بچانے کا حلف نبھا سکوں۔ میں نے زندہ و جاوید رہنے والی اس مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر جو وعدہ کیا تھا، اُس پر قائم رہنا میری متاعِ حیات ہے۔ خوشی! میں اپنے کیے گئے عہد پر اس وقت تک قائم ہوں، جب تک یہ وردی جو کہ شہیدوں کا فخر اور غازیوں کا حُسن ہے، میرے نصیب میں ہے۔'' وہ اُسے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لئے بولے جا رہا تھا۔ وہ بھی جذباتی ہو گئی تھی۔

''مجھے آپ کے خیالات، پیشے اور رکھ رکھاؤ کی قدر ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ ہر محاذ سے غازی بن کر لوٹیں۔''

''خوشی! آج کل مجھے خالد بن ولید کے مزار پر لکھی ہوئی عبارت بار بار یاد آتی ہے۔'' اُس نے والٹ سے تصویر نکالی جو اُس نے حمص پہنچ کر مسجد کے باہر اور مزار پر لگی ہوئی تختی کی کھینچی تھی۔ اُسے پکڑاتے ہوئے بولا۔ ''ذرا اُردو میں ترجمہ کرو۔''

''میں نے سینکڑوں جنگیں لڑیں۔ میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس پر دشمن کا دیا گیا زخم نہ آیا ہو۔ اس کے باوجود میں بسترِ مرگ پر ہوں۔ اے بزدلو! عبرت سیکھو۔''

خوش بخت نے ترجمہ سنایا اور اُسے دیکھنے لگی۔

''شہادتیں قسمت والوں کے نصیبوں میں لکھی جاتی ہیں۔ نوشتۂ تقدیر نے نہ جانے میرے لئے کیا حکم صادر کیا ہے۔'' جلال خان کے لہجے میں سچ مچ حسرت در آئی تھی۔

وہ وہیں اُس کے قدموں میں بیٹھ کر بے حد اپنائیت سے جوتوں کے تسمے کھولنے لگی۔ اُس کی شہادت کی تمنا اُسے ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔ پریشانی سے رنگ فق تھا۔

''خوشی! کیا کر رہی ہو؟ اُوپر اُٹھو۔'' اُس نے اُس کے ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر لیا۔

''مجھے مت روکیں خان صاحب!'' وہ اتنا کہہ پائی اور گھٹائیں اُس کی آنکھوں سے



برس پڑیں۔

''خوشی! کل میں جنگی سرحدوں پر معائنے کے لئے جا رہا ہوں۔ تم تھوڑدلی کا مظاہرہ کر کے میرے پاؤں کی زنجیر بن جاؤ گی۔ اماں گُل کی پوتی سے مجھے یہ اُمید ہرگز نہ تھی۔ ایک فوجی کی بیوی بننا تمہارے بس کا روگ نہ تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا ہے۔'' کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''تم اکیلی اس درد کا شکار نہیں ہو۔ ان گنت مائیں، بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں تمہارے ساتھ شامل ہیں۔ اپنا دکھ بانٹ لو سب کے ساتھ۔''

اُس نے اپنے غصے کی لَو کو مدھم کیا اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''دل بڑا کرو خوش بخت! ملک کی سلامتی کے لئے دعا کرو۔''

خوش بخت کے بہتے آنسو رُک گئے۔ وہ اِک بہادر سپاہی کے سامنے کس قدر بزدلی اور کم مائیگی کا اظہار کر بیٹھی تھی۔ پچھتاوے اور ندامت سے اُس کی آنکھیں زمین بوس ہو گئیں۔

''مجھے معاف کر دیجئے خان صاحب! خوامخواہ دل کو لگا بیٹھی ہوں۔'' اُس نے اپنا لہجہ درست کرتے ہوئے کہا۔ ''خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ میں جانتی ہوں، رونا کفر ہے۔ اب ایسی غلطی دوبارہ سرزد نہیں ہوگی۔ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

''بزدل ماں کے بچے ہمیشہ......''

''اتنی بڑی گالی سے مجھے مت نوازیں۔'' اُس نے اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔ ''مجھے غلط مت سمجھیں خان صاحب!''

''آئی ایم سوری۔'' وہ جزبز ہو کر بولا۔ ''مجھے تمہاری خوشی اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ لیکن اپنے ملک کی سلامتی تمہاری ذات سے وابستہ ہر شے پر حاوی ہے۔ ہماری قربانی میں ملک کی حیات ہے جانم! میری واپسی تک شیر خان تم لوگوں کے ساتھ رہے گا۔''

''وہاں آپ کو A.D.C کی ضرورت پڑے گی۔ آپ کے پاس شیر خان کی موجودگی میرے لئے باعثِ تسکین ہوگی۔ آپ اسے اپنے ساتھ ہی رکھیں۔ ہم یہاں محفوظ ہیں۔ آپ ہماری فکر نہ کریں، اپنا دھیان رکھیں۔'' وہ قدرے بہتر ہو چکی تھی۔

''میرے ساتھ پوری ٹیم جا رہی ہے۔ شیر خان تمہارے ساتھ ہوگا تو مجھے تسلی

www.iqbalkalmati.blogspot.com


رہے گی۔"

"جیسے آپ مطمئن ہیں۔" وہ نیاز مندی اور سعادت سے گویا ہوئی۔

"شاباش! گڈ گرل۔ مردوں کے حوصلوں کو بلند رکھنے میں تم لوگوں کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ کبھی نہ بھولنا۔ تم وہ پہیلی ہو، جس نے بوجھ لیا، زندگی کے تمام دھندلکوں کو صبح کے اُجالوں میں سمو دیا۔"

عورت کی اس مدح سرائی پر وہ حالتِ اہتزاز میں پہنچ گئی۔ وہ دلخراش چیخوں پر غالب آچکی تھی۔ سائرن کی آواز پر وہ چونک اُٹھی۔

"خان صاحب! مجھے بھی ریکروٹ بھرتی کر لیں۔ شیر خان کی جگہ۔ آپ کے ساتھ ساتھ آپ کی خدمت گزاری کرنا کتنا بھلا لگے گا۔" وہ ذہنی و دلی رد و کد سے نکل آئی تھی، مسکرا رہی تھی۔ "آئی لو یُو خان صاحب!......آئی لو یُو۔"

اسی عالم میں اُس نے جلال خان کو محبتوں اور لگاوٹوں کے ہجوم میں الوداع کہا اور وہ بھی غازی بن کر لوٹنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

❖❖❖○❖❖❖

"شیر خان! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟......وہ ایسا نہیں کر سکتے.......انہوں نے مجھ سے واپسی کا وعدہ کیا تھا۔ غازی بن کر لوٹنے کا وعدہ۔ انہوں نے آج تک کسی سے عہد شکنی نہیں کی۔ شیر خان! کہو نا کہ تم نے مجھ سے مذاق کیا ہے۔ بولو نا شیر خان! خدا کے لئے کہہ دو، جو تم نے بولا ہے وہ جھوٹ ہے، غلط فہمی ہے۔ تمہیں میرے پیار کی قسم بچے! کچھ تو کہو۔ ورنہ تمہاری دیدی ماں مر جائے گی۔" وہ شیر خان کو جھنجوڑتے ہوئے اُس کی بانہوں میں گر گئی۔

ایمبولینس باہر حفظِ ماتقدم کے طور پر موجود تھی۔ خوش بخت کو فوری طور پر C.M.H پہنچا دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد وہ سکتے کے عالم میں سب کو گھور رہی تھی۔ میکہ، سسرال سب ہی موجود تھے۔ وہ کس سے کیا کہتی؟ اُس کا جیون ہی لُٹ چکا تھا۔ وہ رضا اور فرح کو کیا سمجھاتی؟ کون سی جھوٹی تسلیوں سے بہلاتی؟ اُس کا اپنا دامن اُمیدوں سے خالی ہو چکا تھا۔

کلثوم اُس کے سرہانے بیٹھی اُس کے اُلجھے ہوئے بالوں کو اپنی شفقت بھری اُنگلیوں



سے درست کر رہی تھی۔ اُس نے بے بسی و لاچارگی کی نظر کلثوم پر گاڑ دی۔

"مجھے ایسے مت دیکھو خوش بخت! میں تو مدتوں سے بیوگی کے روپ میں ہوں۔ کاش میں زندہ سہاگ کی بیوہ رہتی۔ کاش خوش بخت......!" وہ سسک اُٹھی۔ خوش بخت آنکھیں نیم وا کئے اُسے دیکھتی رہی۔

"خوش بخت! ہوش میں آؤ۔ اُٹھنے کی کوشش کرو۔ یہ لوگ تمہارے دُلہا کو سجا کر لے جانے کی تیاری کر چکے ہیں۔ اُسے خدا حافظ نہیں کہو گی؟" کلثوم نے اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"میڈم! اس وقت آپ کی بے بسی، زندگی بھر کا پچھتاوا بن جائے گی۔ آپ ہمت کر کے اُٹھیں۔" اُس نے اُس کے سر پر سفید چادر ڈال دی۔ خوش بخت نے نرس کے سامنے بازو کیا اور ڈرپ اُتارنے کا اشارہ کیا۔

سلطانہ نے اُسے سہارا دینے کی کوشش کی مگر خوش بخت نے اشارتاً انکار کر دیا۔ اس نے خود کو چادر میں لپیٹا اور اپنوں اور اپنی فوجی برادری کے ہجوم کے ساتھ باہر نکل آئی۔

خوش بخت نے جلال خان کی تدفین کی تمام تقریبات میں بھرپور ہمت و حوصلے سے شرکت کی۔ آخر میں اُس کے پھولوں سے لدے ہوئے، پاکستان کے جھنڈے میں لپٹے ہوئے تابوت پر مزین کئے ہوئے میڈلز اور رینک، اُس کی کیپ کے ہمراہ سیلوٹ کے ساتھ خوش بخت کو سونپ دیئے گئے۔ وہ اس اثاثے کو سینے سے لگائے دُور کہیں دُور ماضی کے حسین دنوں میں کھو گئی۔

شہادت کا رُتبہ بھی عجب کرب ہے کہ پھر بھی لواحقین کی گردنیں تفاخر سے تن جاتی ہیں اور بقیہ زیست اِک انوکھی راحت و سرشاری میں بیت جاتی ہے۔ کئی شہداء کی بیواؤں کی زبانی سننے میں آیا ہے کہ ہمیں جب کسی مشکل کا سامنا ہوا ہو، کسی قسم کا فیصلہ کرنے میں دقت درپیش ہو، وہ مشورہ دینے اور فیصلہ کرنے میں ہمیشہ اُن کے روبرو ہوتے ہیں۔ خواب کی صورت میں یا خیال کی حالت میں اُنہیں اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہوئے انہیں تسلی و تشفی سے ہمکنار رکھتے ہیں اور فیصلہ کرنے کی جرأت کو بڑھا دیتے ہیں۔

❖❖○❖❖

وہ گاؤں، جس کو آباد کرنے میں جلال خان نے شب و روز ایک کر دیئے تھے،

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com



جنگ بندی کے بعد خوش بخت بچوں کے ہمراہ اپنے گاؤں پہنچ گئی۔ مگر یہاں نہایت دلبرداشتہ تھا۔ زمین بوس حویلی کی دیواریں اور چھتیں، بے دردی سے کٹے ہوئے باغوں کے پھل دار درخت، فصلوں میں بے دردی سے لگائی گئی آگ سے جلے ہوئے کھیت اور مکان۔ کچھ بھی سلامت نہ تھا۔ اینٹ، مٹی، پتھر اور گولیوں کا بارود کا کثیف دھواں فضا کو آلودہ کر رہے تھے۔

خوش بخت نے باپ کو یاس آمیز نظروں سے دیکھا۔

"آپ کی اور خان صاحب کی تمام محنت اکارت گئی۔ صد افسوس ہے بابا جان! کیا ہماری آزادی اور قربانیوں کا سفرِ جاوداں تا حیات رواں دواں رہے گا؟" وہ بلبلا اٹھی۔

"بیٹا! دل بڑا کرو۔ تم تو ایک شہید کی خوش بخت بیوہ ہو۔ ہمارا دل حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے اور ہر دم اپنی آزادی کی خاطر قربانی کے لئے تیار رہنے میں ہماری جیت ہے۔ آج ہم مسمار کر دیے گئے ہیں، تباہ و برباد ہو کر بے گھر ہو گئے ہیں۔ مگر یاد رکھنا! کل کا سورج ہمارے لئے آبادی اور خوشحالی کا سندیسہ لے کر طلوع ہو گا اور اس سفرِ جاوداں میں تمہارا سفر ازل سے ابد تک شاملِ حال رہے گا۔" لہجے میں حقیقت عود کر آئی تھی۔

خوش بخت نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر رضا خان کی آنکھوں میں رازداری سے جھانکا۔ ہو بہو باپ جیسی دلیری تھی۔ بیٹی کی چمک دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔

مقصدِ حیات، جھولی پھیلائے اس سے انمول خزانے کی بھیک مانگ رہا تھا۔

**(تمت بالخیر)**

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com